خوشحال نامہ



اباسین آرٹس کونسل پشاور

خوشحال نامہ

عظیم دانشور، صاحبِ سیف وقلم اور پشتو زبان وادب کے محسن

خوشحال خان خٹک

کی تین سو سالہ برسی کے موقع پر

قومی مجلسِ مذاکرہ

۲۹، ۳۰، ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء

اہتمام

اباسین آرٹس کونسل پشاور

خوشحال نامہ

ترتیب

پریشان خٹک　　خاطر غزنوی

یکے از مطبوعات

اباسین آرٹس کونسل، پشاور

آرٹس کونسل پشاور

مجلسِ انتظامیہ

۱۹۸۰ء

سرپرست	جناب کیپٹن عثمان علی عیسانی چیف سیکرٹری
صدر —	جناب جمشید برکی (کمشنر پشاور ڈویژن)
نائب صدر اول —	جناب قاضی غلام سرور (سابق پریس کونسلر برائے پاکستان، افغانستان)
نائب صدر دوم —	پروفیسر پریشان خٹک صدر شعبۂ پشتو پشاور یونیورسٹی
اعزازی سیکرٹری —	پروفیسر خاطر غزنوی، شعبۂ اردو پشاور یونیورسٹی
مشیر ادبیات —	جناب شمشاد صدیقی، نیوز ایڈیٹر روزنامہ مشرق پشاور
مشیر فنون (موسیقی) —	جناب قاضی حبیب اللہ پشاور
مشیر ڈراما —	جناب افتخار ظریف
مشیر فنون (مصوری) —	جناب سلیم اصغر صاحب
مشیر پروٹوکول —	جناب جمیل صدیقی

اراکین مجلسِ انتظامیہ

محترمہ روبینہ نازلی	جناب مسعود جاوید میر
محترمہ بیگم نسیم روف	پروفیسر شفیع صابر
جناب روشن نگینوی	پروفیسر محسن احسان
جناب غلام مصطفیٰ ثاقب حزیں	جناب مظفر محمود قریشی، سیکرٹری مالیات صوبہ سرحد
جناب میثاق حسین	جناب خالد منصور، ڈپٹی کمشنر، پشاور
جناب ایس اے جبار	جناب میاں نذیر اظہر، کلکٹر کسٹمز پشاور

مجلسِ طباعت

صدر : پروفیسر پریشان خٹک
مہتمد : پروفیسر خاطر غزنوی

اراکین :

جناب شمشاد صدیقی
جناب غلام مصطفےٰ ثاقب حزیں
جناب روشن نگینوی
جناب میثاق حسین زیدی

ترتیب

نابغۂ عصر

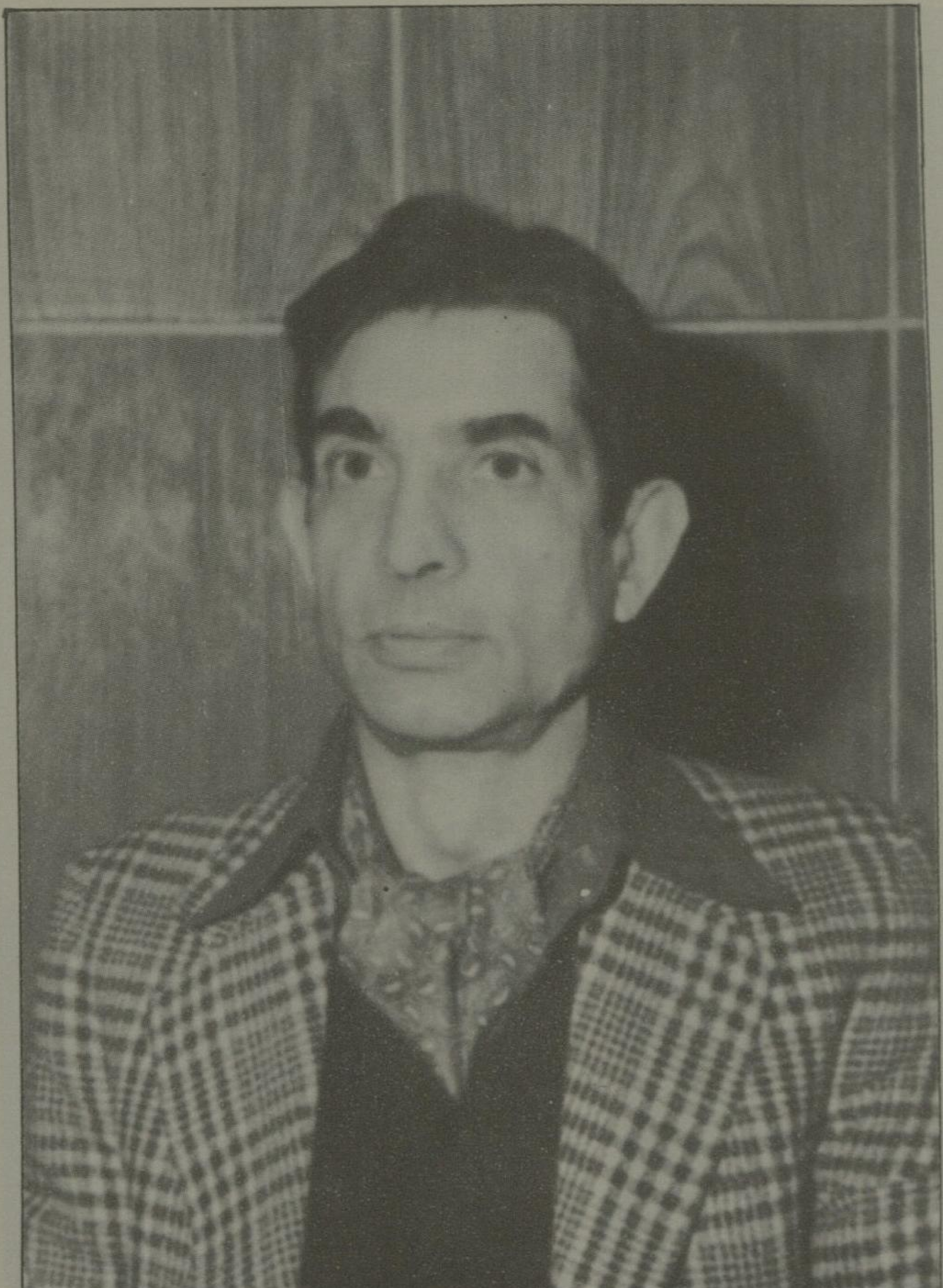
خوشحالیات

مصوری

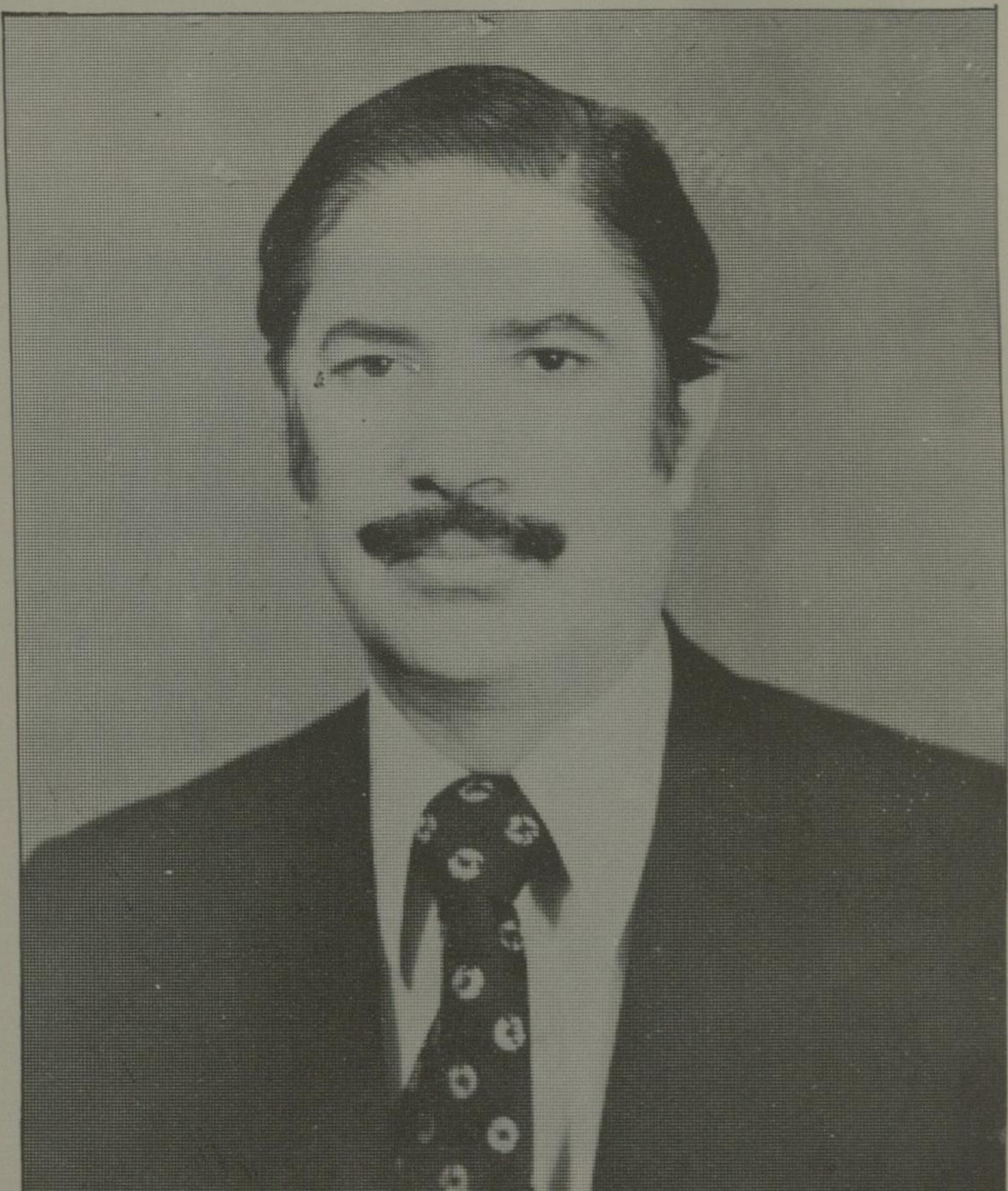
خوشحال نامہ



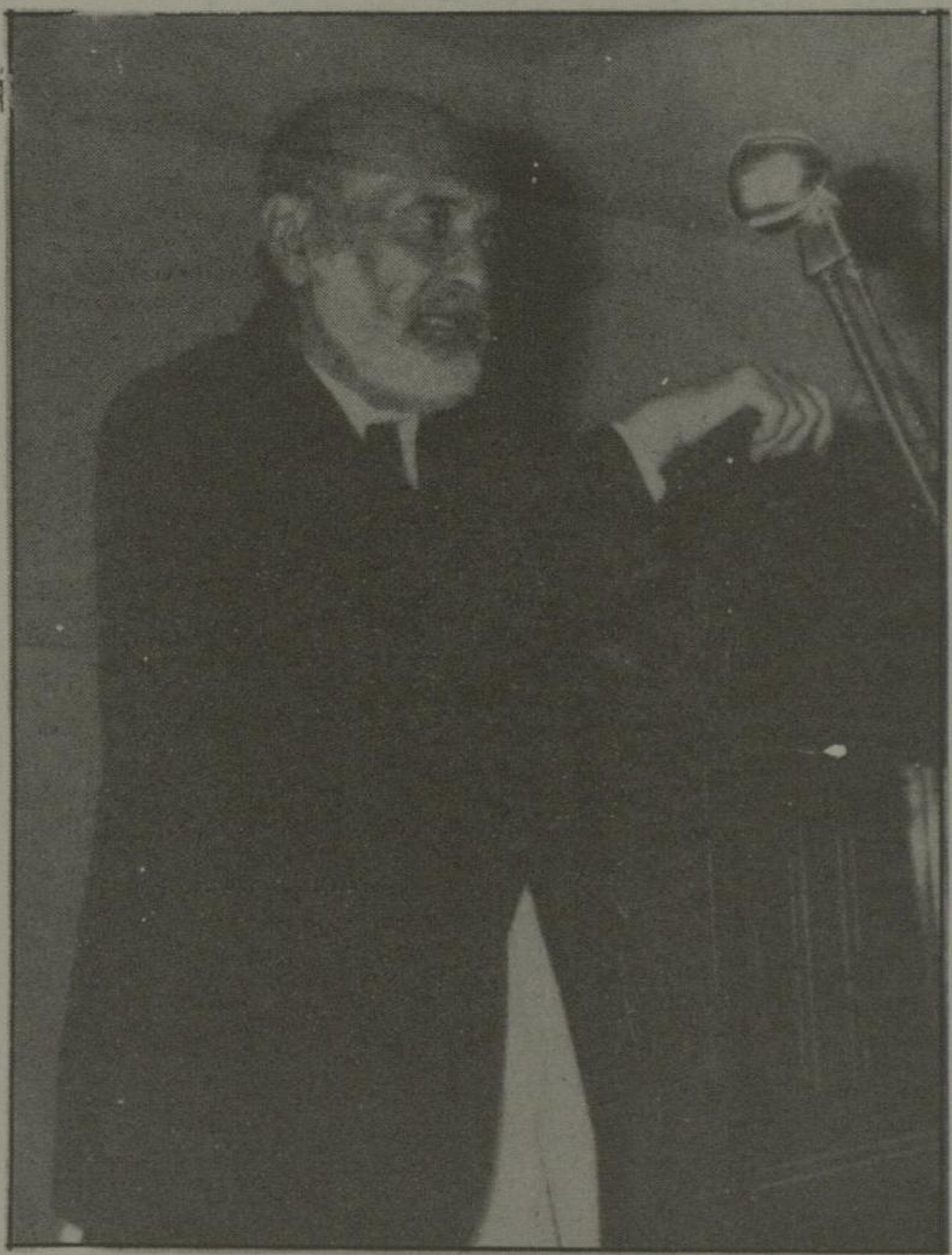
لیفٹیننٹ جنرل فضل حق صاحب گورنر صوبہ سرحد و مُربّی اباسین آرٹس کونسل پشاور



جناب یو اے جی عیسانی چیف سیکرٹری حکومت صوبہ سرحد
و سرپرست اباسین آرٹس کونسل پشاور



جناب جہانزیب خان صدر اباسین آرٹس کونسل پشاور



دوست محمد خان کامل مومند

خوشحال خان خٹک کے اولیں نقاد اور محقق
دوست محمد خان کامل (مرحوم)
کی زندہ خدمات کے نام



لفٹننٹ جنرل فضل حق، گورنر صوبہ سرحد

لفٹننٹ جنرل فضل حق
گورنر صوبہ سرحد

خطبۂ صدارت (مجلسِ افتتاحیہ)

مجھے آج بہت خوشی کا احساس ہو رہا ہے کہ پشتو کے عظیم دانشور خوشحال خان خٹک کے کارناموں کا جائزہ لینے کیلئے اباسین آرٹس کونسل پشاور نے ایک اہم قدم اٹھایا ہے اور اس تین روزہ مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا ہے جس کا آج افتتاح ہو رہا ہے۔

خوشحال خان خٹک ایک حریّت پرست انسان، ایک اچھا مسلمان، ایک غیوّر شمشیر زن اور بے بدل صاحب قلم تھا۔ اس کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں، مجھے یقین ہے کہ اس مجلس مذاکرہ میں شرکت کرنے والے اپنی تحقیق اور علمیّت کے زور سے ان کو رفع کریں گے اور خوشحال خان خٹک کی شخصیّت اور اس کے علمی اور ادبی کارناموں کا گہری نظر سے جائزہ لیکر اس عظیم انسان کی شخصیّت کے صحیح خدوخال واضح کریں گے۔

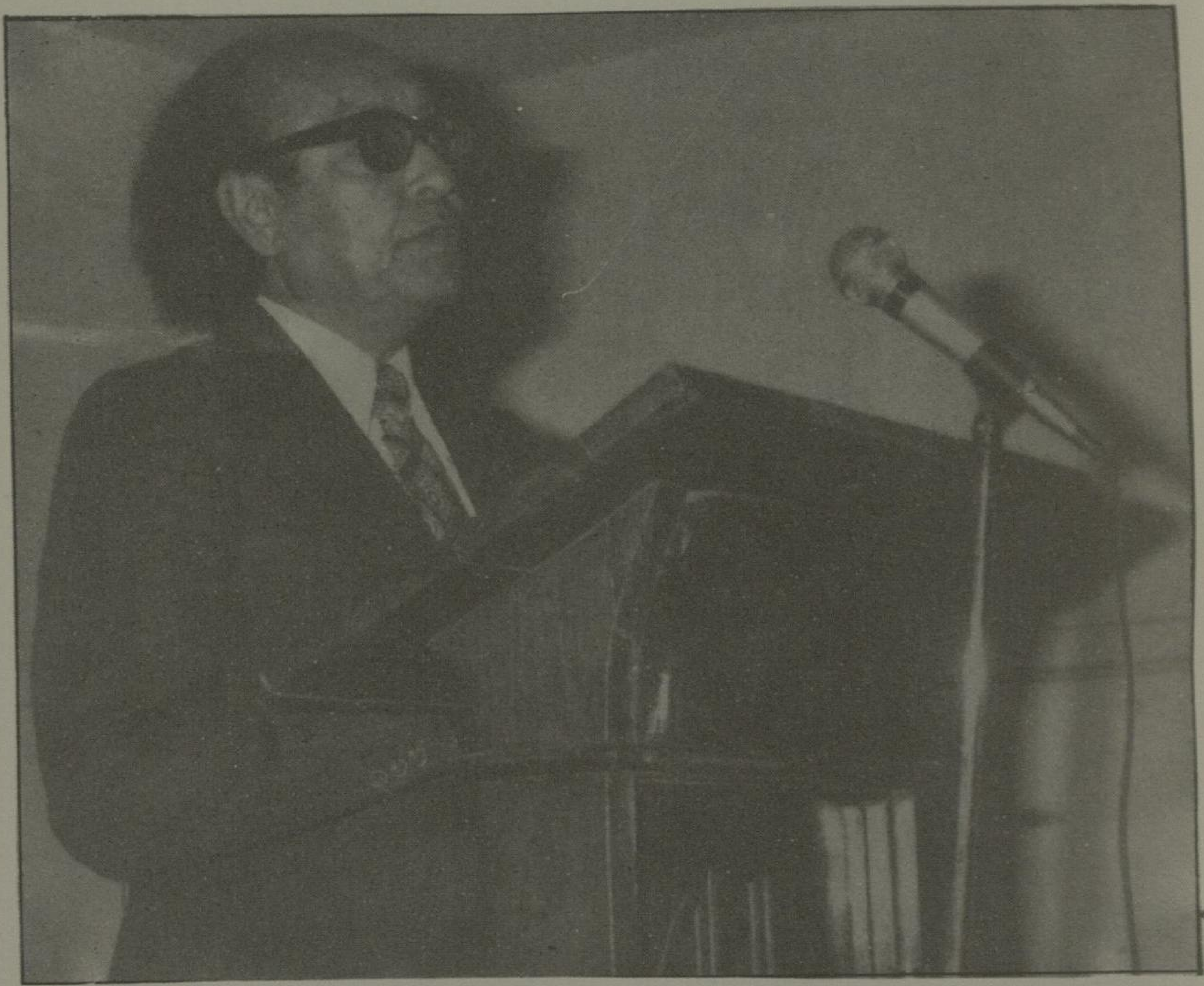
خوشحال خان کی شاعری کی اہمیّت اور فنّی خوبیاں دن بدن زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہیں اور یہ بات صحیح ثابت ہو رہی ہے کہ خوشحال خان خٹک کی تحریریں اس خطّے کے عظیم ادب کے معیار پر پوری اترتی ہیں وہ ایسا صاحب قلم تھا جس نے اپنی زندگی کے ہر واقعے ہر حادثے اور ہر سانحے کو قلم بند کیا۔ گویا اس لحاظ سے اس کی شاعری جہاں زندگی کی داخلی اور خارجی لطافتوں کی ترجمان ہے وہاں اس کے عصر کی تاریخ بھی ہے۔

مجھے خوشی ہوگی۔ اگر اباسین آرٹس کونسل اس موقع پر پڑھی گئی سب تحریروں کو ایک کتاب کی صورت میں یکجا کر کے شائع کرے۔ یہ خوشحال خان خٹک کی تین سو سالہ برسی پر ایک باوقار تحفہ ہوگا اور اس کی شخصیّت کی خدمات کا ایک ٹھوس اور جامع ثبوت ہوگا۔

میں آخر میں اباسین آرٹس کونسل کو اس کی ثقافتی سرگرمیوں اور اس علاقے میں ادب وفن کی ترقی کی کوششوں پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اور توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنی کارگزاریوں کا معیار برقرار رکھے گی۔

میں اس شاندار مجلس مذاکرہ کے انعقاد پر ابا سین آرٹس کونسل کے تمام سرگرم اراکین کو ان کی انتھک محنت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں جنہوں نے اس موقع کو منعقد کرنے کا پروگرام بنایا اور اسے کر کے دکھایا۔

میں ان تمام مہمانوں کو بھی خوش آمدید کہتا ہوں جو اس نیک کام میں شرکت کے لئے دور دراز علاقوں سے تشریف لائے۔



قاضی سرور

قاضی سرور

سپاسنامہ

مہمان گرامی قدر

لیفٹننٹ جنرل فضل حق گورنر صوبہ سرحد، مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون "بی"

محترمی جمشید برکی

پریذیڈنٹ اباسین آرٹس کونسل کمشنر پشاور ڈویژن۔

معزز و محترم اہلِ قلم

اور مہمان خواتین و حضرات،

خوشی کا مقام اور مسرت کی بات میرے لئے — اور — میرے رفقاء کار — کے لئے ہے کہ آج کی اس یادگار بلکہ تاریخ ساز تقریب کے —

مہمان گرامی قدر —

لیفٹننٹ جنرل فضل حق ہماری دعوت پر یہاں تشریف لائے۔

مہمانِ گرامی قدر!

آپ کی مصروفیات کا ہمیں علم ہے تاہم آپ نے اپنی بے شمار — مصروفیات میں سے وقت نکال کر وطنِ عزیز کی اس خوبصورت، سرسبز و شاداب وادیوں، گنگناتی ندیوں، برف پوش پہاڑوں، سر بفلک چوٹیوں، سنگلاخ چٹانوں، یوسفزئی کے مہکتے ہوئے گلزاروں اور خٹک نامہ کے تاحد نظر — پھیلے کھیت، کھلیان اور وسیع و عریض میدانوں کے خطے — صوبہ سرحد کے عظیم شاعر خوشحال خان خٹک کو خراج تحسین پیش کرنے خود تشریف لائے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپکو صحت مند اور تعمیری علمی، ادبی قدروں سے کس درجہ شغف ہے اور آپ تہذیبی روایات کا کتنا احترام کرتے ہیں۔

گرامی قدر مہمان محترم

میں اباسین آرٹس کونسل کے پریذیڈنٹ محترمی جناب جمشید بر کی، اباسین آرٹس کونسل کے معزز اراکین اور اپنی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرنا — اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں۔

گرامی قدر ——

خوشحال خان خٹک کی تین سو سالہ برسی کی ان تین روزہ تقریبات میں پشاور اور بیرون پشاور سے معزز و محترم اہلِ قلم خواتین و حضرات کی شمولیت ہمارے لئے باعث صد افتخار ہے۔ ہم انہیں خوش آمدید اور ستر مے مہ شئی — کہتے ہیں۔

یہ ذی علم اور باذوق خواتین و حضرات ان سہ روزہ تقریبات میں خوشحال خان خٹک کی قدآور شخصیت۔ انکے علم و فضل اور ان کی شاعری کو۔ نثر، نظم اور مصوری کے واسطے سے۔ اپنی بے پناہ محبت اور بھرپور عقیدت کے پھول پیش کریں گے، پھول جن کی خوشبو سے۔ خوشحال خان خٹک کی ہنگامہ خیز زندگی کی شگفتہ و شاداب۔ یادیں وابستہ اور تر و تازہ ہیں، یہ یادیں محض یادیں نہیں ہیں یہ تو خوشحال خان خٹک کے پرستاروں کے جسم و جان کا جزو اور سوچنے کا انداز بن چکی ہیں۔

جہاں جائیں وہاں تیرا فسانہ چھیڑ دیتے ہیں! ❊ کوئی محفل ہو تیرا رنگ محفل یاد آتا ہے

جناب والا

خوشحال خان خٹک جسے یہاں کے رہنے والے محبّت و عقیدت سے خان بابا بھی کہہ کر یاد کرتے ہیں انہیں علم کی معرفت اور مذہبی قدروں اور تہذیبی روایات سے وابستگی نے ایسی بلند نظری اور خود اعتمادی عطا کی تھی کہ وہ زندگی کے مصائب اور مکروہات سے پریشان یا پراگندہ خاطر نہیں ہوتے تھے جو شخص ہار جیت دونوں میں اپنا سہارا خود ہو اُسے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کی علمی، ادبی تحریروں میں بڑے ذہن کی کیسی اور کتنی عظیم حسین تخلیقی صلاحیتیں نظر آتی ہیں مثال کے طور پر اُن کی نظمیں، غزلیں، قطعات اور نثر پڑھ جائیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قلم سے فنون لطیفہ کے بھی اور فنون سپہ گری کے بھی کیسے کیسے کام اس عظیم شاعر نے لئے، حقیقت تو یہ ہے کہ خوشحال خان خٹک وطن

عزیز کی تاریخ، تہذیب اور علوم وفنون کا افتخار تھے۔

مہمان گرامی قدر:

خوشحال خان خٹک بیک وقت ایک عظیم شاعر، مردم شناس، نقاد، علم دوست ماہر طبیب، مشاق شکاری، پرانی تہذیب و شرافت کی منہ بولتی تصویر، بہادر اور جری، تلوار کا دھنی، اپنی تحریر سے دلوں کو گرمانے والا صاحب قلم، خوب رو اور خوش گفتار تھا وہ جس کے حسن بیان کی شوخی کے بارے میں شاعر مشرق علامہ اقبال کہہ گئے۔

راز قومے دید و بے باکانہ گفت　　　حرف حق با شوخی رندانہ گفت

انکی خود اعتمادی کا یہ عالم کہ اپنے بارے میں یہ کہتے ہیں

پہ پښتو شعر چہ ما علم بلند کړو　　　دخیبر وہ ملک م فتح پہ سمند کړو

اور پھر ان کا یہ فرمودہ۔

کہ د نظم کہ د نثر کہ د خط دے　　　پہ پښتو ژبہ م حق دے بے حد بہ

اگر خوشحال خان خٹک عظیم شاعر اور بلند ہمت مرد میدان تھے تو وہ ساتھ ہی ساتھ ایک راسخ العقیدہ مسلمان بھی تھے

خداوند عظیم و برتر کے حضور اس کی جبین نیاز میں سجدوں کی تڑپ کا یہ عالم۔

زۂ مدد غوارم لہ تا نہ اے بوہ خدایہ حذہ　　　کہ مدد د دراسرہ وی چار بہ نہ شی خمایہ

نہ تہ زوړ ے نہ نہ ځوان یے لکہ وے ھسے یکسان ے　　　لکہ وے ھسے بہ وینہ لہ ازلہ ترا بدہ

آقائے دو جہاں حضور محمد مصطفٰےؐ صلعم سے عقیدت و محبت کی یہ کیفیت ہے:۔

کہ دخدا ے عرفان م اوشو پہ عرفان د محمدؐ　　　پاک دے محمدؐ پاک دے سبحان د محمدؐ

جناب والا

اباسین آرٹس کونسل اپنی قسمت پر نازاں ہے کہ اسے یہ شرف حاصل ہوا کہ۔ خوشحال خان خٹک جیسی یگانۂ روزگار شخصیت کی تین سو سالہ برسی کی تقریبات کا اہتمام کرے البتہ یہ انتہائی ناشکرگزاری کی بات ہوگی اگر میں یہاں گرامی قدر گورنر سرحد اور حکومت صوبہ سرحد کے بھرپور اور مخلصانہ تعاون اور نیک تمناؤں کا شکریہ ادا نہ کروں ـــــ جن کی بدولت اباسین آرٹس کونسل کیلئے ـــ ان تقریبات کا انتظام و انصرام آسان اور سہل ہوگیا۔

گرامی قدر، معززاہلِ قلم، خواتین وحضرات!

اباسین آرٹس کونسل۔اپنی زندگی کے آغاز سے لیکر۔آج تک۔کوشاں رہی ہے کہ وطن عزیز کے اس صوبے میں علمی، ادبی، روحانی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیاں صحت مند خطوط پر ترتیب دی جائیں اور انہیں۔جھوٹ کی آلودگی، تصنع۔اور بناوٹ۔سے بچاکر قومی سطح پر۔یوں اجاگر کیا جائے جو ہماری قومی امنگوں، تمناؤں اور آرزوؤں کے بنیادی مقاصد پورا کر سکے۔اور قومی یک جہتی کے رنگین وحسین خاکے میں اتحاد، تنظیم، ایمان اور بھائی چارے کے خوبصورت و دلآویز نقوش ابھر سکیں۔

جہاں ہم نے ایک طرف ثقافتی تقریبات کے ذریعے آج کل کی مشینی اور مادّی زندگی کی پیدا کردہ پریشانی افسردگی، اعصابی تھکن اور جھنجھلاہٹ کو کم کرنے اور اسکی جگہ خوشی و مسرت زندہ دلی اور تازگی و بشاشت کے چند لمحات فراہم کرنے میں اس لئے کوتاہی نہیں کی کہ

ایک لمحہ بھی مسرت کا بڑا ہوتا ہے

وہاں ساتھ ہی ساتھ اپنی روحانی اور تاریخی روایات اور تہذیبی قدروں کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے ایسے پروگرام ترتیب دیئے جو ہماری قومی روایات کی عکاسی کرتے تھے۔

آنے والے دنوں میں ہم نے موتیوں کی لڑیوں سے پروئی" قرآن مجید کی آیات پاک کی نمائش کا پروگرام ترتیب دینا ہے اس کے علاوہ صادقین کی خطاطی کی نمائش منعقد کرنے کا ارادہ ہے جس میں قرآن حکیم کی آیات مقدسہ کو انتہائی دیدہ زیب روح پرور اور دل کش انداز میں پیش کیا گیا ہے دو ایسی تقاریب کا اہتمام بھی کرنا چاہتے ہیں جس سے وصول شدہ ساری کی ساری آمدن اباسین آرٹس کونسل کے صدر محترمی جمشید برکی کی وساطت سے گورنر موصوف کو صدر محترم کے افغان مہاجرین فنڈ کیلئے پیش کیجائیگی اسلامی تاریخ کے درخشندہ واقعات پر مبنی سٹیج ڈرامے بھی لکھوائے اور پیش کئے جائیں گے، علمی، ادبی، فکری اور تعمیری مباحثے، قومی دنوں پر خاص تقریبات اس کے علاوہ ہونگی جنہیں محنت، لگن، جذبے اور کاوش سے ترتیب دیا جائے گا۔

گرامی قدر

میں یہاں اباسین آرٹس کونسل کے صدر محترمی جمشید برکی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کونسل کے گوناگوں امور سے متعلق۔ اپنے مفید مشوروں سے ہمیں نوازا اور ہماری رہنمائی کرتے رہے۔

میں محترمی مظفر محمود قریشی سیکرٹری مالیات حکومت سرحد کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے اباسین آرٹس کونسل کے شعبۂ مصوری کے بانی مرحوم ایس ایس حیدر کی. شدید علالت کے دوران اُن کے علاج معالجے پر اٹھنے والے تمام اخراجات حکومت صوبہ سرحد کی طرف سے ادا کئے اور حیدر صاحب کے انتقال کر جانے کے بعد مزید گراں قدر مالی امداد بھی دی۔

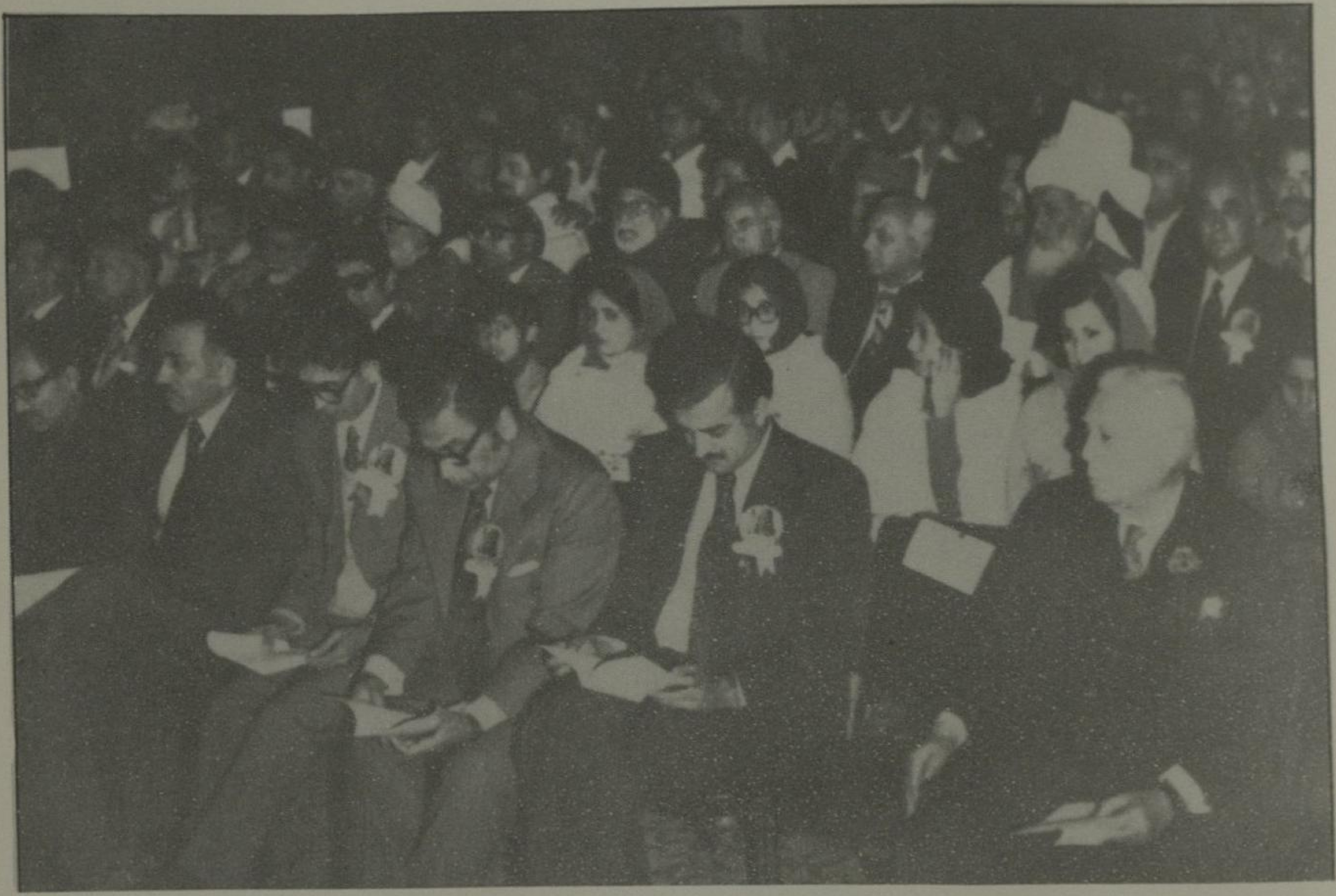
اور اب ان الفاظ کے ساتھ میں مہمان گرامی قدر لیفٹننٹ جنرل فضل حق گورنر صوبہ سرحد اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون "بی" اپنے معزز و محترم اہل قلم۔ اور خواتین و حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اجازت چاہتا ہوں۔



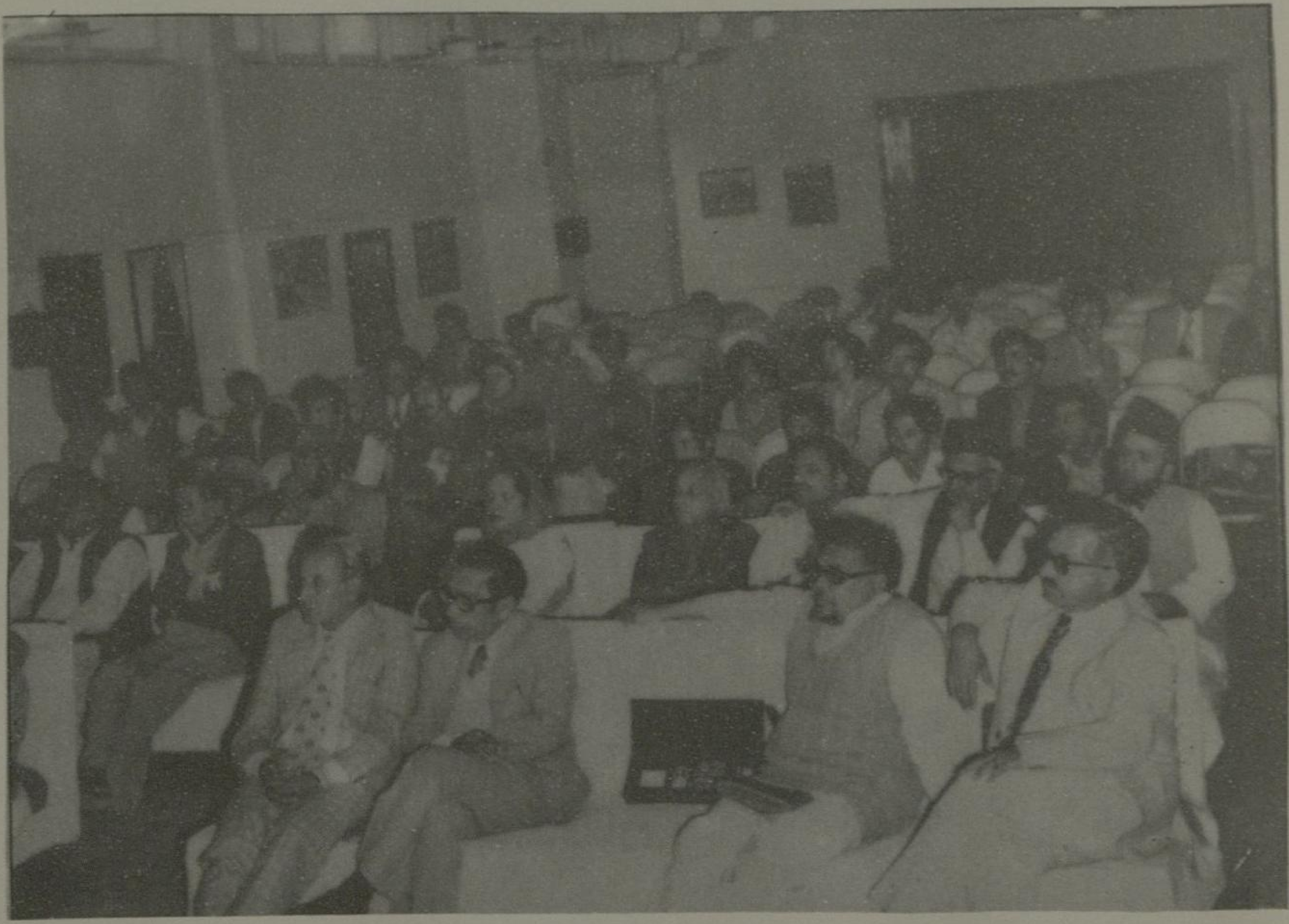
خوشحال صدی کے سیمینار کے حاضرین



سرحد چیمبر آف کامرس کی طرف سے دیئے گئے عشائیے میں چیمبر کے صدر حاجی یونس الٰہی مہمانوں
سے خطاب کر رہے ہیں۔

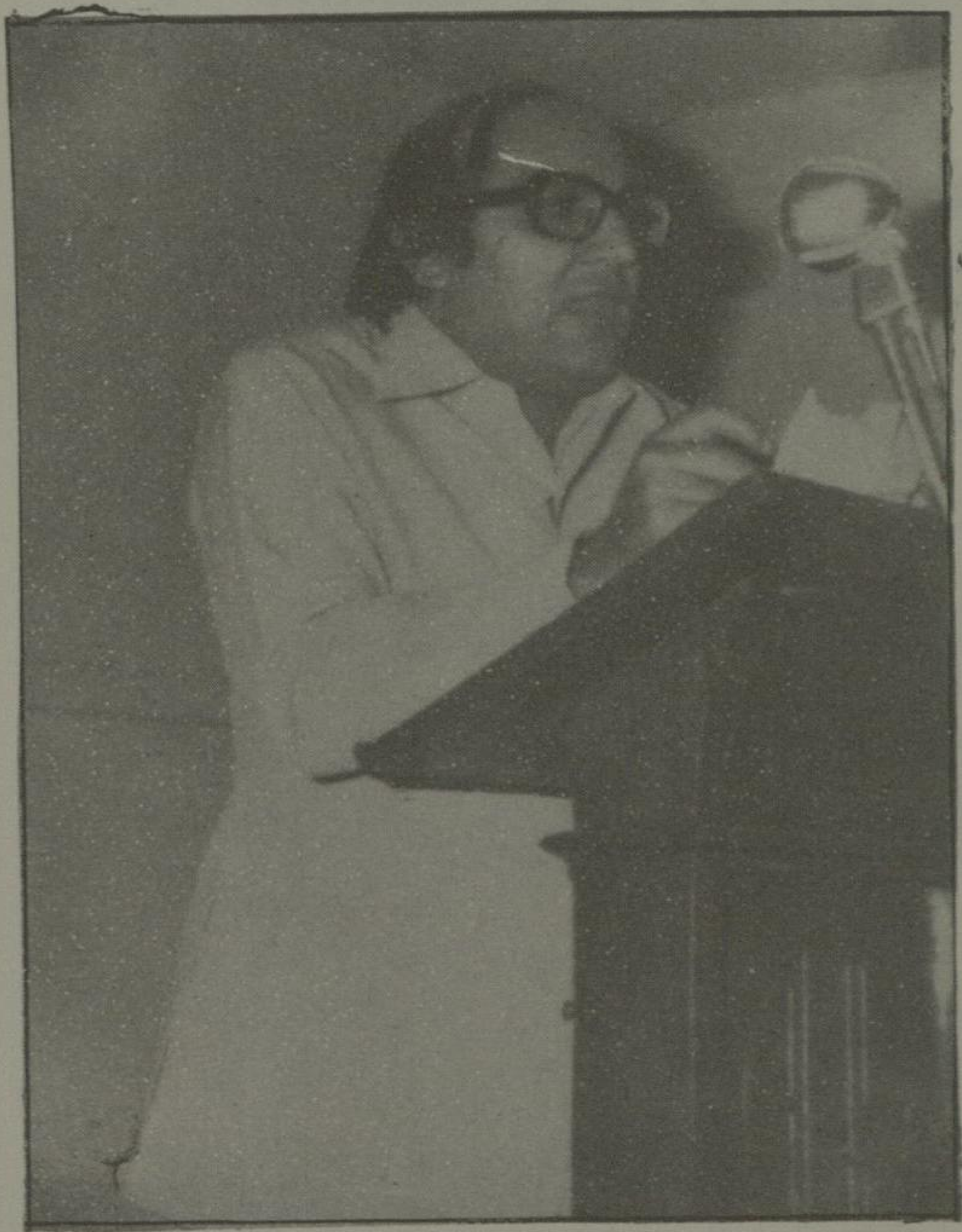


خوشحال صدی سیمینار کا افتتاح ۔ حاضرین



خوشحال سیمینار کے ایک جلسے کے حاضرین

منظومات



امجد اسلام امجد

امجد اسلام امجد

خوشحال خان خٹک کے لئے ایک نظم

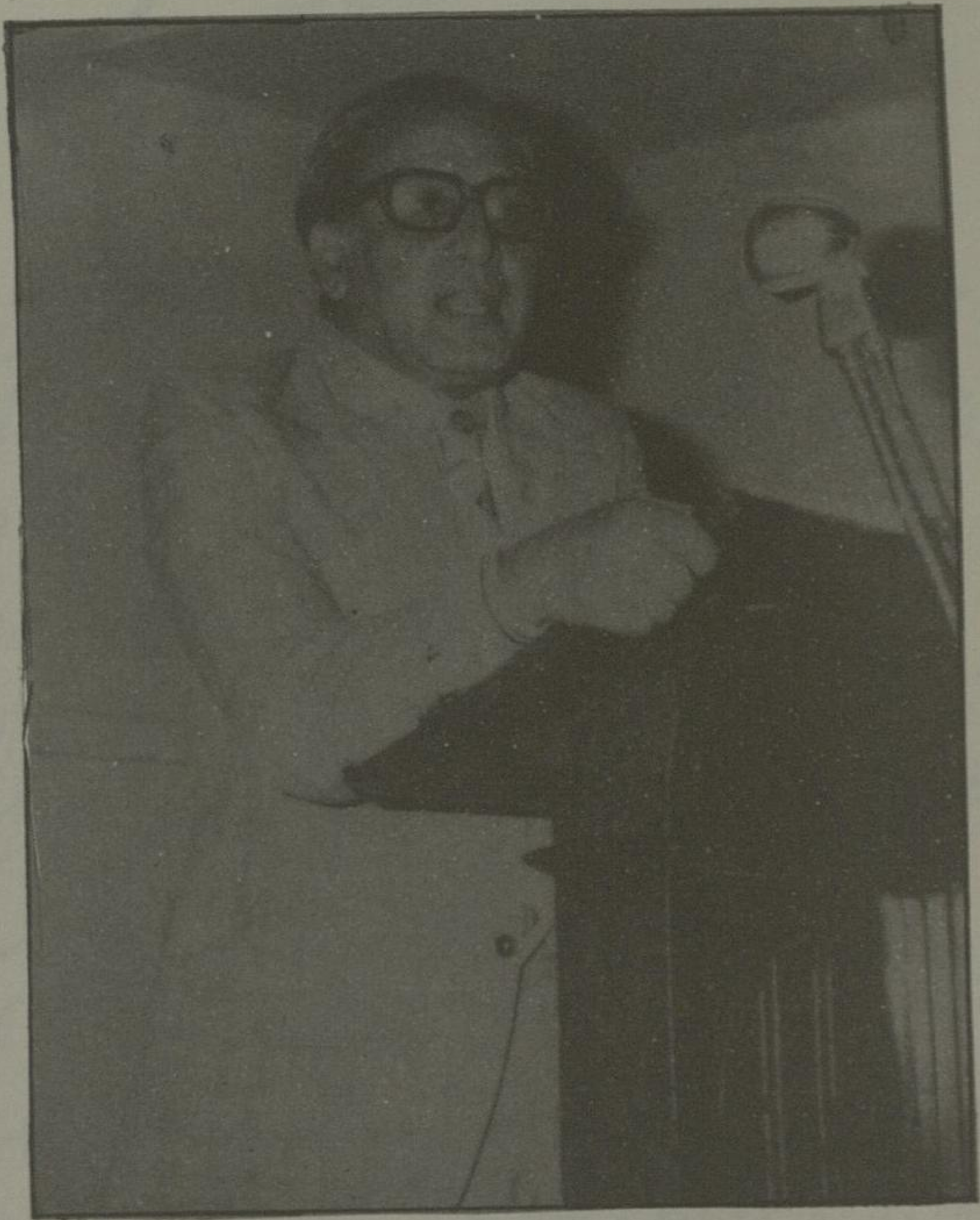
زمیں دلہن ہے
اور افلاک کی ان بے ٹھکانہ وسعتوں میں
جس قدر تارے ہیں اُس کی اوڑھنی کی
جھلملاہٹ سے بنے ہیں!
یہ ستارے استعارے ہیں ہماری آپ کی اس زندگی کے
جس کے ہونے اور نہ ہونے کے تذبذب ہیں
ازل سے تا ابد تاریخ کے جلدے تنے ہیں!

"ستارے سانس لیتے ہیں
ستارے بھی ہماری آپ کی صورت فضا میں سانس لیتے ہیں
ہماری ہی طرح یہ بھی فنا کی کوکھ میں تخلیق ہوتے ہیں
چمکتے ہیں، دمکتے ہیں، خلا کا رزق بنتے ہیں۔"

ہماری آپ کی یہ داستاں تو
ٹوٹتے تاروں کی اس وحشی چمک کے استعارے میں
سمٹ جاتی ہے لیکن سب ستارے اتنے بے مایہ نہیں ہوتے!!

کئی مہتاب خو، سورج بکف ایسے بھی ہوتے ہیں
کہ جو خود ڈوب بھی جائیں تو ان کی روشنی موجود رہتی ہے
صدائے بازگشت ان کی، ہوا کے ساتھ بہتی ہے
وہ اپنی موت سے لوحِ ابد پر زندگی تحریر کرتے ہیں
فنا تسخیر کرتے ہیں!

مرے خوشحال کے نغمے بھی اک ایسے ہی لافانی ستارے کی ضیا ہیں
مری مٹی کے چہرے کی حیا ہیں
انہی نغموں کے پرتو سے امنگیں جگمگاتی ہیں
انہی سے اس زمیں کی آنکھ میں دلہن کی آنکھیں مسکراتی ہیں!
اسی تارے کی مشعل سے ہے اپنا تن بدن روشن
کرن اندر کرن روشن
مرے خوشحال کے نغموں سے ہے میرا وطن روشن!!



محسن احسان

محسن احسان

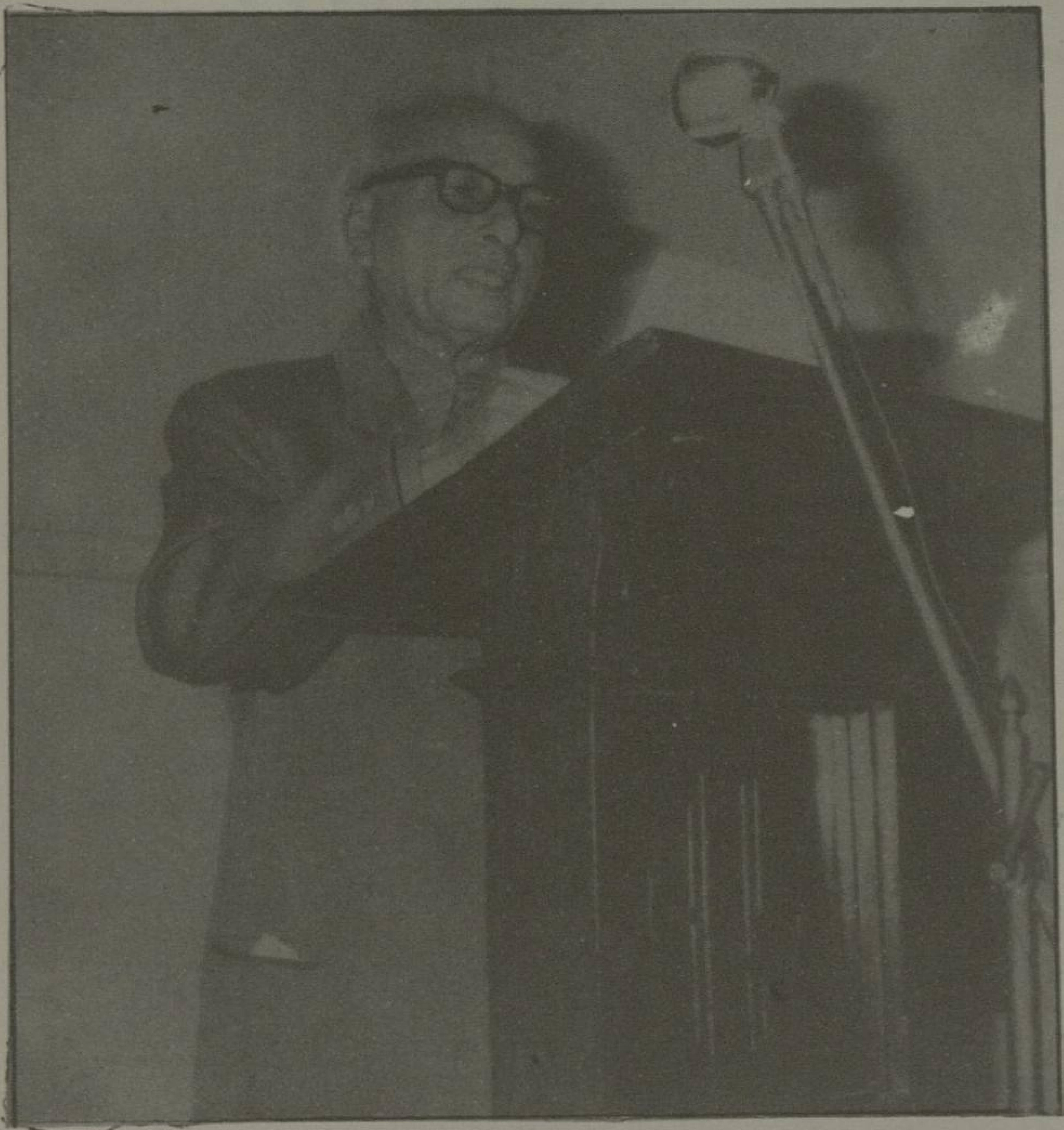
بابائے پشتو

آج پھر ذہن و دل سے غم و یاس و اندوہ کے سائے ڈھلنے لگے ہیں
آج پھر اہل فکر و نظر کے دلوں میں محبت کے ارمان مچلنے لگے ہیں
آج پھر تیرے افکار سے قصرِ افلاک کے بام و در ہل رہے ہیں
آج پھر تیری آواز سے گلستانوں میں غنچوں کے دل کھِل رہے ہیں
تو نے جو آرزوئیں جگائیں تھیں سینوں میں وہ آج تک پل رہی ہیں
تو نے جو مشعلیں راستوں میں جلائی تھیں وہ آج تک جل رہی ہیں
تیرے افکار کی ضو سے اہلِ جنوں کے دلوں میں نئی زندگی آگئی ہے
تیرے اشعار کی روشنی سے خیالات میں آج تابندگی آگئی ہے
تیرے نغموں کے رس سے نگارِ چمن شاخ در شاخ اب گنگنانے لگی ہے
تیرے احساس کی روح پرور مہک سے فضائے چمن مسکرانے لگی ہے
تیرے شعروں کی مہکار سے سنگ و فولاد کے دل پگھلنے لگے ہیں
تیری آواز کی نغمگی سے فلک پر نظر سوز خورشید جلنے لگے ہیں
تیرے اذکار سے گونجتے ہیں فضائے وطن میں دل آویز پرسوز نغمے
تو نے اپنی حسیں فکر میں ڈھال کر رکھ دیئے ہیں جمیل و دل افروز نغمے
تو نے اپنے قلم سے نگارِ سخن کے ہر اک بانکپن کو جِلا بخش دی ہے
تو نے اپنے نفس سے گلستانِ پشتو کے غنچوں کو موجِ صبا بخش دی ہے

محسن احسان

ایک قطعہ

تُو جامِ غزل میں قطرہ قطرہ
صہبائے حیات گھولتا ہے
اشعار میں تیرے نکتہ نکتہ
پختون ضمیر بولتا ہے



رضا ہمدانی

رضا ہمدانی

خوشحال نے کہا .....

آسمانوں کی، پہنائیاں ہیں مری
ہیں ، کہستان روہ کا ہوں مرد جری
دور بیں ہیں، نگاہوں کے شاہیں مرے
رود کابل کو میں نے دیا جلترنگ
ذہن میرا ہے فردوسیٔ عصر نو
فکر میری ہے، خیام کا زائچہ
میں نے اورنگ و افسر کی پروا نہ کی
میرا دستور انسان کا احترام
میں نے گردن مروڑی ہے قابیل کی
دندنانے لگیں ، ظلم کے فیل جب
خشک ٹکڑہ تھا، نانِ جویں کا ، گر
باکرہ تھی ابھی تک ، یہ پشتو غزل
عشق نے مجھ سے سیکھا ہے درسِ خودی
میزباں بن گئے ، میرے لختِ جگر
اس مسافت میں افکار و انظار کی
پیشرو تھے ، ابو الفضل و فیضی مرے

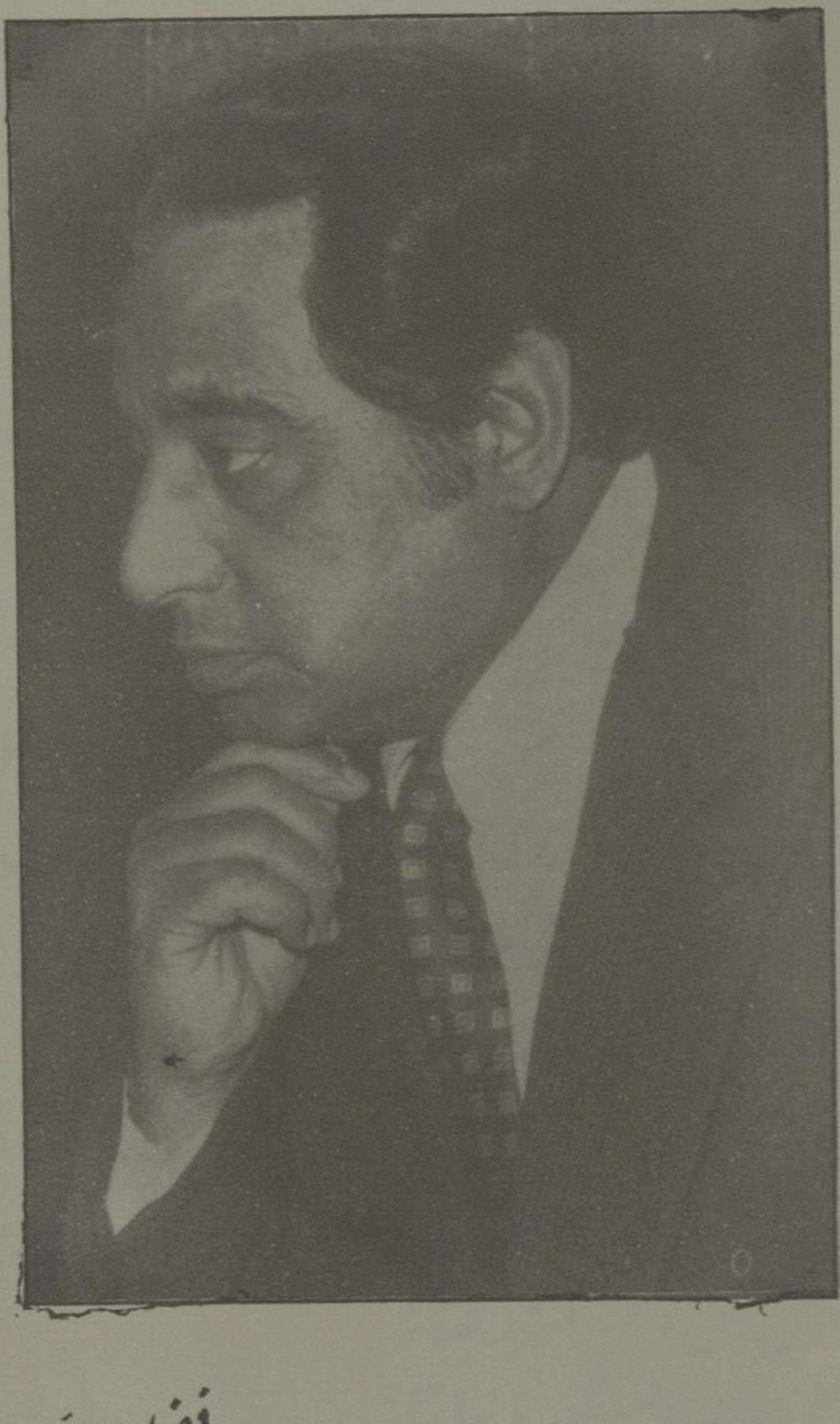
وادیاں ہیں مری، وشت و در ہیں مرے
کوندتی بجلیوں میں شرر ہیں مرے
میں اباسین کی موجوں کا ہمراز ہوں
پائلوں کے ترنّم کا میں ساز ہوں
میرا خامہ، عطارد کا استاد ہے
مجھ میں حافظ ہے، سعدی ہے بہزاد ہے
میری دولت رہی، میرے تیر و تفنگ
میرا منشور ہے، غیرتِ نام و ننگ
امن کے راستے کا ، میں ہابیل ہوں
ایسے عالم میں، سنگِ ابابیل ہوں
میں نے قند و نبات و لبن کر دیا
اس اَچھوتی کو میں نے دلہن کر دیا
پیار میں نے سکھایا ہے دلدار کو
میں نے مہماں کیا جب غمِ یار کو
کچھ نہیں فاصلہ ماہ کا، سال کا
پیشرو ہوں، میں غالب کا اقبال کا

ابوالفطرت میر زیدی

خوشحال خان خٹک

ایک مردِ صاف گو۔ شمشیر زن۔ شاعر۔ عقیل
فوج کا جرنیل۔ قومی کارکن۔ حاکم۔ عدیل
تجربہ علمی جسے حاصل تھا، بزم و رزم کا
علم کا دریا۔ وفا کی جاں۔ صداقت کی دلیل
عندلیبِ حسنِ فطرت۔ شاعرِ نباضِ قوم
مومنِ سادہ۔ حکیم و بندۂ ربِّ جلیل
قہر دشمن کے لئے اور دوستوں کا جاں نثار
امن اور ایمان کے ہر باب میں تھا سنگِ میل
نقش چہرے پر ہزاروں عظمتوں کی داستاں
آنکھ کے طوفان میں ڈوبا ہوا دریائے نیل
حسن کا شیدا۔ چمن زاروں کی جانِ آرزو
اس کی نظروں میں وطن کا ذرہ ذرہ تھا جمیل

گود میں تیری ہے خٹکوں کے تدبر کا امین
جانِ پاکستان ہے تو اے "اکوڑے" کی زمین
نعرۂ اللہ اکبر ضربتِ خوشحال خاں
بس کہ زیدی۔ الامان والامان والاماں



افضل پرویز

افضل پرویز

خوشحال خان خٹک

تُو خانوں کا خاں مردِ کہستاں تو شہباز
پشتونوں کا بابا جسے بخشا گیا اعجاز
جس نے قلم و سیف سے فکر اور عمل کو
دی جرأت و مردانگی و طاقتِ پرواز

اشعار سے بے جان چٹانوں کو زبان دی
کہسار بھی انصاف کو دینے لگے آواز
تو حلقۂ خوباں میں غزل خواں و مغنّی
زُغے میں غنیموں کے تُو ہی زلزلہ پرداز

یاروں میں تُو خوش باش و سخن گستر و طناز
جنگاہ میں خنجر زن و تیر افگن و جانباز
تو شعلۂ جوّالہ۔ کہ ہر حال میں رقصاں
تلوار کی جھنکار ہو یا زمزمۂ ساز

تو دیس کے کانٹوں پہ بھی جاں اپنی چھڑکتا
اور اُن کو سمجھتا سمنِ ہند سے ممتاز

زنداں میں تجھے موجۂ گیسو کی تمنّا
پشتون حسیناؤں کی یادیں تری دم ساز

سرگوشیاں کرتی تھیں اباسین کی لہریں
تھی بادِ شمالی تری پیغامبر و ہمراز

اے کاش کہ تیور ترے اپنائیں سبھی ہم
اے کاش! جواں قوم کے سیکھیں ترے انداز



روشن نگینوی

روشن نگینوی

صاحبِ سیف و قلم

بزم آرائے جہاں بھی رزم آرا بھی رہا
مثلِ شبنم بھی رہا، پیکرِ شرارہ بھی رہا
صوفیٔ خلوت نشیں بھی، آشکارا بھی رہا
ذات میں اپنی تلاطم بھی، کنارا بھی رہا

خوش بیاں، خوش فکر، خوشدل، خوش نظر، خوشحال تھا
وہ متاعِ دانش و حکمت سے مالا مال تھا

وہ کہ تھا مردِ کہستاں، ہیچ تھا اس کے حضور
جاہ و حشمت کا تصوّر، تاجِ شاہی کا غرور
وہ مجاہد تھا، ہوا و حرص کی دنیا سے دور
کارزارِ زندگی میں اس کو ملتا تھا سرور

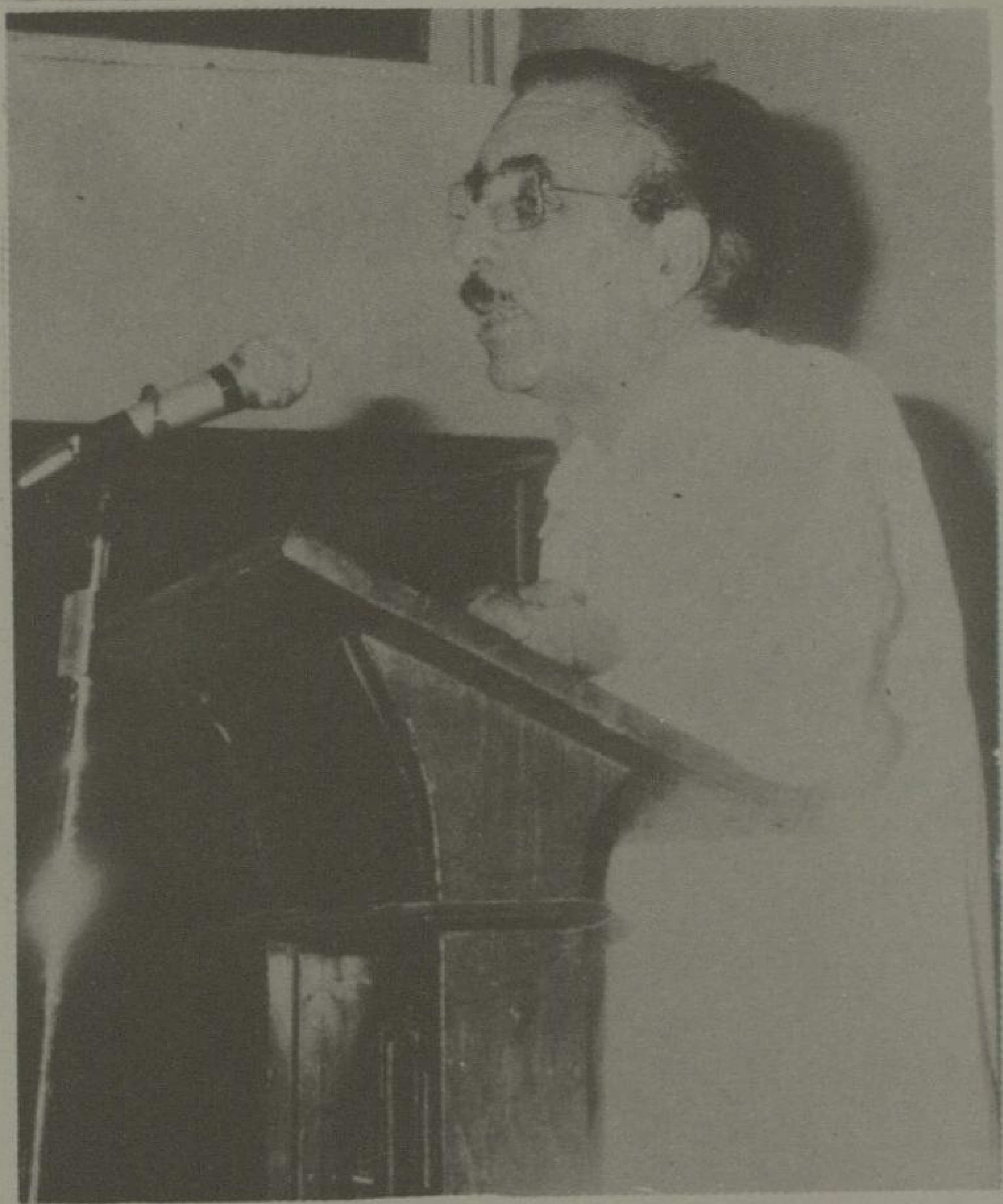
زندہ رہنا دشمنانِ دین کا دوبھر کیا
تارہ گڑھ کا قلعۂ مشہور اُس نے سر کیا

وہ جہانِ آگہی کا تھا سفیرِ محترم　　علم کے ہر ایک گوشے پر نظر تھی بیش وکم
گرچہ دنیائے ادب میں ہیں بہت سے محتشم　　کم نظر آئیں گے لیکن صاحبِ سیف وقلم

خرمنِ خوشحال کے ہیں خوشہ چیں عالی دماغ
اک چراغِ فکر سے روشن ہوئے کتنے چراغ

وہ دبیرِ منفرد، شاعر بھی اور دیندار بھی　　غازیٔ گفتار بھی تھا غازیٔ کردار بھی
فطرتاً وہ صلح کل بھی، برسرِ پیکار بھی　　اپنے شاہیں کی طرح بیباک بھی خوددار بھی

معترف اُس کے کمالِ شعر کا اقبال ہے
زندۂ جاوید شاعر واقعی خوشحال ہے



یوسف رجا چشتی

یوسف رجا چشتی

خوشحال خان خٹک

ہاتھ میں اس کے قلم سجتا تھا اور تلوار بھی
تیر و تیغ و دشنہ و بیرق بھی اور دستار بھی
منبع انوار تھے اعمال بھی افکار بھی
غازیٔ گفتار بھی تھا غازیٔ کردار بھی
سرد مٹی میں بھی خونِ گرم اس نے بھر دیا
روح کا جراح بھی تھا ذہن کا فن کار بھی

"پت" تھی اس میں "خٹکپرہ" تھا "تورزنی" اور "وفا"
اس کی پشتو پُر عمل تھی، اس لئے پُرکار تھی
خان تھا حاکم تھا وہ عالم تھا اور نباض تھا
وہ شکاری وہ مجاہد، ہار جس کو عار تھی
ننگ و غیرت جہد و ہمت عزتِ کردار و فکر
زندگی اس کی تھی یا فطرت کا اک شہکار تھی

شیر تھا وہ بند پنجرے میں وہ کب ہوتا مگر
اس کی غیرت تھی کہ زنجیر کی دیوار تھی
اُس کا اک اک پور تھا اک بولتی تصویرِ عزم
اس کی غیرت بے نیازِ منتِ اظہار تھی

ایک بھی خوشحال گر یہ دور پیدا کر سکے
قوم کا روشن تشخص بھی ہو اور کردار بھی
ذہن میں آواز اس مردِ خٹک خو کی رہے
جس میں دیسی گھن گرج بھی ہو وہی جھنکار بھی

ربِ اکبر اس زمیں سے اک جہاں پیدا کرے
اسکے ہر ذرے سے اک خوشحال خاں پیدا کرے

حیاتِ واردات



پروفیسر پریشان خٹک

پروفیسر پریشان خٹک

خوشحال خان خٹک

خوشحال خان خٹک اگر نرا شاعر ہوتا تو اُس پر بات کرتے میں اتنی دشواری پیش نہ آتی۔ مگر جو شخص بہ یک وقت شاعر ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت ہی بہادر سپاہی، تجربہ کار جرنیل، فیلسوف، حکیم، ماہر فلکیات، ماہر انساب، تاریخ دان، سیاست دان، جغرافیہ دان، معلّم اخلاق، شکاری اور اعلیٰ درجہ کا شہسوار ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہو تو اُس پر کچھ کہتے یا لکھتے وقت دشواری یہ پیش آتی ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے اور کہاں پر ختم کی جائے۔

صرف اس کی زندگی کی جدوجہد کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو ایک بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ایک ایسے نصب العین کو سامنے رکھ کر لڑتا رہا جو اپنے زمانے سے بہت پہلے کی بات تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اُس نے نہ تو خود کبھی بادشاہ بننے کا سوچا تھا اور نہ کسی دوسرے کو بادشاہ بنانے کے لئے کوشش کرتا رہا۔ تو پھر وہ کیا مشن تھا جس کے لئے وہ زندگی کے آخر دم تک برسرِ پیکار رہا۔ اسے ہم صرف ایک شعر سے سمجھ سکتے ہیں جس میں وہ یوں کہتا ہے ؎

اُولسونہ چہ سند دبلہ یو کہ
بادشاہان ورتہ سجود کاندے اختیار

(ترجمہ:۔ جب عوام متحد ہو جاتے ہیں تو بادشاہ اُنکے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں)

اب آپ غور کیجئے کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ایشیاء، افریقہ، یورپ، امریکہ کے براعظموں کے سارے ممالک الگ الگ بادشاہوں کے زیرِ نگین تھے۔ نہ صرف یہ کہ طاقت کا سرچشمہ بادشاہ کی ذات سمجھی جاتی تھی بلکہ یورپ میں کھلے طور

پر اُسے DIVINE RIGHTS OF KINGS حاصل تھے اور ایشیائی ممالک میں عام پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ بادشاہ میں سات ولیوں کی طاقت ہوتی ہے۔ اسی لئے اُنکو ظلّ الٰہی کہا جاتا تھا۔ ایسے زمانے میں یہ سوچنا، کہنا، اور اس کے لئے جدّوجہد کرنا کہ طاقت کا سرچشمہ صرف اور صرف عوام ہیں اس دعوے کی واضح دلیل ہے کہ خوشحال خان خٹک اپنے زمانے سے یقیناً بہت پہلے پیدا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں یورپ کی RENAISSANCE تحریک زوروں پر تھی انگلستان میں گلوریس ریوولیوشن ۱۶۸۸ء میں ہوا جب کہ خوشحال خان خٹک ۱۶۸۶ء میں فوت بھی ہو چکا تھا۔ گویا آج ہم دنیا میں جس اول درجے کی جمہوریت کی بات کرتے ہیں اگر خوشحال خان اپنی جدّوجہد میں کامیاب ہو جاتا تو لازمی بات ہے کہ موجودہ جمہوریت کے بانیوں میں شمار ہوتا اور اولین جمہوریت کا سہرا انگلستان کی بجائے ہمارے ہی خطہ کے سر پر ہوتا۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ جمہوریت کا تصوّر ہزاروں سال پرانا ہے اور یونان کے فیلسوف اس سلسلے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں لیکن ان کے سوچنے سے بہت پہلے ہمیں عملی طور پر پشتون قبائل میں ایک ایسی صحت مند اور کامیاب جمہوریت کا نمونہ ملتا ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ رگ وید میں جو ۱۵۰۰ سال قبل از مسیح لکھی گئی ہے اگر ہمیں پشتونوں کا ذکر نظر آتا ہے تو زمانۂ تحریر سے بہت پہلے بھی وہ یہیں پر آباد تھے اور اُنکی قبائلی زندگی کا تانا بانا جمہوریت سے تھا۔ علیگڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر حبیب نے بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ جب سے پشتون ہندوستان میں وارد ہوئے تب سے یہاں پر جمہوری خیالات کی داغ بیل پڑ گئی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خوشحال خان خٹک کوئی ایسی نئی بات بھی نہیں کہہ رہا تھا جس کا پہلے وجود نہ تھا۔ وہ پیدائشی جمہوریت پسند تھا اور یہ اُسے اُس معاشرے سے ورثے میں ملا تھا جس میں اُس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تحریک کو وسیع پیمانے پر ایک مشن کی صورت اس نے دی۔

کہنے کو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خوشحال خان خٹک نے ایک جگہ اپنے کلام میں ایمل خان مہمند کی بادشاہی کی تعریف کیوں کی ہے؟ اس کا جواب بالکل سادہ ہے اور وہ یہ کہ اُس زمانے میں سربراہ حکومت کے لئے صدر کا لفظ استعمال نہیں ہوتا

تھا اس لئے اگر چہ ایمل خان مہمند نے نام تو بادشاہ کا اختیار کیا لیکن تھا وہ قطعی طور پر سربراہ جمہوریت۔ اُس کا زوال ہوا تو وہ بھی جمہوریت پسندی کی وجہ سے۔ کیونکہ اُسکی سلطنت کا کاروبار موجودہ جمہوری رویے سے سرمو مختلف نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ جب دشمنوں نے اُسے زیر کرنا چاہا تو مہمندوں سے یہ کہا کہ اگر ایمل خان ایک بادشاہ کی طرح صرف اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے درپے نہیں ہے اور عوام دوست ہے تو وہ زمین لوگوں میں تقسیم کردے۔ اس مطالبے پر ایمل خان نے اُنکو ہر چند سمجھانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے سمجھنے سے انکار کیا چونکہ یہ عوام کا مطالبہ تھا اسی لئے جمہوریت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اُسے دشمن کی سازش کا اندازہ ہوتے ہوئے بھی یہ مطالبہ تسلیم کرنا پڑا پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ زمین کی تقسیم پر عوام آپس میں یوں اُلجھ گئے کہ ایمل خان کی کمر ٹوٹ گئی۔ اور یہی مخالفین کی منشا تھی۔

کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ خوشحال خان نے یہ شعر کیوں کہا کہ ؎

د بهلول او د شیرشاه خبرے آورم

چه په هند کښے پښتانهٔ وو بادشاهان

(ترجمہ: بہلول اور شیر شاہ کی باتیں سنتا ہوں کہ کبھی یہ پشتون بھی ہندوستان کے بادشاہ تھے)

اب جس نے بھی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ پشتونوں کی سلطنت کی بنیاد ہندوستان میں محمد غوری نے رکھی پھر اس کے بعد جلال الدین خلجی اور علاؤالدین خلجی جیسے زبردست پشتون بادشاہ گذرے ہیں اور کئی ایک اس کے بعد بھی۔ لیکن خوشحال خان خٹک نے بہلول کا نام لے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ نام کا بادشاہ ہوتے ہوئے بھی وہ نہ تو کبھی تخت پر بیٹھا اور نہ ہی تاج زیب سر کیا۔ عام لوگوں کے ساتھ فرش پر بیٹھا کرتا تھا جب کبھی کسی سردار نے شکایت کی تو اپنی پگڑی سر سے اُتار کر اس کے قدموں میں رکھ دیتا تھا کہ یہ میری (مشری) یعنی سرداری کی علامت جو آپ ہی نے میرے سر رکھی تھی بڑی خوشی سے آپ ہی کو لوٹاتا ہوں جسے چاہو اُسے پہناؤ۔ اور میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ وہ سردار نادم ہو کر پگڑی واپس اس کے سر پر رکھ دیتا۔ اگر کوئی بیمار پڑ جاتا تو تشریفات کو پس پشت ڈال کر بہلول لودھی

عیادت کے لئے اس کے دروازے پر پہنچ جاتا۔ یہی وہ بات تھی جس کے لئے اس نے بہلول کی تعریف کی۔ اسی طرح شیر شاہ سوری کے رفاہ عام کے نہ مٹنے والے نقوش آپ کے خیال میں کس بات کی دلیل ہے؟ رعایا کے لئے یہ سب کچھ کسی دوسرے بادشاہ کے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟ اس لئے کہ شیر شاہ سوری ایک جمہوری سربراہ کی طرح اپنے آپ کو عوام کے سامنے جوابدہ سمجھتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی مثال اس ہندو سائل کی کہانی ہے جس نے شیر شاہ سوری کے بیٹے کے خلاف یہ شکایت کی کہ اس نے ہاتھی پر سواری کے وقت میرے گھر میں پھول پھینک کر گویا میری بیوی کی بے عزتی کی ہے۔ شیر شاہ کی جواب طلبی پر اس کے بیٹے نے ہزار ہا کہا کہ اس کا ارادہ نیک تھا اور یہ پھول صرف اس لئے پھینکا گیا تھا کہ وہ خاتون بیدار ہو کر پردہ کرنے کا سامان کرے تاکہ اور کوئی اسے نہ دیکھ سکے لیکن شیر شاہ نے حکم صادر کیا کہ سائل ہندو اسی طرح ہاتھی پر بیٹھ کر اس کی بہو پر پھول پھینکے گا تاکہ انصاف کا بول بالا ہو۔ آگے آپ خود اندازہ لگائیں۔

پھر اس بات سے تو بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر بادشاہ کے نام یا وجود سے جمہوریت کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تو پھر آج کل کی سب سے بڑی جمہوریت جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا یعنی انگلستان وہ تو اب تک بادشاہ یا ملکہ کے زیر سایہ ہے۔ لہذا ان اشعار کے الزام سے خوشحال خان خٹک کو ہر انصاف کی عدالت میں بری کیا جائے گا۔ کیونکہ بات بادشاہ کے نام تک نہیں اس سلوک کی ہے جس کی بنا پر وہ حکومت کرتا ہے۔ اگر ایک فرد واحد اپنے آپ کو کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کا حقدار سمجھتا ہے اور اپنی ذات اور شخصیت کو ایک دیوتا کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ سلوک کم از کم خوشحال خان کو کسی قیمت پر گوارا نہیں۔ کیونکہ وہ تو باقاعدہ طور پر رموز مملکت کے لئے تو کیا ساری کائنات کے لئے بندوبست کا طریقہ صرف اور صرف باہمی مشورہ تجویز کرتا ہے۔ اور یہی تعلیم ہمیں مذہب اسلام نے دی ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے سوائے ان معاملات کے جس کا طریقہ کار خود اللہ پاک نے بتایا تھا باقی سب باتوں میں مشاورت کا طریقہ اختیار کیا انہوں نے ہمیشہ سب سے پہلے اپنے آپ کو خدائے پاک کے سامنے جوابدہ ٹھہرایا اور پھر عوام کے سامنے۔ خوشحال خان مشورے کی اہمیت جو جمہوریت کی روح ہے یوں بتاتا ہے،

نورانی که هغه ځائے چه سره کینی
دیرینه څلور یاران په مصلحت

(ترجمہ: وہ جگہ جہاں چار پرانے دوست مشورے کے لئے اکٹھے ہو جائیں نورانی ہو جاتی ہے)

گویا باہم مشورہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا خدا کی خوشنودی کا باعث بنتا ہے۔ اس سے آپ یہ مقصد لیجئے کہ جیسے موجودہ جمہوریت میں عوام مخصوص لوگوں کو اپنی رائے دیکر منتخب کرتے ہیں اور پھر وہ اپنے میں سے معدودے چند افراد کو کابینہ بنانے کا حق دیدیتے ہیں اور یہی کابینہ مملکت کے کاروبار کے لئے بار بار مل بیٹھ کر مشورہ کرتا ہے کیونکہ ہر وقت کسی کام کے فیصلے کے لئے سب لوگوں کی رائے لینا ناممکن ہوتا ہے اسیطرح زمانہ قدیم سے قبائل کا یہ دستور چلا آرہا ہے کہ وہاں کسی فیصلے کے لئے کچھ ایسے بزرگ چنے جاتے ہیں جن کی صداقت، دیانتداری، صاف گوئی، امانت داری اور معاملہ فہمی پر سب کو اعتماد ہوتا ہے جب بھی وہ کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو انکی تعداد کم از کم چار ہوتی ہے اور پشتون جب آپس میں اُلجھ جاتے ہیں تو ہمیشہ یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ چار پر فیصلہ ہوگا۔ خوشحال خان خٹک کا اشارہ اسی طرف ہے۔ لیکن وہ اس بات کا ہرگز قائل نہیں ہے کہ صرف چند منتخب لوگ جو فیصلہ کرتے ہیں وہ یقیناً اُس فیصلے سے بہتر ہوگا جو عوام الناس کے مشورے سے ہو۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ صحیح فیصلہ وہی ہوگا جس میں جتنے زیادہ لوگوں کا مشورہ لیا جائے۔ اُس کا شعر ہے ؎

بند و بست د کائنات شی په خبرو
یو تر سو صد قه شه سل تر زرو

(ترجمہ: کائنات کا بندوبست باتوں یعنی مشورے سے ہوتا ہے اور وہ بھی ایسا کہ ایک سو پر قربان ہو اور سو ہزار پر)

یعنی خوشحال خان یہ کہنا چاہتا ہے کہ مشورہ ہر طرح سے عوامی ہونا چاہیئے یا ہر مشورے کو عوام الناس کی تائید حاصل ہونی چاہیئے۔ دستارنامے میں اُس نے بادشاہ یا سردار کے لئے جن بیس ہنروں اور بیس خصلتوں کا ذکر کیا ہے ان خصائل میں پہلی بات مشاورت رکھی ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ ایک سربراہ مملکت کے لئے

مشاورت کیوں ضروری سمجھتا ہے ۔

اس موضوع پر مزید لکھنے کی بجائے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ چلتے چلتے اس سوال کا بھی جواب دیا جائے جو بعض لوگ محض کم علمی کی بنا پر کرتے ہیں کہ خوشحال خٹک کی زندگی کی جدّوجہد کا مقصد حصولِ منصب تھا اور یا یہ کہ اگر بادشاہ کی طرف سے اٹک پر وصول کیا جانے والا وہ محصول جو خوشحال خان وصول کرتا تھا معاف نہ کیا جاتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا ۔ اس کی تفصیل میں جانے کی بجائے مختصر لفظوں میں یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک اٹک کے محصول کا تعلق ہے وہ اگرچہ صوبیدار سید امیر خان خوافی نے بادشاہ کے حکم سے سرحدی علاقوں میں ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس لئے معاف کیا تھا کہ اسطرح سے خوشحال خان ردّعمل کے طور پر حکم عدولی کرے گا اور وہ اسے بہانہ بنا کر اس کے خلاف تادیبی کاروائی کرے گا۔ حالانکہ بادشاہ نے محصول کی معافی کا حکم اندرونِ ہند میں ضرور کیا تھا جس کا اطلاق واضح طور پر سرحدی علاقوں پر نہیں ہوتا تھا پھر بھی اس حکم کے بعد نہ تو کبھی خوشحال خان نے اٹک کا محصول وصول کیا اور نہ ظاہری ردّعمل کا اظہار کیا ۔ نہ اس کا کوئی ثبوت ہے ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر صوبہ دار خوشحال خان کی جان کا دشمن کیوں بن گیا ، اس کی وجہ ظاہر ہے وہ یہ کہ جاگیر یا منصب اسے میراث میں ملا تھا ۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس نے شاہی دربار کے ساتھ ہمیشہ اچھے تعلقات رکھنے کی کوشش کی اور یہ بھی واضح ہے کہ سرحدی قبائل کے وہ رئیس جن کا تعلق مغل دربار سے تھا اپنے اندرونی قبائلی معاملات میں قطعی طور پر آزاد تھے اور جہاں ہر معاملے کا فیصلہ مقامی رسم و رواج یعنی اس جمہوری طریقے سے ہوا کرتا تھا جس کا ذکر شروع میں کیا گیا ہے ۔ لیکن خوشحال خان کو شاہی عمال کا یہ رویّہ کہ وہ سرداروں سے نذرانے وصول کرے یا خوشامد کرائے ، نہ تو کبھی پسند تھا اور نہ اس سے مصالحت کر سکا اور جب صوبہ دار نے اس سے پچاس ہزار روپے رشوت کے طور پر مانگے تو اس نے صاف انکار کر دیا جیسے کہ وہ کہتا ہے ؎

او غوختے پنځوس زره روپئ صوبه دار
ما ورته ور نه کړم په قسم هم یو دینار

(ترجمہ :- صوبہ دار نے پچاس ہزار روپے کا مطالبہ کیا اور میں نے جواب دیا کہ

میں ایک دینار بھی تمہیں نہیں دوں گا)

مقصد کہنے کا یہ ہے کہ خوشحال خان کبھی بھی اُن ہتھکنڈوں میں نہیں اُلجھا جو اکثر شاہی نظام میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن جب اُسے بے گناہ اور بے قصور گرفتار کیا گیا تب بھی اُس کا خیال تھا کہ یہ باتیں صرف شاہی عمّال تک ہیں۔ بادشاہ کی ذات اُن سے مبّرا ہے۔ اس بنا پر پشاور میں گرفتار ہونے کے بعد اُس نے اپنے بیٹوں اور قبیلے کو پیغام بھیجا کہ جب مجھے قیدی کی حیثیت سے اپنے قبیلے کے راستے سے بادشاہ کے دربار میں لے جایا جائے گا تو خبردار کوئی مزاحمت نہ کرنا۔ کیونکہ جب میں بادشاہ کے سامنے حقیقت حال بیان کروں گا تو مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ انصاف ہوگا۔ مگر وہاں جاکر پانچ سال کی قید و نظر بندی کے دوران جو اُسے تلخ تجربہ ہوا اُس سے اُس پر آمریت کے اسرار رموز کھل گئے اور پھر نہ صرف یہ کہ اس کی شنوائی تک نہیں ہوئی بلکہ صوبہ دار کی سفارش پر بادشاہ نے اس کے خاندان کی یرغمالی کا حکم بھی صادر کیا + اور یوسفزئی آگے بڑھے نہ صرف اس کے خاندان کو بلکہ اس کے قبیلے کے سو دوسرے خاندانوں کو بھی نہایت ہی مروّت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پناہ دی۔ جب کہ خوشحال خان ہمیشہ ان سے لڑتا رہا بنیادی نقطہ اس کے ذہنی انقلاب کا یہی تھا۔ کوئی بھی فیلسوف جب ایک معمّے کا سامنا کرتا ہے اُسی معمّے کے حل کی تلاش میں اپنی سوچ، فکر اور عقل کے ذریعے وہ جو ارتقائی منازل طے کرتا ہے یہی اُس کا فلسفہ ہوتا ہے اور خوشحال خان کا معمّہ اپنے تمام تر خوشگوار تعلقات کے باوجود شاہی دربار کی طرف سے یہ رویہ اور ناخوشگوار تعلقات کے باوجود یوسف زیوں کا یہ سلوک تھا۔ اسی پر سوچتے سوچتے وہ شخصی حکومت کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اور اسی بنا پر اُسے شدت سے جمہوریت کا احساس ہوا۔ تقریباً پونے پانچ سال کی قید و نظر بندی کے بعد جب اُسے رہائی بھی دی گئی تو اُس توقع کے ساتھ کہ وہ بادشاہ کی طرف سے یوسفزیوں سے لڑے گا۔ اور یوسفزیوں کے علاقے میں ننگر کوٹ کے مقام پر مغلوں کے قلعے کی تعمیر کرے گا اور یہیں پر یک ہزاری منصبدار کی حیثیت سے کام کرے گا۔

خوشحال خان نے نہ صرف اس منصب کو ٹھکرایا بلکہ یوسفزیوں کے ساتھ لڑنے سے قطعاً انکار کیا اور جب صوبہ دار مہابت خان نے اُس کے بیٹوں کو اس کے خلاف اُکسایا تو بھی وہ خاموش رہا کیونکہ یہ آدمی کبھی اُس کا دوست رہا تھا اور زمانہ قید و بند میں اس کی

بکچھ مدد بھی کی تھی۔ لیکن اس تمام زمانے میں بھی وہ خاموش رہتے ہوئے متواتر سوچتا رہا۔ کیونکہ ایک طرف اگر اتنی عظیم سلطنت کے خلاف ایک فردِ واحد کے لئے کچھ کرنا ممکن نہ تھا تو دوسری طرف کسی ایسے تازیانے کی بھی ضرورت تھی جو اس کی جدوجہد کے آغاز کے لئے ضروری تھا۔ لہذا جب ایک پشتون خاتون کی بے حرمتی کے بعد حکومت کی طرف سے انصاف کرنے کی بجائے الٹا انصاف مانگنے والوں کو سزا دینے کی ٹھانی گئی اور اس کے ردعمل کے طور پر ایمل خان مہمند اور دریا خان آفریدی نے تحریک شروع کی تو یہ واقعی ایک بڑا تازیانہ تھا جس پر اسے بھی اٹھ کھڑا ہونے کی تحریک ملی۔ لیکن پھر بھی اتمام حجت کے طور پر اس نے کوشش کی کہ مغل صوبہ دار امین خان کو اس پر آمادہ کرے کہ انصاف مانگنے والوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہیئے نہ کہ سزا دینی چاہیئے۔ اس مشورے پر بھی اس کی سرزنش کی گئی پھر کوئی الجھن باقی نہ رہی اور اس مردِ مجاہد نے فیصلہ کرہی لیا۔ خوشحال خان کے پوتے افضل خان نے اس موقع پر تاریخ مرصع میں حکمرانوں کو خوش کرنے کے لئے واقعات کو توڑ مروڑ کر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ افضل خان جو شاہی دربار کا جاگیردار تھا کوشش کرتا رہا کہ دربار کی خوشنودی کے لئے اپنے دادا کے متعلق بھی ایسا کچھ لکھے جس سے خود اس کے متعلق کوئی بدگمانی پیدا نہ ہو۔ مثلاً یہ کہ وہ لکھتا ہے کہ جمرود کے مقام پر صوبہ دار امین خان سے خوشحال خان کی تلخ کلامی کے بعد اس نے صوبہ دار سے کہا کہ کل آپ دیکھ لیں گے کہ میں ایمل خان اور دریا خان کے خلاف کسطرح سے لڑتا ہوں۔ اور پھر خیبر کی جنگ میں ہراول کے دستے میں لڑا۔ جب کہ واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ وہ یوں کہ خیبر کی اس جنگ میں نہ صرف یہ کہ چالیس پچاس ہزار شاہی لشکر کاٹ کر رکھ دی گئی اس کے ساتھ سب سے پیچھے آنے والا امین خان کا حرم بھی گرفتار کیا گیا اور خزانہ لوٹ لیا گیا صوبہ دار امین خان خود بہت مشکل سے بھاگ کر نکلنے میں کامیاب ہوا۔ پھر خوشحال خان ہراول دستے میں لڑتے ہوئے کیسے بچ گیا؟ دوسرا یہ کہ خود افضل خان لکھتا ہے کہ خیبر سے واپسی کے بعد امین خان نے پشاور کے شاہی باغ میں ڈیرہ جمایا اور خیر خواہ ہمدردی کے لئے اس کے پاس آتے رہے لیکن خوشحال خان پشاور شہر کو بھی چھوڑ کر شہر سے جنوب کی طرف مڑتا ہوا سیدھا نوشہرہ پہنچا۔ آخر کیوں؟ تیسرا یہ کہ اس جنگ کے فوراً بعد اس نے شاہی حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور نوشہرہ کے قلعہ پر جس میں تین ہزار شاہی فوج تھی حملہ کیا اور فتح کیا۔ یہ اعلانِ جنگ خیبر

کی جنگ کے فوراً بعد کھلم کھلا طور پر کیوں کیا گیا؟ - چوتھی بات یہ کہ اگر خوشحال خان ایمل خان اور دریا خان کے خلاف خیبر کی جنگ میں لڑا تھا تو اس کے فوراً بعد انکی پارٹی ایک کیسے ہوئی - دوستی کیسے بنی؟ متحدہ محاذ کیوں قائم ہوا اور اعتماد کیسے حاصل ہوا جو موت تک قائم رہا - پانچویں اور سب سے بڑی بات یہ کہ خوشحال خان نے جس جنگ میں بھی حصہ لیا ہے اس کا اپنے اشعار میں ایسا خاکہ کھینچا ہے کہ اپنے ساتھیوں اور اپنے دشمنوں کے ایک ایک وار کا ذکر کیا ہے اور اگر کبھی شکست بھی ہوئی ہے تو اسے کبھی نہیں چھپایا - خیبر کی اس جنگ کا بھی وہ اپنے ایک قیصدے میں ذکر کرتا ہے - پہلے صوبہ دار امین خان کے باپ میر جملہ کا نام لے کر اس کے خاندان کی تباہی کا ذکر کرتا ہے اور بعد میں نہایت ہی شاندار الفاظ میں ایمل خان اور دریا خان کے لشکر کی فتح پر فخر کرتا ہے - اور اپنی شمولیت کا کوئی ذکر نہیں کرتا - ظاہر ہے کہ خوشحال خان کا جس نے تھوڑا سا بھی مطالعہ کیا ہو وہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اگر اس بڑی جنگ میں وہ شریک ہوتا تو اس کا ذکر سب سے پہلے کرتا اور پھر اپنے خلاف فتح پر فخر کیسے کرتا - ثابت یہ کرنا ہے کہ اس جنگ کی تو بات ہی کیا ہے قید سے رہائی کے بعد وہ تخت شاہی کی طرف سے کبھی کسی سے نہیں لڑا - امین خان کا اعتراض صرف شک کی بنا پر نہیں تھا اس کے پاس یقیناً یہ ثبوت بھی ہوگا کہ خوشحال خان ذہنی طور پر ایمل خان اور دریا خان کی جمہوری تحریک کا ساتھی ہے اور جنگ کے بعد ان کے آپس کے اعتماد سے زیادہ کون سے ثبوت کی ضرورت ہے جو اس بات کی تصدیق کرے، اور یہ واضح کرے کہ صرف ذہنی طور پر نہیں خفیہ طور پر ان میں فیصلہ پہلے سے ہو چکا تھا - البتہ خوشحال خان ایک طرف اگر اپنے سابقہ دوست امین خان کو تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا اور افہام وتفہیم کا مشورہ دیتا رہا دوسری طرف جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اتمام حجت تک انتظار کرنے کی دیر تھی - پھر جب سے اس نے تحریک شروع کی اس کے بعد فتح و کامرانی کے ساتھ ساتھ نہایت تلخ تجربات ہونے کے باوجود بھی وہ کبھی اپنے مشن سے باز نہیں آیا - جیسا کہ جادو ناتھ سرکار نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ "ایک فرد واحد جس کی اتنی بڑی سلطنت جان کے درپے ہو اس کا قبیلہ بھی ساتھ چھوڑ دے، اپنے بیٹے بھی کھلی مخالفت پر اتر آئیں، گھر بار تک سے محروم ہونا پڑے - عمر اس کی ستر (۷۰) سال ہو - پھر بھی اس کی ہمت نہ ٹوٹے تو وہ خوشحال خان خٹک ہوگا"

جیسا کہ خود اس نے ایک شعر میں یوں کہا ہے ؎

کہ آسمان دے د زمری په خُله کښے ورکه
د زمری په خُله کښے مه پریده همّت

(ترجمہ: اگر آسمان تجھے شیر کے منہ میں پھنسا دے تو شیر کے منہ میں ہوتے ہوئے بھی ہمت کا دامن مت چھوڑو)

اور اس تمام دوران شاہی حکومت بار بار کوشش کرتی رہی کہ خوشحال خان پھر سے منصب قبول کرے لیکن اُس نے تو یہ کہہ کر پہلے ہی فیصلہ کیا تھا کہ ؎

چه منصب ئے د مغل خوړو ملک وُم
چه منصب د مغل نشته اوس مَلک یم
د و خو جونګړے هسے راته شے شوے
وایم ناست په محلونو د آهک یم

(ترجمہ: جب میں مغلوں کا منصب دار تھا تو میری حیثیت ایک ملک کی تھی۔ اب جو منصب نہیں ہے تو میں فرشتہ ہوں۔ گھاس پھوس کے یہ جھونپڑے میرے لئے اتنے پرکشش ہیں جیسے میں سفید چونے کے بنے ہوئے محلات میں بیٹھا ہوں)

اندازہ لگایئے کہ منصب کے حصول کی تہمت لگانے والے کس حد تک حق بجانب ہیں اگر کوئی خاص تعصب نہ ہو تو پھر ماننا پڑے گا کہ ورثہ میں ملنے والی جاگیرداری کے بعد فوراً ایک نہایت ہی مضبوط حکومت کے خلاف تحریک نہ چلانا یا قید و بند سے پہلے حکومت وقت سے بغاوت نہ کرنا ایک فطری بات تھی۔ کوئی بھی لیڈر پیدا ہوتے ہی اپنا مشن شروع نہیں کرتا۔ حالات و واقعات پیدا ہونے کے بعد کوئی تحریک شروع کی جاتی ہے۔ اور محرکات جتنے شدید ہوں اُتنی ہی شدت اُس تحریک میں ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ تحریک شروع کرنے والا آخر دم تک اپنے اصول پر قائم رہا یا کبھی انحراف کیا۔ میرے خیال میں اس اصول پر پرکھنے کے بعد خوشحال خان خٹک پر اُنگلی اٹھانا یقیناً زیادتی ہوگی۔ اس کا ایک شعر ہے۔

؎ چه جامه ئے پاتے نه شی مرده شوئی نه
خدایه ورکړے و خوشحال هسے رحلت

(ترجمہ: اے خدا خوشحال کو ایسی موت دے کہ غسّال کے لئے اس کا کپڑا تک باقی نہ رہے)

ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے مشن کی تکمیل کی جدّوجہد میں اتنا بڑا سردار، منصب دار، رئیس و جاگیردار جب اپنے گھر گاؤں قبیلے سے باہر علاقہ آفریدی میں مرتا ہے تو نہ آنسو بہانے والی ایک آنکھ ہے اور نہ کوئی سازوسامان۔ یہ سب کچھ کس بات کی نذر ہوگیا۔ اُنہی جمہوری اقدار کی بحالی کی جدّوجہد کی نذر جس پر بات شروع کی گئی تھی۔

چلتے چلتے صاحب سیف کی حیثیت سے بھی اگر مختصر تذکرہ کیا جائے تو شاید حرج نہ ہو۔ جب وہ کہتا ہے۔ ؎

د خوشحال د زړهٔ خوشی په هغه وخت وي
چه بریشناد سپینو تورو شي د ښا غـــــرد

(ترجمہ: خوشحال کا دل صرف اُس وقت خوش ہوتا ہے جب سفید تلواریں اور زرہ بکتر چمکتے ہیں)

ہم دیکھتے ہیں کہ تلوار اُسے ورثے میں ملی تھی۔ اُس کا باپ، دادا، پردادا سب مردانِ کارزار تھے اور میدان جنگ ہی میں مارے گئے۔ یہی حال اس کے تمام شجرہ نسب میں چلا آتا ہے۔ تیرہ سال کی عمر میں اس نے جو تلوار کا دستہ تھاما ہے اٹھتر سال کی عمر میں صرف موت نے اُس پر اس کی گرفت ڈھیلی کی ہے۔ اور اس کی زندگی کے تمام واقعات اس کا بیّن ثبوت ہے۔ اگر صرف ایک ہی واقعے کا ذکر کیا جائے تو بات صاف ہو جائے گی۔ جب شاہجہان بادشاہ کی افواج نے کانگڑے کے راجہ جگت سنگھ پر چڑھائی کی تو وہاں تاراگڑھ کا ایک قلعہ ایک ایسی پہاڑی کی چوٹی پر تھا جس کے چاروں طرف کے راستے نہایت ہی دشوار گذار تھے۔ اور قلعہ بھی بہت مضبوط تھا۔ ایک راستہ جس پر چڑھائی کی جا سکتی تھی اس میں ایک ایسا مورچہ تھا جسے فتح کرنا بظاہر ناممکن نظر آرہا تھا۔ بادشاہ کی تمام افواج نے جس میں اصالت خان اور بہادر خان جیسے بڑے بڑے آزمودہ کار جرنیل بھی تھے باری باری اس مورچہ کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن جونہی وہ اس کے قریب جاتے تو اُوپر سے ایسی آگ برسائی جاتی کہ وہ سب پسپا ہونے پر مجبور ہوتے۔ خوشحال خان بھی اپنے دو ہزار لشکر کے ساتھ اس جنگ میں بادشاہ کی طرف سے

شامل تھا۔ آخر کار اصالت خان اور بہادر خان نے اس سے کہا کہ تم بھی قسمت آزمائی کرو۔ جب یہ اپنے ساتھیوں سمیت اس مورچے کی طرف بڑھا تو اوپر سے وہ آگ برسائی گئی کہ الامان والحفیظ۔ اور جب اس کے ساتھیوں کی ہمت جواب دے گئی تو اس حال میں اس نے مڑ کر اپنے ساتھیوں سے یوں خطاب کیا کہ بھاگ کر جاؤ گے تو کہاں تک ؟ وطن تو یہاں سے بہت دور ہے۔ اور دیکھتے نہیں کہ تمام ہندوستان کی افواج تمہارا تماشا دیکھ رہی ہیں۔ آج تم نے ثابت کرنا ہے کہ بہادری کسے کہتے ہیں۔ آگے بڑھو۔ جوانمردوں کی طرح موت سے ہم آغوش ہو جاؤ اور یا فتح حاصل کرو۔ جیسے کہ وہ کہتا ہے ؎

په جهان د ننګيالي دی دا دوه کاره
يا به اُو خوري ګګري يا به کامران شي

(ترجمہ: اس جہان میں صاحب عزت آدمی کے لئے صرف دو راستے ہیں یا تو اس کا سر کٹ جائے گا اور یا کامران ہوگا)

یہی ہوا کیونکہ فنون جنگ کے متعلق جہاں اس نے اور بہت کچھ لکھا ہے وہاں صرف ایک نتیجے پر پہنچا ہے۔ وہ یہ کہ ؎

که د جنګ په کار کښې ډیرې حکمتونه
چه په سر صرفه اُو نه کړے هنر دادے

(ترجمہ: جنگ لڑنے کی جہاں اور بہت سی حکمتیں ہیں وہاں جنگ جیتنے کا واحد ہنر یہ ہے کہ سر کو ہتھیلی پر رکھ کر لڑا جائے)

قدیم سپارٹا والے تھے یا جاپانی۔ ترک تھے یا آج کل کے ویٹ نامی۔ سب نے اپنی بہادری کی دھاک اسی ہنر سے بٹھائی ہے۔ اور جب اس ہنر کو کام میں لایا گیا اور خوشحال خان کا لشکر اس کی قیادت میں آگے بڑھا تو دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مورچہ فتح ہوا اور افواج ہندوستان تماشا دیکھتے ہوئے انگشت بدنداں رہ گئے۔ اس فتح کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگ سکتا ہے کہ شاہجہان نے نہ صرف اس پر اُسے چار لاکھ روپیہ کا انعام دیا بلکہ جاگیر میں بھی خاطر خواہ اضافہ کیا۔

اس مرد آہن کی ساری زندگی ایسے ہی معرکوں سے عبارت ہے۔ حتیٰ کہ جب اُس کا بیٹا نظام خان چھبیس (۲۶) سال کا جوان رعنا مرتا ہے تو وہ کون باپ ہوگا جس کو ایسے سانحے پر

دکھ نہ ہو۔ خوشحال خان بھی بہت ہی زیادہ دکھی ہے لیکن کیوں۔ اس لئے کہ نظام خان کو بستر پر پڑے ہوئے موت آئی ہے اور باپ کی خواہش کے قطعاً برعکس۔ کیونکہ وہ تو چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا ایک مثالی پشتون کی طرح میدان کارزار میں لڑتے ہوئے اور داد شجاعت دیتے ہوئے موت سے ہمکنار ہوتا۔ اس لئے کہ جو بیٹا قومی عزت وناموس کے تحفظ کے لئے مر جائے وہ دنیا میں باپ کی گردن اونچی کر لیتا ہے۔

کاش چه ځوان د پښتانهٔ په ننګ کښے مړ وے
نهٔ چه کور لره ور دروے له تو لتکه
چه د قام په ننګ کښے و مره غنه ځویه
په عالم کښے د بابا غاړه کړه لکه

(ترجمہ: کاش تو ایک پشتون کی طرح میدان جنگ میں لڑتے ہوئے جوان مر جاتا۔ جو جوان قومی عزت وناموس کے تحفظ کی خاطر لڑتے ہوئے مر جائے وہ دنیا میں باپ کی گردن اونچی کر لیتا ہے)

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

د زمریو مړنتوب په لښکر نه وی
مټ ئے هر کله یواځے په خپل ځان شی

(ترجمہ: شیر اس لئے بہادر نہیں ہوتے کہ اُنکے پاس لشکر ہوتے ہیں۔ وہ تو اپنے زور بازو پر بھروسہ رکھتے ہیں)

اور اس کا عملی نمونہ یوں پیش کرتا ہے کہ خوشحال خان بے یار و مددگار اپنے گھر گاؤں کو خیر باد کہتے ہوئے منظام پور کے مقام پر تن تنہا بیٹھا ہوا ہے۔ حکومت کا حکم ہے کہ اسے بہر حال گرفتار کر کے لانا ہے۔ اپنے ہی بیٹے حکومت کی طرف سے اس کی گرفتاری کی سر توڑ کوشش میں مصروف ہیں۔ جب کہ اس کی عمر پچھتر چھتر سال ہے۔ سب نے ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ چاروں طرف سے دشمن نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا ہے۔ دشمن کا لاؤ لشکر قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہ بوڑھے شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے آواز پہ آواز دیتا ہے۔ تلوار پر گرفت حسب معمول سخت ہے۔ دعوت مبارزت دیتا ہے کہ آؤ۔ آگے بڑھو۔ جس کی ہمت ہے۔ میرے سامنے

آئے ۔ میرے ساتھ بازو آزمائے اور تماشا دیکھے ۔ مخالفین کے لاؤ لشکر میں کسی کی بھی ہمت نہیں ۔ کوئی بھی قریب آنے کی جرأت نہیں کر سکتا ۔ کون اپنے سر سے گذرے ۔ کون جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ۔ سب ہی جانتے ہیں کہ مدمقابل کون ہے ۔ اتنے میں نماز کا وقت آتا ہے تو یہ مرد خدا چیخ کر کہتا ہے کہ تم سے میں کوئی درخواست نہیں کرتا ۔ تم آگے بڑھ نہیں سکتے اور ادھر نماز کا وقت جا رہا ہے ۔ میں نماز پڑھتا ہوں ۔ صرف اتنی مہربانی کرنا کہ نماز پڑھتے ہوئے مجھے دھوکہ نہ دینا ۔ نماز سے فارغ ہونے تک صبر کرنا ۔ اور پھر جو جی میں آئے کر گذرنا ۔ نتیجہ یہ کہ دشمن اس بے سروسامانی کے باوجود اس کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا ۔ خوشحال کو معلوم ہے کہ رہتی دنیا تک صرف اُن لوگوں کو یاد کیا جاتا ہے جو بہادر ہوں ۔

میرنی دی چه یادیږی — په سندرو هم په ویر

(ترجمہ : راگنوں میں اور ماتم میں صرف بہادروں کو یاد کیا جاتا ہے)

اب ذرا تلوار کا ذکر چھوڑ کر ہم قلم کی بات کرتے ہیں ۔ ایک جگہ پر اُس نے دعویٰ کیا ہے ؎

که د نظم که د نثر که د خط دے

په پښتو ژبه مے حق دے بے حسابه

(ترجمہ : میرا پشتو زبان پر بہت بڑا احسان ہے چاہے وہ نظم ہو ، نثر ہو یا رسم الخط) اس میں کوئی شک بھی نہیں ۔ خوشحال خان سے پہلے پشتو زبان کی حیثیت ایک شہ زور گھوڑے کی تھی جسے لگام دینا یا اس پر سواری کرنا ممکن ہی نہ تھا ۔ کئی لوگوں نے کوشش ضرور کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن بات نہ بنی ۔ امیر کروڑ سے لے کر بیٹ نیکہ ، اسماعیل غرشین ، اکبر زمینداوری ، سلیمان ماکو ، بایزید انصاری ، اخون درویزہ ، مرزا خان انصاری ، دولت اللہ لوہانی ، ارزانی ، واصل سب نے نظم اور نثر میں طبع آزمائی کی ۔ لیکن زبان کی بات وہیں پر رہی ۔ اُس زمانے کی ترقی یافتہ زبانوں مثلاً عربی فارسی کے مقابلے میں خوشحال خان سے پہلے کا ادب رکھنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا ۔ جب خوشحال خان نے قلم سنبھالا تو اس شہ زور گھوڑے کو وہ شہسوار مل گیا جس کا اسے انتظار تھا ۔ ایک طرف سے اسے لگام دیا اور دوسری طرف سے ایڑ لگائی اور پھر یہ ہوا سے باتیں کرنے لگا ۔ خوشحال خان

کا فارسی کلام اس بات پر گواہ ہے کہ وہ نہ صرف اس زمانے کے باقی علماء اور شعراء کی طرح اس زبان کا عالم تھا بلکہ اس میں بخوبی اظہار خیال بھی کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے دیدہ و دانستہ پشتو کا انتخاب کیا۔ جیسے کہ اس نے ایک شعر میں بتایا ہے ؎

په فارسئ ژبه ے هم قلم گویا دے

بارے څه کرم هاخوک خپل لری بناغلی

(ترجمہ: میرا قلم فارسی بھی لکھ سکتا ہے لیکن اپنوں کی بات ہی کچھ اور ہے)

اس نے پشتو کا انتخاب صرف مادری زبان ہونے کی وجہ سے نہیں کیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ جن خیالات کا وہ اظہار کرنا چاہتا تھا اور جو پیغام وہ دینا چاہتا تھا اس کے لئے مزاج کے لحاظ سے صرف اور صرف پشتو ہی موزون تھی۔ زبان کو اس کا یہ فائدہ ہوا کہ اس سے پہلے جو نثر لکھی گئی تھی اس کے مقابلے میں جس نثر کی بنیاد خوشحال خان نے رکھی وہ انتہائی ترقی یافتہ نثر تھی۔ دستار نامہ کی نثر اس بات کا ثبوت ہے۔ اور اس کے بعد سے اسی نثر کو بنیاد بنا کر نثر نگاری کی جاتی رہی۔ رسم الخط کی تو بات ہی کیا ہے اس نے تو اس زمانے میں پشتو شارٹ ہینڈ کا بھی زنجیری کے نام سے ایجاد کیا۔ اور جب ہم اس کی نظم کی بات کرتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے سامنے ایک دنیا کھل جاتی ہے حیرت زدہ ہو کر یہ سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں کہ اب کیا کہیں اور کیا چھوڑیں۔ اس نے نظم کو ہاتھ لگا کر پشتو نظم کی تو کیا پشتو زبان کی دنیا بدل دی۔ وہ کون سا صنف سخن ہے جس میں اس نے طبع آزمائی نہیں کی۔ اور زندگی کا وہ کون سا پہلو ہے جس کو اس نے موضوع بحث نہیں بنایا۔ کونسا وہ صحت مند پیغام ہے جو اس نے اپنی شاعری میں نہیں دیا؟

غزل، قصیدہ، رباعی، ترجیع بند، مخمس، غرضیکہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں اس سے پہلے جتنی بھی اصناف سخن تھیں سب میں نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ بیک جنبش قلم پشتو نظم کو ان کے مقابلے میں یوں لا کھڑا کیا کہ رہتی دنیا تک کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس زبان میں نہایت ہی ترقی یافتہ ادب موجود نہیں ہے، عشقی، بزمی، اخلاقی، اجتماعی، وطنی، ملی، مذہبی، فلسفیانہ، صوفیانہ، رزمی، حماسی، فکاہی اور باقی ہزار قسم کے مطالب کو شعر کا جامہ پہنایا۔ ہر کسی کے ذوق کی بات سادہ اور سلیس پیرائے میں کی۔ اور اس دعوئ کا ثبوت فراہم کیا۔ ہے

ما خوشحال چه په پښتو علم بلند کړو
د خبرو ملک ے فتح په سمند کړو

(ترجمہ:۔ خوشحال خان نے پشتو میں جو علم بلند کیا تو اپنے سمند سے جہانِ سخن کو فتح کیا)

مرد کے لئے اُسے جو کچھ پسند ہے آپ بھی لطف اندوز ہو جایئے ؎

مرد هغه چه همت ناک برکت ناک
د عالم سره خوږ په زیست وژواک
مخ ئے بخ قول ئے قول عهد ئے عهد
نه دروغ نه ئے فریب نه تش تپاک
لږ وئیل ډیر ئے کول په خاموشئ کښے
د غنچے غونی ئے خُله پورے سینه چاک
چه خبره د پستئ د بلندئ شی
په لوئی لکه آسمان په پستئ خاک
چه دا هسے بنه وئیل کانهٔ پوهیږم
چه خوشحال را دی هوله کومه دا ادراک

(ترجمہ:۔ مرد وہ ہے جو ہمت والا ہو، برکت والا ہو۔ اس کا چہرہ روشن ہو۔ قول اور عہد کا پکا ہو۔ نہ جھوٹا ہو، نہ فریبی ہو اور نہ زبانی جمع خرچ کرتا ہو۔ باتیں کم اور عمل زیادہ کرتا ہو۔ غنچے کی طرح اس کا منہ بند اور سینہ چاک ہو۔ جب پستی اور بلندی کی بات آجائے تو وہ بلندی میں آسمان اور تواضع میں خاک بن جائے۔ یہ جو ایسی اچھی باتیں کہتا ہے۔ معلوم نہیں کہ خوشحال کو یہ ادراک کہاں سے ملا)

خوشحال کے بارے میں جتنی بھی تحقیقات ہوتی ہے اس سے ہم اُن اونچی انسانی صفات اور فضائل کے ساتھ واقف ہوتے جاتے ہیں۔ جس سے خوشحال کے کلام اور شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ جب ہمیں یہ بتاتا ہے ؎

چه دستار تړی هزار دی ؎
د دستار سړی په شمار دی

(ترجمہ:۔ ویسے تو ہزاروں لوگ دستار باندھتے ہیں لیکن دستار کی اہمیت صرف چند ایک میں ہوتی ہے)

جیساکہ اس نے خود اپنی نثر کی کتاب دستار نامہ میں بیان کیا ہے کہ دستار باندھنے والے کسی سردار یا مملکت کے سربراہ کے لئے مندرجہ ذیل بیس ہنر اور بیس خصائل کا حتمی طور پر حامل ہونا چاہیئے۔

ہُنر:۔ (۱) خود شناسی (۲) علم اور کمال کا حصول (۳) خط کا ہنر (۴) شعر کا ہُنر (۵) تیر اندازی کا ہنر (۶) داؤ بازی کا ہنر (۷) شہسواری کا ہُنر (۸) شکار کا ہُنر (۹) شجاعت کا ہنر (۱۰) سخاوت کا ہنر (۱۱) ازدواج اور معاشرت کا ہُنر (۱۲) اولاد کی تربیت (۱۳) خدمت گاروں اور لشکر کی تادیب کا ہنر (۱۴) معیشت کو سنوارنے کا ہُنر (۱۵) زراعت اور دہقانی کا ہُنر (۱۶) تجارت کا ہُنر (۱۷) تحقیق نسب کا ہنر (۱۸) موسیقی کا ہنر (۱۹) نرد اور شطرنج کا ہنر (۲۰) نقاشی اور مصوری کا ہنر۔

خصائل:۔ (۱) مشاورت (۲) عزیمت (۳) خاموشی (۴) راستی (۵) شرم وحیا (۶) نیک خوئی (۷) مروّت (۸) عفووکرم (۹) تمیز (۱۰) عدل وانصاف (۱۱) توکل (۱۲) پرورش اور دارو مدار کا استعمال حسب حال (۱۳) خوف ورجا (۱۴) مملکت کا انتظام (۱۵) ہمت (۱۶) حلم (۱۷) غیرت (۱۸) احترام اور احتیاط (۱۹) طاعت وتقویٰ (۲۰) استغفار

خوشحال خان خود بھی نہایت متوکل انسان تھا اور دوسروں کو بھی یہی درس دیتا ہے وہ اس عقیدے میں یقین ہی نہیں رکھتا کہ اگر

؎ زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ بساز

اُس کا عقیدہ تو بس یہی ہے کہ

؎ زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیز

اور کہتا ہے ؎

توکلتُ علی اللہ وینا یوہ دہ
دخوشحال دزمانے سرہ ساز نشتہ

(ترجمہ:۔ میری تو بس ایک ہی بات ہے اور وہ ہے توکلتُ علی اللہ۔

خوشحال کی زمانے کے ساتھ کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔
لیکن جب فلسفے میں جاتا ہے تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جیساکہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ علم کی انتہا ہے حیرت۔ اور مشہور بات ہے کہ سقراط سے کسی نے پوچھا کہ آپ اس دنیا میں کیا سمجھے؟ جواب تھا "کچھ نہیں"۔ پھر سوال ہوا کہ پھر آپ میں اور ایک جاہل میں فرق کیا رہا؟ جواب دیا یہ کہ اُسے اپنی ناسمجھی کا احساس نہیں اور مجھے ہے۔
خوشحال کیا کہتا ہے ؎

ما چه نظر او کړه په ذرات په موجودات
ګول په جهان را غلم ترے به ګول دروم هیهات
یو څادر تر میان وی فهم پاتے شی له کاسه
دا هومره قیصے هومره ادراک د سماوات

(ترجمہ:۔ جب میں نے ذرات اور موجودات پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ میں اس دنیا میں حیرت زدہ آیا اور حیرت زدہ مروں گا۔ حد یہ ہے کہ جہاں ایک چادر بیچ میں حائل ہو تو وہاں عقل و فہم اندازہ لگانے سے قاصر رہ جاتی ہے اور پھر ہم اتنی باتیں کرتے ہیں اور آسمانوں کے ادراک کے درپے ہیں۔)
لیکن ساتھ ہی وہ اُس زمانے میں جب کہ زمین پر صرف بیل گاڑیاں چلتی تھیں اور اگر کوئی ایسی ویسی بات کہتا تو لوگ اسے فاترالعقل سمجھتے۔ مگر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ صرف ہنر کی کمی ہے ورنہ آسمان پر چڑھا جا سکتا ہے اور میں تمہیں ہنر کے ذریعے وہ رستہ بتا سکتا ہوں
؎ وائے لار د ختونشته وآسمان ته ـ زه به لار در ته پیدا کړم په هنر
(ترجمہ:۔ تم کہتے ہو کہ آسمان پر پہنچ جانے کا کوئی رستہ نہیں۔ میں ہنر کے ذریعے یہ رستہ پیدا کر کے بتا سکتا ہوں۔)
اور آگے جا کر کہتا ہے ؎

جهانونه څه لږ نه دی	ته ئے نه وینے نادانه
ګوره څو دی هسے زمکے	ګوره څو هسے آسمانه
داره خائے دی شا په زړه کښے	اے ترعرش لویه اسانه

آئینه د زړهٔ صیقل کړه   چه ئے اوو ینے اے جانه
که دے دا ننداره اُوشی   جدا نهٔ ئے له سبحانه

(ترجمہ :۔ جہان بہت زیادہ ہیں تو اپنی نادانی کی وجہ سے انہیں دیکھ نہیں سکتا ۔ایسی کئی اور زمینیں اور کئی آسمان ہیں ۔ اے عرش سے عظیم انسان !سب تیرے دل میں سموئے ہوئے ہیں ۔ اپنے دل کا آئینہ صاف رکھو ۔ میری جان تب اُسے دیکھ سکوگے ۔ اگر یہ تماشا دیکھ سکا تو پھر تو اللہ تک پہنچ گیا)

اُسے یہ شدید احساس ہے کہ انسان کو اللہ پاک نے زمین پر مفت میں اپنا خلیفہ بناکر نہیں بھیجا۔ اس میں بے انتہا صلاحیتیں موجود ہیں ۔یہ الگ بات ہے کہ یہ اپنی ہی صلاحیتوں کا کھوج نہیں لگا سکتا ۔ فرماتا ہے ؎

ماهیت ئے موندهٔ نهٔ شی   چه څه څیز دے دا بشر
که دے دے په جهان کښے   بل به نهٔ وی دیده ور
څهٔ خو لیئ تر خدائے راکوزدے   که ئے نهٔ دے برابر

(ترجمہ :۔ یہ بشر بھی عجیب چیز ہے جس کی ماہیت کا اندازہ تک نہیں لگایا جا سکتا۔ دنیا میں اس کے مقابلے کا دوسرا کوئی دیدہ ور ہو ہی نہیں سکتا ۔ اگرچہ یہ خدا تو نہیں ہے لیکن خدا کا نائب ضرور ہے)

لیکن یہی بشر جب نامرد ہو جاتا ہے تو خوشحال اُس سے اس حد تک بیزاری کا اظہار کرتا ہے ؎

بنه د مرد سره په بیدیا بیدیا ورک   ژ نامرد سره مکے ته رسیدل ئے

(ترجمہ :۔ میں مرد کے ساتھ صحراؤں میں گم ہو جانے کو نامرد کے ساتھ مکے پہنچنے پر ترجیح دیتا ہوں ۔)

؎ پس له مرګه بنخ د مرد تر قدم بنهٔ یم ۔ ګورے مهٔ شه د نامرد له ګور وسم

(ترجمہ :۔ موت کے بعد میں مرد کے قدموں میں دفنائے جانے کو ترجیح دوں گا ۔ خدا نہ کرے کہ میری قبر نامرد کے ساتھ بنے)

مرد ہونے کیلئے تو ایک معیار ہے ۔ خوشحال خان کی زبانی سنئے ؎

خو پیدا نهٔ کړی کردار   ٭ مرد به نهٔ شی په ګفتار

چه غیرت ورسره نهٔ وی
هغه مرد نهٔ دے پکار
چه ځهره لری هم زهر
بنهٔ مردان دی لکه مار
چه هم تند رهم باران وی
له هغو مردانو ځار
مرد به غم د ځپل هنر که
نهٔ د زر نهٔ د دینار
نامرد فخر په نسب که
مرد نهٔ مور لری نهٔ پلار

(ترجمہ:۔ گفتار سے کوئی مرد نہیں بنتا جب تک کردار پیدا نہ کرے۔ جس میں غیرت نہ ہو اُس مرد کی کوئی ضرورت نہیں۔ اچھے مرد تو سانپ کیطرح زھر بھی رکھتے ہیں اور زہر مہرہ بھی۔ میں اُن مردوں کے قربان جاؤں جو آسمانی بجلی بھی ہوں اور بارش بھی۔ مرد کو تو بس اپنے ہنر کی فکر ہوتی ہے زر اور دینار کی نہیں۔ اپنی شرم کی فکر ہوتی ہے اور عزت وپ عتباری۔ نامرد نسب پر فخر کرتا ہے۔ مرد کی نہ ماں ہوتی ہے نہ باپ)

آزادی کا درس یوں دیتا ہے ؎

آزادی تر بادشاهیه لا تیرے که
چه د بل تر حکم لاندے شی زندان شی

(ترجمہ:۔ آزادی تو سلطنت سے اونچی چیز ہے جو دوسرے کے حکم کا ماتحت ہو وہ تو زندان میں رہتا ہے)

اور نوکری کے متعلق کہتا ہے ؎

ر نوکر ژوندے نۂ وی حال ئے دمړۂ وی
خپل زړۂ ئے نۂ وی د صاحب په زړۂ وی

(ترجمہ :ر نوکر زندہ نہیں مردے کی مانند ہوتا ہے۔ اپنا گویا دل ہی نہیں رکھتا بس صاحب کی مرضی پر چلتا ہے)

ر چه ورته حکم دخپل صاحب وی
که هر څو گران وی هم ئے په وړۂ وی

(ترجمہ :ر صاحب جو بھی حکم دے وہ چاہے کتنا مشکل کیوں نہ ہو یہ تعمیل کرنے پر مجبور ہوتا ہے)

دشمن کے سامنے آکر کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ چاہے تیرے دل پر غم واندوز کے کالے بادل چھائے ہوئے ہیں پھر بھی اُس کے سامنے ہنسا کرو۔ خوشی کا اظہار کرو۔ مسرور ہونے کا تأثر دو۔ اور اگر زیادہ پریشانی سے تیرا چہرہ زرد پڑ چکا ہے تو اپنے مُنہ پر دونوں ہاتھوں سے تھپیڑ لگا کر اُسے سرخ کرو تاکہ دشمن اُسے زرد نہ دیکھ سکے۔ ر

غم د غلیم ته له دله دُور کړه
خاندہ هوس کړه شادی سرور کړه
که مخ دے زیړ دی په دلگیری کښے
ته ئے په دوارو څپیړو سور کړه

(ترجمہ :ر دشمن کے سامنے اپنے دل سے غم کو دور رکھو۔ اُس کے سامنے ہنسو، خوشی اور سرور کا مظاہرہ کرو۔ اگر پریشانی سے تیرا چہرہ زرد پڑ چکا ہو تو اُسے دونوں ہاتھ سے تھپیڑ مار کر دشمن کے سامنے آنے سے پہلے سرخ بنا دو)

وہ پریشانی اور دلجمی کا راز بھی جانتا ہے اور ہمیں بھی بتاتا ہے۔ ؎

د دنیا په پریشانئ کښې جمعیت دے
د دنیا په جمعیت کښې پریشانی ده

(ترجمہ:۔ دولت کو لٹاؤ، تقسیم کرو اس سے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے اور دولت کو اکٹھا کرنے کی کوشش کا نتیجہ پریشانی کی صورت میں سامنے آتا ہے)

لیکن باوجود اس کے وہ بے کاری کو سخت ناپسند کرتا ہے اور ظلم سے حاصل کئے ہوئے رزق کو زہر سمجھتا ہے۔ اگر تعریف کرتا ہے تو محنت مشقت سے کما کر کھانے کی کرتا ہے ؎

څوک چه ډوډیه د دهقانی خوری
نوا ړه د حورو د مهمانی خوری
چه ئے د ظلم خوری واړه د زهر شی
که سالنونه د سلطانی خوری

(ترجمہ:۔ جو کسان کی طرح محنت کر کے روٹی کھاتا ہے وہ گویا حور و قصور کا مہمان ہو کر کھانا کھاتا ہے اور جو ظلم سے حاصل کر کے کھاتا ہے تو خدا کرے کہ وہ اس کے لئے زہر ہو جائے چاہے وہ سلطانی کھانے کیوں نہ ہوں) ؎

هر ساعت چه په چا تېر شي بیکار
تر هغه نه زه ئے لا ښه گڼړم بیگار
رنځوران که کاروبار نه کا معذور دی
روغ سړے به ولے نه کا څپل روزګار

ترجمہ:۔ جو گھڑی بیکاری میں گزرتی ہو تو میرے خیال میں بیکار رہنے کی بجائے کوئی بیگار بھی کرے تو وہ اچھا ہے۔ بیمار اگر کام نہیں کرتے تو معذور ہوتے ہیں۔ ایک صحتمند آدمی اپنا روزگار کیوں نہیں کرے گا۔)

ملک میں رخنہ ڈالنے والوں کے متعلق کہتا ہے ؎

رخنه ګر د ملک پرے مه بده څپل ملک کښے
په حکمت په زرو زور په حکمتونو

ثوک پہ تورہ وپہ توبریو پہ نیزو شی

صد چند ان شی پہ تدبیر پہ ہنر و نہ

(ترجمہ :۔ جو لوگ ملک میں رخنہ ڈالتے ہیں ان کا قلع قمع کرو۔ حکمت سے، زر سے، زور سے اور لشکر سے۔ لیکن جو کام تلوار، تیر اور نیزوں سے ہوتا ہے اس سے سو گنا زیادہ اچھی طرح ہنر اور تدبیر سے ہوتا ہے۔

طمع اور حرص ایک ایسی بلا ہے جو ایک طرف انسان کو اپنے مقام سے بہت نیچے گرا دیتا ہے اور وہ ایک خود ساختہ عذاب میں ہمیشہ کیلئے مبتلا رہتا ہے۔ دوسری طرف یہ بہت بڑے فساد کی جڑ بھی ہوتی ہے۔ اور جو طمع اور حرص سے ناآشنا ہوں وہ ننگے بھوکے رہتے ہوئے بھی بادشاہوں سے زیادہ اچھے رہتے ہیں۔ خوشحال خان کہتا ہے ؎

طمع بلا دہ اسیر بندہ کا

ښہ ښہ سړی وی دا ګندہ کا

ما دیر لیدلی چہ طمع نہ لری

پہ بادشاہانو پورے خندہ کا

(ترجمہ :۔ طمع ایک بلا ہے جو انسان کو اسیر کر دیتی ہے۔ بہت اچھے اچھے لوگوں کو گندہ کر دیتی ہے۔ میں نے ایسے بہت دیکھے ہیں جو بے طمع ہوتے ہیں لہذا بادشاہوں کا مذاق اڑاتے ہیں)

ساتھ ہی وہ احسان اٹھانے کو بھی انتہائی برا اور ناقابل برداشت سمجھتا ہے۔

د منت دارو کہ مرم پکار مے نہ دی

کہ علاج لرہ مے راشی مسیحا ھم

د فرښتو آمین منت دے پہ دعا کښے

لاجرم ورځنے پیتہ کړم دعا ھم

(ترجمہ :۔ میں اگر مر بھی جاؤں تو وہ دوائی نہیں کھاؤں گا جس سے مجھے کسی کا زیر احسان ہونا پڑے چاہے حضرت مسیحا خود میرے علاج کیلئے چل کر کیوں نہ آئے دعا کرتے وقت فرشتے جو آمین کہتے ہیں وہ بھی احسان ہے اس لئے میں دعا بھی ایسا

که نوم د حجاج اورے اوړنوم د نوشیروان
په عدل کافرښه ٹشو ظلم بد کړ مسلمان

(ترجمہ :- حجاج کا نام بھی سنتے ہو اور نوشیروان کا بھی۔ عدل نے ایک کافر کو اچھا نام دیا اور ظلم میں مسلمان کو برا نام)

شاھین اور کلاغ کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

د کلاه لائق خو باز دے یا شاهین دے
په داځه چه د کلاغ په سر کلاه شی

(ترجمہ :- کلاہ کا لائق تو باز ہے یا شاہین یہ بھی کوئی بات ہے کہ کلاغ کے سر پر کلاہ ہو۔)

اس کا نظریہ یہ ہے کہ کوئی کام بھی ہو وہ محض اللہ پاک کی خوشنودی کیلئے ہو۔ اللہ کی محبت بغیر کسی جزا کی امید کے دل میں رکھتے ہوئے کرنی چاہئے۔ اور یہ دونوں جہانوں کی خوشی کا باعث بنتا ہے ؎

څوک چه دنیا غواړی هغه رنځور دے
هرچه عقبیٰ غواړی هغه مزدور دے
هرچه مولیٰ غواړی تر هغو ځارشه
هغه په دواړو کونو مسرور دے

(ترجمہ :- جو لوگ دنیا کی طلب کرتے ہیں وہ بیمار ہیں۔ جو عقبیٰ کے طالب ہیں وہ مزدور ہیں۔ اور جو صرف اور صرف اللہ کی رضا، محبت اور خوشنودی کے لئے جیتے ہیں ان کے قربان جاؤں وہ دونوں جہاں کی خوشیاں لٹاتے ہیں۔)

اور آگے کہتا ہے ؎

د هوس خدایان دِلرے کړه له دله
یوځ خدائے وته چه ناست په سجده ئے

(ترجمہ :- تو جو خدائے واحد کے آگے سر بسجود ہے تو یہ ہوس کے بت تو اپنے دل سے ہٹا دے۔)

شرع کے ہوتے ہوئے وہ باقی فلسفوں کو جو غیر شرعی ہوں کیسے سمجھتا ہے ؎

فلسفه معتزله واړه گمراه دی
چه بے شرعه په خپل رائے کاندی ترغیب

(ترجمہ:۔ جو لوگ غیر شرعی رائے کی ترغیب دیتے ہیں وہ سب گمراہ ہیں چاہے وہ فلاسفر ہوں یا معتزلہ)

رسول پاک صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

زۀ تا پیدا کړم له خاو طین
بهره دې راکړه د دین متین
دین مے منلے د پاک رسول دے
زما توبه ده له غیر دین

(ترجمہ:۔ مجھے تو نے خاک اور پانی سے پیدا کیا اور پھر دین متین سے بہرہ ور کیا میں نے اپنے پاک رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا دین مان لیا ہے اس کے بغیر کسی دین سے بھی میری توبہ ہے)

امر ونہی کے متعلق کہتا ہے ؎

امر کړه خوشحاله پسے تنه اوسه له نهی
هر چه نهی کاندی هغه زر په پښیمانی دی

(ترجمہ:۔ اے خوشحال! تو امر بالمعروف کے تابع رہ اور نہی عن المنکر سے بچتا رہ۔ جو نہی کے کام کرتے ہیں وہ بہت جلد پشیمان ہو جاتے ہیں۔)

مظلوموں سے زیادتی کرنے والے خان کے متعلق بھی اسکی رائے سن لیجئے ؎

دا چه خانان دی یا امراکان دی
په هند ګرځی په هر مکان دی
غوښے هډونه د مظلومانو خوری
زما تر فهم واړه ددان دی

(ترجمہ:۔ یہ خان اور امراء جو ہندوستان میں پھرتے ہیں اور کوئی جگہ ان سے خالی نہیں،

میرے خیال میں تو یہ درندے ہیں جو مظلوموں کی ہڈی اور گوشت کھاتے ہیں)
اس کی اصلیت کا معیار بھی بتاتا ہے ؎

وخانی وته ورزغله هنر هیڅ نه
وعالم وته پیدا کړه دردِ سر
خانی کار د هر چانهٔ ده دهغهٔ ده
چه صرفه ئے نهٔ په زر وی نهٔ په سر

(ترجمہ :۔ بغیر کسی ھنر کے خان بن بیٹھو اور دنیا کیلئے دردسر بن جاؤ۔ خان بننا ہر کسی کا کام نہیں ۔ خان تو صرف وہ ہوسکتا ہے جو زر اور سر دونوں سے بے نیاز ہوجائے)
محنت اور راحت کے متعلق کہتا ہے ؎

چه جنګیالی دی دولت هغه موی
چه ننګیالی دی عزت هغه موی
دا دواړه توکه سره تړلی دی
څوک چه محنت کا راحت هغه موی

(ترجمہ :۔ جو جنگجو ہیں دولت ان کو ملتی ہے جو ننگ اور ناموس کی حفاظت کرتے ہیں عزت وہ پاتے ہیں ۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں کہ جو محنت کرتے ہیں وہی راحت پاتے ہیں ۔)
مطلوب تک پہنچنے کا رستہ یہ ہے ؎

تر مطلوبه پورے شرط درسید وی
که تمامه لار په وینو شی آلوده

(ترجمہ :۔ بات تو مطلوب تک پہنچنے کی ہے چاہے تمام راستہ خون آلود کیوں نہ ہو جائے)
شہرت کی خواہش کے متعلق یوں گویا ہے ؎

نکه چه شوی دی زماله دسته
شوی به نهٔ وی له ے پرسته

شهرت بلا دے سرے گمراہ کا
د دهٔ مستیٔ د ه تر هر څه مسته

(ترجمہ:- جو کچھ میرے ہاتھ سے ہوا ہے ویسا کچھ کسی مے پرست نے بھی نہیں کیا ہوگا۔ شہرت کی خواہش ایک بلا ہے جو انسان کو گمراہ کر دیتی ہے۔ اس کی مستی سب مستیوں سے بڑھکر ہے۔)

راستی کے متعلق اپنی رائے یوں دیتا ہے۔

راستی یار د ه بادشاهی
په کښې نشته گمراهي
د ښتینو پروا نشته
د جهان پر بد خواهي
د ښتینو سره مل وی
تل نصرت د الهی
د ښتینو ځائے جنت دے
د قرآن په گواهي
بیا به نهٔ موے خوشحاله
په راستیٔ کښې تباهي

(ترجمہ:- راستی بادشاہی کا رستہ ہے اس میں کوئی گمراہی نہیں ہے۔ راستباز دنیا کی بدخواہی کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ راست بازوں کے ساتھ نصرت الٰہی ہوتی ہے۔ قرآن پاک گواہ ہے کہ راست باز جنت میں جائیں گے۔ اے خوشحال! راستی میں کوئی تباہی نہیں ہے۔)

خوشحال خان خٹک پر لاہور کی خدیجہ فیروزالدین نامی جس خاتون نے پہلی دفعہ پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس نے اس کی کتابوں کی تعداد ۳۵۰ بتاتی ہے۔ میجر راورٹی نے یہ تعداد ۲۵۰ بتائی ہے۔ جبکہ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اب صرف سولہ کتابیں دستیاب ہیں پھر بارہ رہ گئیں۔(۱) دیوان

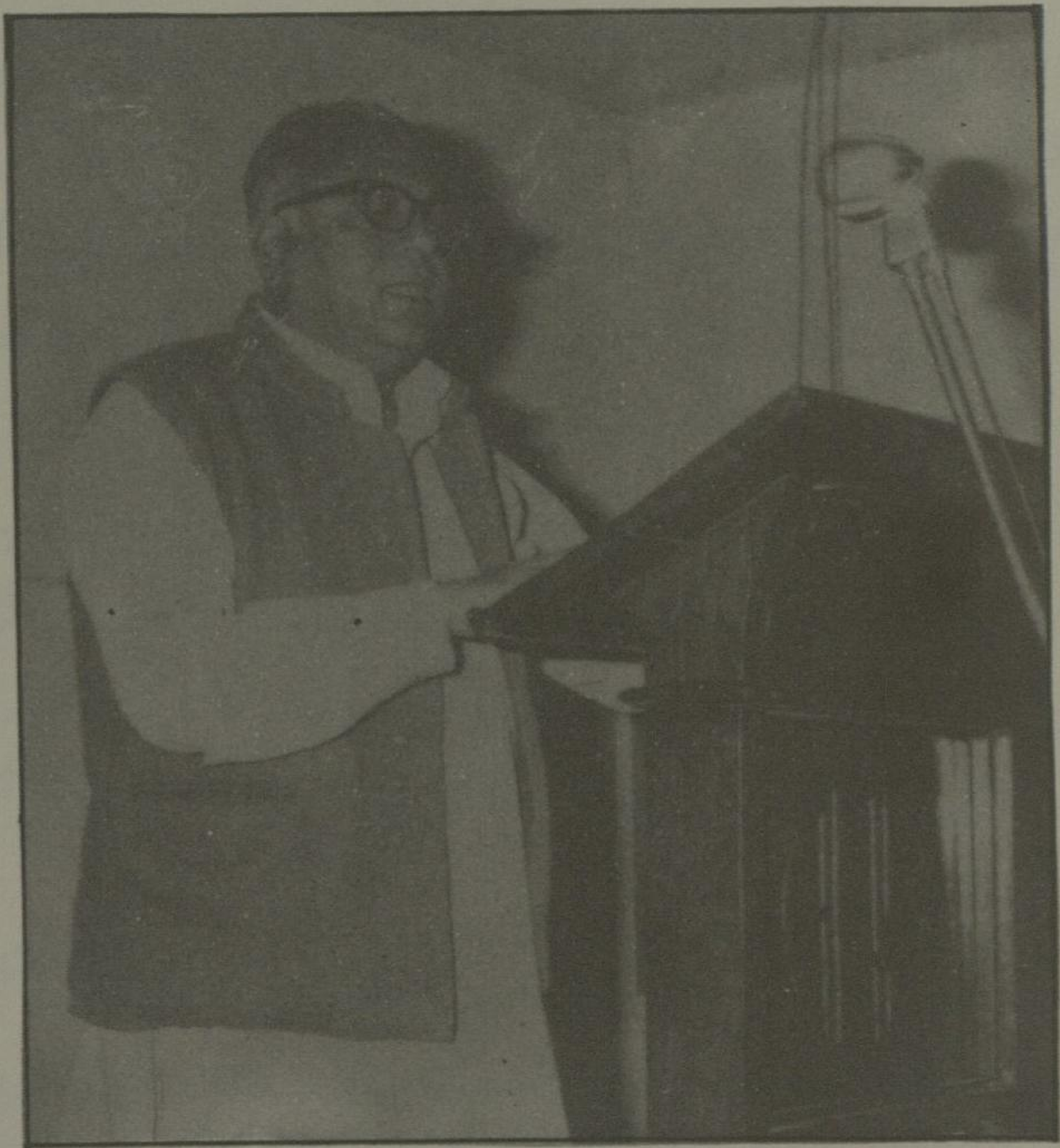
(۲) صحت البدن (۳) باز نامہ (۴) ھدایہ (۵) آئینہ (۶) فضل نامہ (۷) سوات نامہ (۸) فرخ نامہ (۹) دستار نامہ (۱۰) بیاض (۱۱) زنجیرٹی (۱۲) فراق نامہ۔

کتابیات کی تعداد جو بھی ہو ان میں بھی جیسے پنجاب یونیورسٹی کی پہلی پی۔ایچ۔ڈی کا ذکر کیا گیا۔ دوسری پی۔ایچ۔ڈی ڈاکٹر گل محمد نورزئی نے خوشحال خان پر ماسکو یونیورسٹی سے کی۔ اور دو سکالر فی الحال پشاور یونیورسٹی سے اس پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ اور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ابھی ایک درجن مزید لوگوں کیلئے خوشحال خان خٹک پر پی۔ایچ ڈی کرنے کی گنجائش ہے۔ مراد کہنے سے یہ ہے کہ اسے ایک مختصر مقالے میں متعارف کرنا کیسے ممکن ہے۔ جسکے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فطرت کی خوبصورتی کے بیان میں ھومر، رزم میں فردوسی، اخلاق میں سعدی، عشق و تصوف میں حافظ، فلسفہ میں خیام، عشرت میں بونواس اور فصاحت میں حضرت حسان کا تابع ہونے کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ ہے۔ اور پھر یہ کہ صرف فردوسی نہیں خود رستم بھی ہے اور سب سے بڑی بات کہ جو کہتا ہے وہی کرتا ہے اور جو کرتا ہے وہی کہتا ہے۔ وہ ایک ایسا آفاقی شاعر ہے جسکی نظیر دنیا میں بہت کم نظر میں آئی ہے۔ لیکن ابھی تک دنیا والوں نے خوشحال خان کو وہ مقام کیوں نہیں دیا جو اس کا حق ہے حالانکہ اسکا خیال تھا۔ ؎

دخوشحال قدر که اوس په هیچا نشته
پس له مرګه به ئے یاد کا ډیر عالمه

(ترجمہ:۔ خوشحال کی اب اگر کوئی قدر نہیں کرتا۔ موت کے بعد ایک عالم اسکو یاد کریگا) ایسا ہوا نہیں اس لئے میں نے اپنے شعر میں اُسے یوں مخاطب کیا ہے۔ ؎

قصور کیا ہے ترا جو کبھی معاف نہ ہو
زمانہ تجھ سے ہمیشہ نظر چراتا رہا
کسی نے سننا نہ چاہا کوئی سمجھ نہ سکا
میں تیس سال تری داستان سناتا رہا



محمد ایوب صابر (کوہاٹ)

ایوب صابر

خوشحال خان خٹک کا المیہ

شاہجہان کے عہد میں خوشحال خان خٹک مغلوں کا دست راست تھا اور سرحدی علاقے میں مغل سلطنت کا استحکام خوشحال خان خٹک کی ہی تلوار کا مرہون منت تھا۔ اس کی بیباک تلوار نے شاہجہان سے اپنی خدمات کے صلے میں "خانی" اور "باپ" کے خطابات بھی وصول کئے تھے۔ لیکن اورنگزیب عالمگیر نے تخت پر قبضہ جماتے ہی خوشحال خان خٹک سے تمام مراعات چھین لیں اور محض ایک بدظنی کی بنا پر اسے حراست میں لے لیا۔ اورنگ زیب کو اس کے بعض صوبیداروں نے جو خوشحال خان خٹک کو اپنے اقتدار کی راہ میں ایک روڑا تصور کرتے تھے۔ اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ خوشحال خان خٹک سرحدی علاقے کا خودمختار حکمران بننا چاہتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ خوشحال خان خٹک سے جب تک اورنگ زیب بدظن نہ ہوا تھا وہ مغلوں کی خیر خواہی کا دم بھرتا رہا۔ خوشحال خان خٹک کا اگر کوئی قصور تھا، تو صرف یہ کہ صاحب سیف و قلم اور صاحب عطا و سخا ہونے کی وجہ سے وہ سرحدی عوام کا منظور نظر تھا۔ اور پشتون عوام میں اس کی ہر دلعزیزی مغل سرداروں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔

خوشحال خان خٹک کو حراست میں لینے کے بعد جب اورنگ زیب نے اسے ہندوستان منتقل کر دینے کا حکم صادر فرمایا تو خوشحال خان خٹک نے اپنے سب سے بڑے بیٹے اشرف خان کو تلوار اٹھانے کا اشارہ کیا، لیکن اشرف خان کی رگ حمیت میں کچھ جوش نہ آیا اور مغل خوشحال خان خٹک کو کسی خون خرابے کے بغیر ہی ہندوستان لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

خوشحال خان خٹک کی گرفتاری نے سرحدی علاقے میں ایک نہایت ہی ناخوشگوار فضا پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ حالات کو معمول پر لانے کے لئے مغلوں نے اشرف خان کو

باپ کی جگہ سردار مقرر کیا۔ خوشحال خان خٹک کا خیال تھا کہ اس کے بیٹے اس کی گرفتاری کے بعد مغلوں سے ناطہ توڑ لیں گے اور مغلوں سے اس کی بے گناہی کا انتقام لیں گے۔ لیکن اس کی توقعات کے برعکس جب اشرف خان نے مغلوں کے منصب کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا۔ تو اس کے غیرتمند دل کو سخت ٹھیس پہنچی جس کا اظہار اس نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے کہ ع

"قیامت اگر ایسی نہیں ہوتی تو اور کیسی ہوتی ہے کہ بیٹا تو سرداری کرتا
ہے اور باپ قید خانے میں پڑا ہے۔"

کلیات خوشحال خان خٹک کی مدد سے خوشحال خان خٹک کی پوری تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ شاہ جہان نے اس کو جو عزت بخشی، اورنگ زیب نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا۔ پشتونوں نے اس سے جو بے اعتنائی برتی۔ اپنے بیٹوں نے اس کو جس طرح ذلیل وخوار کیا یہ ساری داستانیں اس کے افکار میں محفوظ ہیں۔ مگر میں اس مضمون میں صرف ان اشعار کے حوالے سے بات کو آگے بڑھاؤں گا۔ جو اس نے اپنی ناخلف اولاد کے بارے میں کہے ہیں۔ اشرف خان کو جب خوشحال خان خٹک نے تلوار اٹھانے کا اشارہ کیا تھا اور اس اشارے کو اشرف خان نے درخور اعتنا نہ سمجھا تھا تو خوشحال خان خٹک نے یہ اشعار کہے تھے کہ ع

ابراہیمؑ نے جب اسمٰعیلؑ کے لئے تیغ تیار کی تو اسماعیلؑ نے اس قربانی
سے انکار نہ کیا لیکن اس زمانے کے بیٹے، بیٹے نہیں ہیں۔ سانپ اور بچھو
ہیں بلکہ اُن سے بھی کچھ بدتر مخلوق پیدا ہو رہی ہے۔"

خوشحال خان خٹک کے بیٹوں اور پوتوں کی تعداد سو سے کچھ اوپر ہی تھی۔ جیسا کہ ایک شعر میں وہ خود ہی کہتے ہیں کہ ع

"اگر خوشحال خان کے گھر میں ایک سو بیٹے اور پوتے ہیں تو کس کام کے
جبکہ اُن میں سے ایک بھی خانی اور سرداری کے قابل نہیں ہے۔"

خوشحال خان خٹک پیا بتلا نہیں آئی تھی تو اس نے دعا مانگی تھی کہ۔

"اے خدا! تو نے مجھے بہت اولاد بخشی ہے۔ اب منت کرتا ہوں
کہ اُن کی خوبیوں کا شہرہ دُور دُور تک پہنچے۔"

مگر جب ایک بیٹا بھی اس کے معیار پر پورا نہ اُترا، تو اس نے اعتراف کیا کہ :-

"نوح علیہ السلام سے پیدا ہونے والے طوفان کی موجوں میں بہہ جاتے ہیں اور آذر سے پیدا ہونے والا آگ سے نجات حاصل کر لیتا ہے"

خوشحال خان خٹک کی یہ خواہش تھی کہ اگر سب نہیں، تو ایک بیٹا تو اس پر بھی جائے اور جب اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی، تو اس نے فریاد کی کہ :-

"جس کا نام دنیا کے نیک ناموں میں زندہ رہ جائے وہ بیٹا جہان میں لافانی ہوتا ہے۔ ایسے بیٹے کی صورت پر مت جاؤ۔ ایسے بیٹے کے تو اعمال اور کرتوت دیکھو وہ سفید شہتوت کس کام، جو بدمزہ ہو۔ ایسے توت سے کالا شہتوت اچھا، جس کا ذائقہ اچھا ہو۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ :-

"اکوڑ خان، یحییٰ خان اور شہباز خان سب شیر تھے۔ میں بھی گیدڑوں کی قطار میں نہیں ہوں۔ طالع مند اور قابل بیٹا اگر ایک بھی ہو تو باپ کے لئے کافی ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ گھر میں نکمے بیٹوں کا لشکر ہو۔"

چند اور شعروں میں خوشحال خان خٹک نے اپنی اس آرزو کا اظہار یوں کیا ہے۔

"خدا کسی کے گھر میں بھی بُرا فرزند نہ پیدا کرے کہ اس کی بری خصلت کے باعث باپ کو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں اور ماں ماتم کناں رہتی ہے۔ وہ شخص ایک لمحے کے لئے بھی عذاب سے محفوظ نہ ہوگا جس کے لئے اپنا بیٹا دوزخ بن جائے۔"

"نالائق بیٹا ماں کے پیٹ سے پیدا نہ ہو۔ اس سے بہتر ہے کہ اس کے بطن سے خنزیر پیدا ہو جائے۔"

"ایک لائق بیٹا ہزار بیٹوں سے اچھا ہے۔ اُن ڈھیر سارے بیٹوں کو کوئی کیا کریگا جن میں سے ایک بھی دلپذیر نہ ہو۔"

"یا تو اچھے باپ سے اچھا بیٹا پیدا ہو۔ یا باپ تنہا اور لاولد ہی رہے"

"کسی کے گھر ایسا فرزند پیدا نہ ہو جو باپ کے آنگن کا گڑھا بن جائے"

"باپ کے گھر میں آکر ایک لائق فرزند پیدا ہو جائے تو وہ اچھا

ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کے گھر میں سونے چاندی کا ڈھیر لگ جائے،
اور جس کو صرف ایک اچھے بیٹے کی تمنا تھی۔ وہ ایک سو بیٹیوں اور پوتوں میں بھی
بے اولاد ہی رہا، اور اس نے اپنا موازنہ شاہجہان سے کرتے ہوئے یہ فریاد کی کہ
"یہ میری اپنی اولاد کا حال تھا۔ جو میں نے بیان کر دیا۔ دوسروں کی
اولاد سے باخبر نہیں ہوں، اورنگ زیب بھی شاہجہان کا بیٹا ہے تمہیں
اس کے کاروبار کا علم ہوگا۔ مال اور اولاد دونوں دنیا میں فتنے ہیں
جو ہوشیار ہوگا وہ ان دونوں پہ تکیہ نہیں کرے گا۔ یا تو اس دور میں
دنیا کی خُو بدل گئی ہے۔ یا پھر دنیا ہبوطِ آدم ہی سے مکار ہے اے خوشحال
خدا کا شکر ادا کر کہ تم سے اپنے بابا کو تکلیف نہیں پہونچی تھی۔ اگر تمہارے ہاتھ
میں دنیا کی ساری دولت بھی ہوتی تو بڑے خلوص سے اپنے باپ پہ قربان
کر دیتے اب جو تم سے ایسے بیٹے پیدا ہوئے ہیں جو تم پر ایک دینار بھی نثار
نہیں کر سکتے تو تم خود ہی برے ہو تمہارے باقی بیٹوں کے بارے میں کچھ
نہیں کہہ سکتا۔ شاید ان میں کوئی اچھا بھی ہو مگر ان سب کو سردار نے بگاڑا ہے"
دراصل یہ خوشحال خان خٹک کی خوش فہمی تھی کہ اس کے بیٹوں میں کوئی اچھا بھی
ہوگا کیونکہ اشرف خان کے بعد جب بہرام خان نے سرداری سنبھالی اور اس کے تمام
دیگر بیٹے بھی باپ کی قید پہ خاموش رہے، تو خوشحال خان خٹک کو یقین ہوگیا کہ یہ خاکستر
چنگاریوں سے خالی ہے۔ تاہم اس کے باقی بیٹوں کا احوال بعد میں آئے گا۔
خوشحال خان خٹک نے پشاور، دہلی، آگرہ اور گوالیار میں چار سال قید اور نظربندی
میں گذارے اس کی اس طویل نظربندی کے دوران یوسفزئیوں کی شورشیں عروج کو پہنچ
گئی تھیں اور مغل صوبیدار امیر خان خوافی اشرف خان کے تعاون کے باوجود یوسفزئیوں
کو قابو میں نہیں رکھ سکا تھا۔ لہٰذا شہنشاہ اورنگ زیب نے خوشحال خان خٹک کے
مشورے پہ مہابت خان کو سرحدی علاقے کا صوبہ دار مقرر کر کے باغیوں کی سرکوبی
کے لئے روانہ کیا۔ اب شہنشاہ کو خوشحال خان خٹک کی بیگناہی کا بھی یقین ہو گیا تھا
اس لئے مہابت خان کے ساتھ خوشحال خان خٹک کو بھی وطن جانے کی اجازت مل گئی۔
لیکن اورنگ زیب کا یہ اقدام بعد از وقت تھا۔ خوشحال خان خٹک کے دل میں مغلوں

کے لئے قدر و منزلت کے جو جذبات تھے ان کی جگہ نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک چکی تھی، چنانچہ جب وہ سرحد پہونچا تو اس نے مغلوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ابتدا میں اس نے نہایت خاموشی سے پشتونوں کو مغلوں کے خلاف بھڑکانے پر ہی اکتفا کیا۔ خٹک قوم تو اس کے ساتھ تھی ہی رفتہ رفتہ وہ آفریدیوں مومندوں اور شنواریوں کو اپنے ساتھ ملانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

مہابت خان نے جب شہنشاہ کے حکم کے مطابق یوسف زئیوں کو مرعوب کرنے کی خاطر لنگر کوٹ میں ایک قلعہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو خوشحال خان خٹک نے اس کی مخالفت کی اور یوسفزئیوں کی حمایت کرتے ہوئے اس نے بغاوت کا کھلم کھلا اعلان کر دیا۔ مغلوں نے بہت کوشش کی کہ خوشحال خان خٹک دوبارہ کوئی منصب قبول کر لے اور پشتونوں کی بغاوت فرو کرنے میں ان کا ہاتھ بٹائے، لیکن خوشحال خان خٹک ایک بار افغان بن کر دوبارہ مغل نہیں بننا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ لاچی (کوہاٹ) چلا گیا اور وہاں اس نے مغلوں کے خلاف منظم طور پر مہم شروع کر دی۔ خوشحال خان کے بڑے بیٹے اشرف خان نے باپ کے خلاف مہابت خان کا ساتھ دیا۔ خوشحال خان خٹک جہاں بھی جاتا، اشرف خان سائے کی طرح اس کے تعاقب میں لگا رہتا اور اسے اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہونے دیتا۔ اشرف خان کے علاوہ خوشحال خان کے دیگر با اثر بیٹے بھی مغلوں کے زرخرید غلام تھے۔ اور اقتدار کے لالچ میں خانہ جنگیوں میں مصروف تھے۔ اپنے بیٹوں کی ناعاقبت اندیشی اور خاص طور پر اشرف خان کی مغل نوازی سے متاثر ہو کر خوشحال خان خٹک نے اپنی ایک طویل نظم میں دل کے پھپھولے یوں پھوڑے ہیں۔

"ایک بیٹے سے بھی میرا دل خوش نہیں ہے۔ تمام نکمے ہیں۔ میں اورنگزیب کا دشمن ہوں اور پہاڑوں اور بیابانوں کی خاک چھان رہا ہوں۔ میں پشتونوں کا محافظ ہوں اور یہ مغلوں کے نمک خوار ہیں۔ یہ مغلوں کے ٹکڑوں پر کتوں کی طرح حملے کرتے ہیں۔ اور اپنے منصبوں میں اضافے کی خاطر ہمیشہ میرے تعاقب میں رہتے ہیں میرا ہاتھ ان کے گریبانوں تک پہنچ تو سکتا ہے۔ لیکن میں اپنے آپ کو ہلاک نہیں کر سکتا۔ اتنی ذلت کے باوجود یہ اپنے آپ کو گناہگار نہیں سمجھتے جو ان کے باپ کا دشمن ہو،

وہی ان کا دوست ہوتا ہے۔ ان سب میں سے جو بڑا ہے اسے اشرف خان کہتے ہیں یہ نہ تو باپ پر گیا ہے اور نہ دادا پر۔ یہ ناقص انسان کسی اور ہی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھ میں اور میرے اجداد میں جو خوبیاں تھیں ان میں سے ایک بھی اس میں نہیں پائی جاتی۔ اور اس بات پہ دنیا حیران ہے اگر میں اسے گلستان کی طرف بلاتا ہوں، تو یہ گلستان کو بھی آگ سمجھتا ہے۔ یہ پھولوں کی کیاریوں میں اپنے لئے خار بو رہا ہے۔ میں نے اس کے سامنے اگر حکمت کی تمام کتابیں بھی پڑھ ڈالیں۔ تو اس پر کچھ اثر نہ ہوا بہروں کے آگے اگر سرود چھیڑ دیا جائے۔ تو وہ کیا سنیں گے۔ اندھوں کے آگے اگر آئینہ رکھ دیا جائے تو وہ اس میں کیا دیکھیں گے کافروں کے آگے اگر قرآن کی تلاوت بھی کی جائے تو وہ منکر ہی رہیں گے۔ اچھے اوصاف اس میں بہت کم ہیں۔ اور برے بہت زیادہ ہیں۔ حرص میں اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ لیکن مردانگی کے کاروبار میں عورتوں سے بدتر ہے۔ اس کی عمر چالیس برس سے تجاوز کر چکی ہے۔ لیکن ابھی تک شجاعت کا کوئی کارنامہ نہیں انجام دیا۔ جہاں بھی جنگ چھڑ جائے تو اس کی قسمت میں ہزیمت ہی ہوتی ہے۔ مرصع تلوار کمر سے بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ اچھے گھوڑے میسر ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی معرکہ سر نہیں کر سکا۔ دنیا کا حساب ہمیشہ بنیوں کی طرح کرتا ہے، ہمیشہ دولت جمع کرنے کی فکر میں غرق رہتا ہے۔ خود بھی شوم، منحوس اور سفلہ ہے اور اس کے ہمنشین بھی۔ مرد کے لئے اس کے پاس کوئی جگہ نہیں۔ نامرد ہر وقت اس کے گرد جمع رہتے ہیں بڑائی کے کاموں کا کچھ علم نہیں، لیکن اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرتا ہے۔ کھری باتیں اس کے لئے آگ ہیں اور جھوٹی خوشامد پھول۔ کاش یہ میرا بیٹا نہ ہوتا۔ یا میں دنیا میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ اس بدبخت نے میرے تمام کئے دھرے پر پانی پھیر دیا ہے۔ ابھی مغلوں اور پشتونوں کی کش مکش کا ہنگامہ بیچ میں پڑا ہوا ہے۔ میں ہمیشہ اس غم میں ڈوبا رہتا ہوں کہ اس ہنگامے کو سر کرنے کا کچھ سرو سامان ہو اور یہ وہمی مجھ سے بلا وجہ ہراساں رہتا ہے۔ اپنی بداعمالیوں کا خوف اسے دامنگیر رہتا ہے میرے گرد فوج اکٹھی دیکھتا ہے تو اس پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ میرے لشکر کا شور اٹھتا ہے تو اس کی جان گھلنے لگتی ہے، یہ احمق دو باتوں سے بہت خوش ہوتا ہے ایک تو یہ کہ میرا کوئی مددگار نہ ہو۔ اور دوسری یہ کہ میری دیگیں ٹھنڈی ہوں۔

میرا بیٹا ہے لیکن میرے خویشں و اقارب کو میری مخالفت پر اکساتا ہے۔ اور پھر مغلوں کو خوشخبری سناتا ہے کہ میں نے تمہارے لئے اپنے باپ کی یہ درگت بنائی ہے۔ میرے غم کے بارے میں سنتا ہے تو اسے بے حساب خوشی حاصل ہوتی ہے۔ میرے ساتھ برائی کرتا ہے تو مغل اس کیلئے اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ مغلوں کی طاقت استعمال کرکے اس نے میرے تمام مقبوضات پر تسلط جما لیا ہے اس نے ٹیری (کوہاٹ) میں بھی بہت سے کتے میرے تعاقب میں لگا دیئے ہیں۔ خدا جانے یہ آسمان کی کون سی آفت ہے، جس نے میرے گھر میں جنم لیا ہے۔ آج روئے زمین پر اتنا پریشان اور کوئی نہ ہوگا جتنا کہ میں ہوں۔ اگر بیٹھا رہوں تو عزت و ناموس کو خطرہ درپیش ہے، اٹھوں تو طوفان اٹھتا ہے۔ میں نے اپنی تمام عمر اسی کشمکش میں گذاری ہے صرف ایک آدمی کے باعث ایک عالم خراب ہو رہا ہے افسوس ہے اے افغان! کہ فتح و نصرت کی گھڑی گذر رہی ہے"

اشرف خان نے نہ صرف خود باپ پر عرصۂ حیات تنگ کیا بلکہ اپنے پورے گھرانے کو اس کے خلاف اپنے ساتھ ملا لیا ایک نظم میں خوشحال خان خٹک نے اپنے گھر میں پھیلے ہوئے نفاق کو یوں بے نقاب کیا ہے۔

"اقربا میرے لئے بچھو بن گئے ہیں، مجھے دکھ پہنچانے کے لئے انہوں نے آپس میں سمجھوتہ کرلیا ہے۔ میرے دونوں نا اہل چچا بوجہل و بولہب بن گئے ہیں سب نے مل کر مجھے مغلوں کا قیدی بنا لیا ہے اور خود خانی اور سرداری کے لئے مرے جا رہے ہیں۔ انہوں نے رشوتیں قبول کرلی ہیں۔ اور منصب و روزانہ اُن کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اللہ کرے کہ میرے بڑے بیٹے پھل پھول نہ سکیں کہ وہ سب میرے لئے مصیبتوں کا باعث بن گئے ہیں مجھے انہوں نے ہندوستان کی طرف پابہ جولاں روانہ کر دیا ہے اور خود عیش و نشاط میں مصروف ہو گئے ہیں میرے خیر خواہ پہاڑوں میں پناہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں ان پر طرح طرح کی افتادیں پڑ رہی ہیں جنہوں نے دھوپ تک نہ دیکھی تھی، وہ جنگلوں میں تشنہ لب پھر رہے ہیں سارے عوام اور پورا قبیلہ غیض و غضب کا شکار ہے۔ فراق کے مارے ہوؤں کی آہ و زاری سے دل انگور کے خوشے بن گئے ہیں۔ خٹکوں نے ہر

چند خوشحال خان خٹک کو ڈھونڈا، مگر اس کو نہ پا سکے۔"

اشرف خان نے مغلوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے باغیوں کی سرکوبی کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن وہ حالات پر قابو پانے میں ناکام رہا۔ مہابت خان اس کی کارگزاریوں سے مطمئن نہیں تھا۔ اس لئے اس نے خوشحال خان کے تیسرے بیٹے بہرام خان سے گٹھ جوڑ شروع کر دیا۔

بہرام خان سرداری کا متمنی ہونے کے باعث اپنے بڑے بھائی اور باپ دونوں کا حریف تھا۔ اسلئے اس نے مہابت خان کو یقین دلایا کہ وہ اپنے باپ اور بھائی دونوں کو گرفتار کر کے اس کے سامنے حاضر کر دیگا۔ اور پشتونوں کی شورش مٹانے میں سخت سے سخت اقدام کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ اس یقین دہانی کے بعد مہابت نے سرداری کا منصب بہرام خان کو سونپ دیا اور بہرام خان نے اس بے حیائی سے اپنے باپ کے خلاف تلوار اٹھائی کہ باپ کی زخمی روح چلا اٹھی کہ

"صد لعنت ہے اس بطن پر جس سے بہرام جیسے سپوت پیدا ہوئے۔"

اس کے علاوہ اس نے یہ بھی کہا کہ

"یہ اچھا ہے کہ ایک حاملہ کے بطن سے سانپ پیدا ہو جائے۔ نہ یہ کہ کوئی ناہموار بیٹا پیدا ہو۔"

اگر صرف مغل ہی خوشحال خان خٹک کے حریف ہوتے، تو شاید وہ اُن کا قلع قمع کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا۔ لیکن بہرام خان نے مغلوں کی پشت پناہی کر کے مغل اقتدار کو خوشحال خان خٹک کے لئے ناقابل تسخیر بنا دیا۔ بہرام خان کی غداری کی ضرب مغلوں کی تلواروں سے زیادہ کاری تھی۔ خوشحال خان خٹک غیروں سے کیا شکایت کرتا جبکہ اپنے بیٹے ہی اس کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھے

"میں غیروں سے کیا شکایت کروں جبکہ اپنے ہی مجھے نیست و نابود کرنے میں مصروف ہیں ناخلف اولاد کسی کی بھی بڑی نہ ہو۔ کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ قسم قسم کے فساد کرتی ہے۔"

بیٹے باپ کے بازو ہوتے ہیں۔ ایک پشتون باپ کے جتنے زیادہ بیٹے ہوں۔ اس

کے دشمن اس سے اُتنا ہی زیادہ خوف کھاتے ہیں لیکن بعض بیٹے ناخلف اور بعض باپ بدنصیب بھی ہوتے ہیں۔ خوشحال خان خٹک بھی ایک بدنصیب باپ تھا اس کے بیٹوں اور پوتوں کی تعداد سو سے اوپر تھی۔ اس کے باوجود وہ بے اولاد ہی رہا اگر اس کے بیٹوں میں وہ تمام صفات موجود ہوتیں جو ان کے آباؤ اجداد میں تھیں۔ اور وہ مغلوں کے درہموں کو ٹھکرا کر حب الوطنی کا ثبوت دیتے تو خوشحال خان خٹک کی فتح کے ڈنکے بج جاتے۔

"اگر یہ اتنے ناخلف بیٹے فرمان بردار ہوتے تو میں آج فتح کے ڈنکے بجاتا"

لیکن بدقسمتی سے اس کے سب بیٹے ناخلف تھے ان میں سے ایک بھی اس کی امیدوں کے مطابق نہ تھا اور وہ سب سے نالاں تھا۔

"یا اپنی اولاد سے شاہجہان نالاں تھا یا پھر خوشحال فریاد کر رہا ہے۔ میری داڑھی سیاہ تھی، تو میں اس حقیقت سے بے خبر تھا۔ اب جبکہ سفید ہو گئی ہے تو اب معلوم ہوا کہ اگر سمندر کا صدف سچا نہ ہو۔ تو اس سے اچھا گوہر نہیں نکلتا"

خوشحال خان خٹک کے آباؤ اجداد نے بڑی شاندار زندگی گذاری تھی وہ خود بھی ایک باحمیت سردار تھا مگر جب اس کے بیٹوں کی باری آئی، تو انہوں نے خاندانی وجاہت کو خاک میں ملا دیا۔

"اکوڑ خان، یحییٰ خان اور شہباز خان سب سونا تھے۔ ان سب نے اپنے ادوار بڑی شان سے گذارے۔ اب جبکہ بہرام خان کی باری آئی ہے تو خود دیکھ لو کہ اس نے ان نامداروں کی مٹی کس طرح پلید کر دی ہے"

خوشحال خان خٹک نے اپنے بیٹوں کی نافرمانی کے بارے میں جو نظمیں اور اشعار لکھے ہیں اگر ان سب کو یکجا کر دیا جائے تو ایک پورا دیوان مرتب ہو سکتا ہے۔ میں اس مضمون میں اُن کے چیدہ چیدہ اشعار ہی نقل کر رہا ہوں: تاکہ بات مضمون سے کتاب تک نہ پھیلنے پائے: تاہم ان کی بعض نظمیں ایسی ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ایسی

ہی نظموں میں اُن کی یہ طویل نظم بھی شامل ہے۔

"میں نے اپنے بیٹوں کی کارگذاریاں دیکھ لی ہیں۔ بیٹے باپ کے جگر کا خون ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے ہی وہ باپ کے لئے باعث وبال بن جاتے ہیں اور باپ اُن کی خدمت اور تربیت میں مصروف ہو جاتا ہے وہ تندرست و توانا ہوں تو باپ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ لیکن اُن کی ذرہ برابر تکلیف بھی باپ کو ملول کر دیتی ہے۔ جب تک انکی مسیں نہ بھیگی ہوں۔ اس وقت تک وہ پھول ہوتے ہیں لیکن چہرے پر بال نمودار ہوتے ہی وہ خار بن جاتے ہیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوتے ہیں تو اتنے بددماغ ہو جاتے ہیں۔ کہ جوانی کے گھمنڈ میں راستے پر انکساری سے چل بھی نہیں سکتے۔ اس میں ان کے دلوں میں پراگندہ خیالات گھر کر لیتے ہیں جو ان کو دن رات بیقرار رکھتے ہیں دنیا والوں کی تمام نصیحتیں اُن کو بیکار نظر آتی ہیں اور صرف وہی کرتے ہیں۔ جو اُن کا دل کہتا ہے خود آرائی کے سمندر میں اس بُری طرح سے غرق ہو جاتے ہیں کہ پھر وہ کنارے نہیں لگنے پاتے جب وہ فکر و شعور کے مالک بنتے ہیں تو اپنے کارناموں کا آغاز کر دیتے ہیں کوئی بہرام جیسا بدبخت، منحوس اور بخیل ہو جاتا ہے جس کی شامت اعمال سے سارے خاندان بکھر جاتا ہے۔ اور جو اتنا منافق، مردود اور لئیم ہوتا ہے کہ اپنے باپ کے خلاف مصروف پیکار ہو جاتا ہے۔ کوئی یحییٰ جیسا غافل ہوتا ہے جس سے دنیا کا کوئی کام استوار نہیں ہوتا۔ کوئی مرد کی طرح نامرد اور زن مرید بن جاتا ہے۔ جو تنگدستی میں اپنے بھائی کے بھی کام نہیں آتا۔ کوئی مالو اور جلو جیسے ہوتے ہیں سراسر بیکار اور نکمے۔ میرے جتنے بیٹے پیدا ہوئے ہیں اس دنیا میں اور کسی کے نہ پیدا ہوئے ہوں گے۔ اگر میں ان سب کی کارگزاریوں پر روشنی ڈالوں تو درماندہ و نڈھال ہو جاؤں۔ ایک بیٹا بھی میری طبیعت کے موافق نہیں ہے سب خودغرض اور مطلب پرست ہیں۔ اورنگزیب بھی شاہجہان کا بیٹا ہے لیکن اس کی کارگذاریوں سے دنیا واقف ہے مال اور اولاد دنیا

میں فتنے ہیں. عقل مند آدمی ان دونوں سے اپنی امیدیں وابستہ نہیں کرتے"

خوشحال خان خٹک نے اپنے کئی اشعار میں بہرام خان کا مذاق اڑایا ہے اور اس کی جرأت پر تمسخر آمیز حیرت کا اظہار کیا ہے. مثال کے طور پر اُن کی اس نظم کو لے لیجیے۔

زمانے کی کج نہمیاں مجھ پر اب ہوگئیں آشکار
میں دنیا کی کج نہموں سے اماں مانگتا ہوں
جو دیکھو تو یہ بھی تعجب کی جا ہے.
کہ زاغ و زغن بھی جھپٹتے ہیں شاہیں کے اوپر
جو دیکھو تو یہ بھی تعجب کی جا ہے
کہ مغلوں نے افغاں سے بازی لگانے کی ٹھانی ہوئی ہے
جو دیکھو تو یہ بھی تعجب کی جا ہے
کہ گیدڑ شکم سیر ہیں شیر بھوکے
جو دیکھو تو یہ بھی تعجب کی جا ہے
کہ بہرام لشکر کشی کر رہا ہے
اولوالعزم خوشحال خاں پر

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہرام خان نے خوشحال خان خٹک کے پاؤں کہیں نہ جمنے دیئے اور اس کو ہمیشہ گھوڑے کی پیٹھ پر سرگرداں رکھا.

خوشحال خان خٹک بے شمار خوبیوں کا مالک تھا اس کی غیرت مندی شمشیر زنی، اولوالعزمی اور دریا دلی کے چرچے عام تھے. لیکن ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس میں عیب بھی تھا ایک ایسا عیب جو اس کی سو خوبیوں پر بھاری تھا۔ اور جو بالآخر اس کے زوال کا باعث بھی بنا۔

"میرا یہ ایک عیب میری سو خوبیوں پہ بھاری ہے کہ بہرام میرا بیٹا ہے اور میں اس کا باپ ہوں"

بہرام خان کا وجود خوشحال خان خٹک کے دامن پر ایک بدنما داغ تھا۔ خوشحال خان جب یہ سوچتا کہ وہ ایک قوم فروش بیٹے کا باپ ہے۔ تو وہ اپنی ذات سے بھی متنفر ہو جاتا چنانچہ ذیل کے اشعار میں اس نے اپنی ذات سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔

"اچھا فرزند باپ کے گھر کی روشنی ہوتا ہے اور برا فرزند ظلمت ہوتا ہے
جب ایسے کتے اس سے پیدا ہوئے ہیں تو مجھے ننگ گزرتا ہے کہ خوشحال
کب انسان ہے"

مغلوں نے تو بہرام خان کو سردار بنا دیا تھا لیکن خوشحال خان اور اس کے مٹھی بھر باغی رفقول نے اس کی سرداری کو تسلیم نہ کیا اور وہ اس سے معرکہ آرائیوں میں مصروف رہے۔ ۱۰۹۲ھ میں مغلوں نے اشرف خان کو گرفتار کر کے ہندوستان بھیج دیا۔ اس گرفتاری سے جو صورت حالات پیدا ہوئی، اس کے پیش نظر خوشحال خان خٹک نے بہرام خان کو زیارت کاکا صاحب کے مقام پر جرگہ کے لئے بلایا۔ چونکہ بہرام خان کی مخالفانہ سرگرمیاں بہت تیز ہو گئی تھیں اور اس نے مغلوں کے درہموں سے پشتونوں کے بہت سے قبیلوں کو خرید لیا تھا، اس لئے خوشحال خان خٹک نے مجبور ہو کر بہرام کی سرداری کو اس شرط پر قبول کر لیا کہ وہ اشرف خان کو مغلوں کی قید سے رہائی دلائے گا۔ بہرام خان نے حسب دستور منافقت سے کام لیتے ہوئے اس شرط کو ظاہراً منظور کر لیا اور اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے باپ سے معافی بھی مانگ لی۔ لیکن عملاً اشرف خان کی رہائی کی کوئی کوشش نہ کی۔ چنانچہ خوشحال خان خٹک نے دل برداشتہ ہو کر یہ نظم لکھی۔

"جو بیٹا باپ کی مخالفت کرے۔ جھوٹا اور نفاق پھیلانے والا ہو، وہ کسی اور کے لئے اپنے دل کو کیسے صاف رکھ سکتا ہے۔ نہ جانے پھر کونسے جھوٹ اور نفاق کے منصوبے اس کے دل میں ہیں کہ منافق اپنے گناہ کا اعتراف کر رہا ہے۔ لیکن نہ میں اس منافق کو معاف کروں گا نہ خدا عزازیل کے گناہ معاف کریگا۔"

یہ ارد گرد کے پہاڑ کچھ بھی نہیں ہیں میں تو تب خوش ہوں گا جب خدا میرے اور میرے بیٹوں کے درمیان کوہ قاف حائل کر دے گا۔ کوئی اور میرے سامنے عاق بیٹے کا احوال کیوں بیان کرے جب کہ باپ کو بیٹے کا احوال خود معلوم ہوتا ہے۔

نہ کوئی جھوٹا اس جیسا جھوٹ بولے گا نہ کوئی مکار اس جیسا مکر کرے گا

اس کے دل میں ہزار رنگ کے جھوٹ اور منہ پر ہزار رنگ کے سچ اور لافیں ہوتی ہیں کاش کہ میں زندگی میں پھر اس کا منہ نہ دیکھوں موت کے بعد اگر وہ میری قبر کا طواف کرے بھی تو کیا۔"

دراصل بہرام خان، اشرف خان کو اپنا سیاسی حریف سمجھتا تھا اور وہ اسے رہائی دلا کر اپنی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خوشحال خان خٹک کا خیال تھا کہ خانی اور سرداری مل جانے سے بہرام خان کے رویے میں تبدیلی آجائے گی اور وہ اپنی ذلیل حرکتوں سے باز آجائے گا لیکن بہرام خان نے اس کامیابی کو کافی نہ سمجھا۔ اور اس نے اپنے بھائی اور باپ سے مستقل طور پر پیچھا چھڑانے کے لئے اور زیادہ بے حیائی اور تشدد سے کام لینا شروع کر دیا۔ تب خوشحال خان خٹک کے دل سے یہ بد دعا نکلی کہ

"اے بہرام! تمہیں سرداری کا ہنر نہیں آتا تم نے اپنے دور میں سرداری کو بدنام کر دیا ہے۔ تم نہ صرف اپنے گھرانے کے لئے بلکہ اپنے لئے بھی بلا بن گئے ہو۔ تم نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے اپنے بھائی طاہر خان کو مروا دیا ہے اور اس کے انتقام سے اپنے آپ کو فارغ سمجھنے لگے ہو۔ تم نے اپنے لئے بھی موت کا رخنہ پیدا کر دیا ہے اور اپنی بری خو کی وجہ سے اپنے خاندان کو بے آرام کر دیا ہے۔ اس تمام بدخوئی کے بعد بھی اگر تم خونخوار ہاتھی کے جبڑوں میں نہیں پھنسے ہو تو یقیناً بخت والے ہو بڑے بھائی کو قید کروا کے تم خان بن گئے ہو اللہ کرے کہ یہ خانی تم پر حرام ہو جائے۔"

اگرچہ خوشحال خان کے دیگر بیٹے بھی نااہل، نافرمان اور ناعاقبت اندیش تھے لیکن اس کو باقی تمام بیٹوں کی نااہلی اور ناعاقبت اندیشی نے مجموعی طور پر بھی اتنا صدمہ نہیں پہنچایا تھا، جتنا کہ اکیلے بہرام خان کی غداری اور قوم فروشی نے پہنچایا تھا بہرام خان کی غداری نے پشتونوں کو نفاق کا ایندھن بنا دیا۔ اور مغل سلطنت کے پشتے مضبوط کر دیئے۔ خوشحال خان خٹک کی زندگی کے آخری دو سالوں میں تو بہرام خان کی غداری انتہا کو پہنچ گئی اور اس نے اپنے بیٹے مکرم خان کو ایک مسلح لشکر کے ساتھ خوشحال خان خٹک کی سرکوبی اور گرفتاری کے لئے بھیجا اور جب مکرم خان

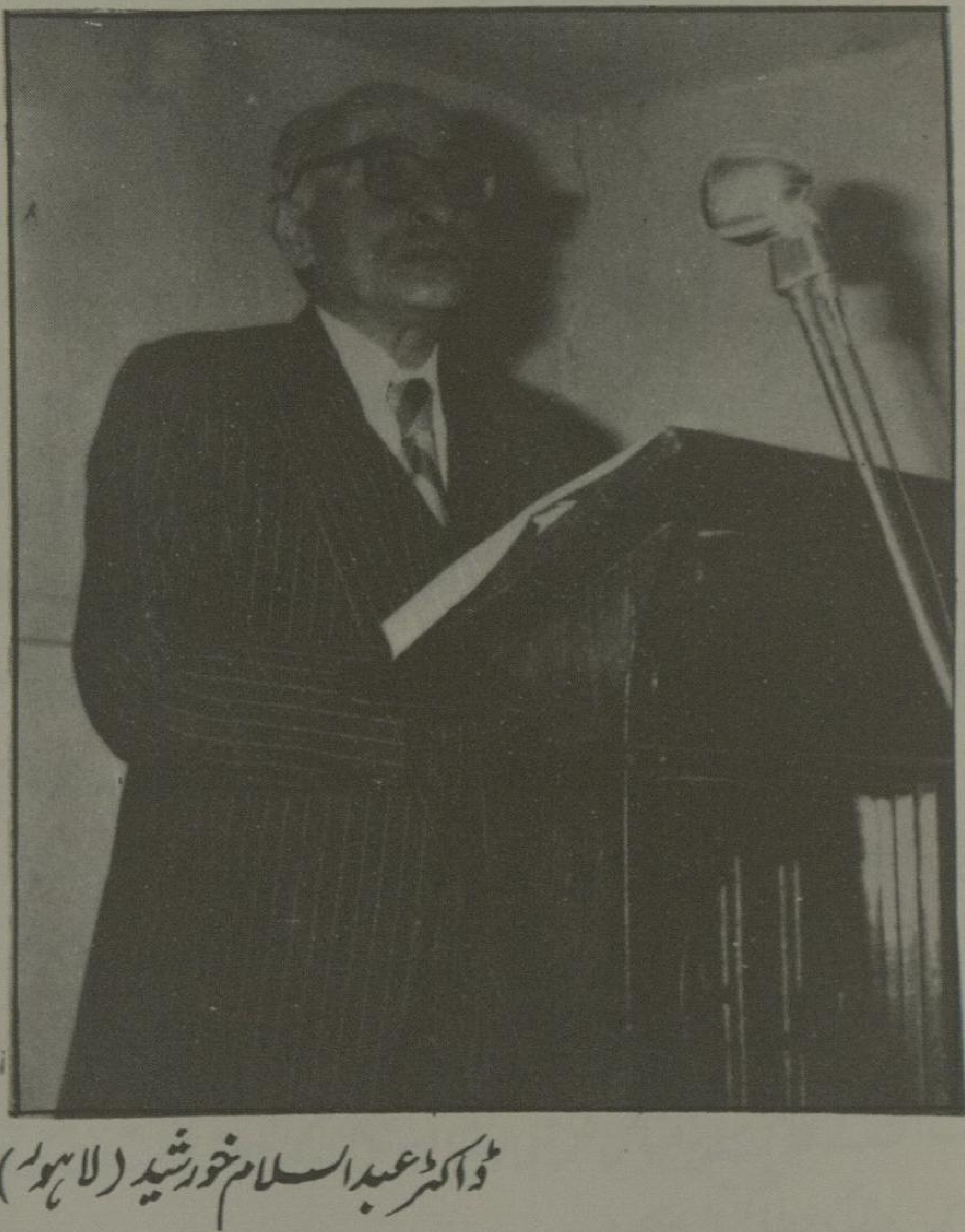
نے اپنے دادا خوشحال خان خٹک کو نرغے میں لے لیا تو اس وقت خوشحال خان خٹک کو صرف مٹھی بھر جانثاروں کی رفاقت حاصل تھی ۔تاہم ضعیف العمر خوشحال خان خٹک اور اس کے مٹھی بھر رفیقوں نے مکرم خان کا مقابلہ ڈٹ کر کیا اور اس کے نرغے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ خوشحال خان نے مکرم خان کے نرغے سے نکل کر آفریدیوں کے علاقے میں پناہ لی۔ اور وہیں ۷۸ سال کی عمر میں وفات بھی پائی۔

خوشحال خان خٹک مغلوں سے انتقام لینے سے پہلے نہیں مرنا چاہتا تھا اسے عمر بھر یہی حسرت رہی کہ وہ اپنی تلوار مغلوں کے خون سے رنگ سکے۔ اور مغلوں کے اقتدار کو ختم کر کے اپنے خاندان کے ساتھ فراغت کی زندگی بسر کر سکے لیکن اس کے ناخلف بیٹوں اور پشتونوں کی بے حسی اور نفاق نے اس کی یہ حسرت پوری نہ ہونے دی۔ اور وہ دل پر داغ ناکامی لئے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوا۔

خوشحال خان خٹک ایشیا کا ایک عظیم ترین باغی تھا جس نے دنیاوی عظمت کو ٹھکرا کر آزادی کا علم بلند کیا۔ جب تک روئے زمین پر ایک بھی حریت پسند باقی ہے۔ صوبہ سرحد کے اس بطلِ جلیل کا نام اس وقت تک صفحۂ ہستی سے مٹ نہیں سکتا۔ اس کے باغیانہ اشعار کی بازگشت رہتی دنیا تک ارباب فکر و نظر کے کانوں میں گونجتی رہے گی۔

"آزادی کا مقام بادشاہی سے بلند ہے
جب انسان کسی کا محکوم ہوتا ہے۔ تو
وہ قیدی ہوتا ہے۔"

نصب العین



ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (لاہور)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

پاکستان کا قومی شاعر

یہ درست ہے کہ خوشحال خان خٹک پشتو زبان کے شاعر اور مفکر تھے، اور اس سے بھی انکار نہیں کہ انہوں نے اپنے رزمیہ اور دوسرے کلام سے پٹھانوں کے دلوں کو تڑپایا اور برمایا اور انہیں مسلسل ایک نئی زندگی سے آشنا کرنے کی سعی فرماتے رہے، لیکن اگر اُن کے کلام کا ذرا زیادہ غور سے تجزیہ کیا جائے، تو اس نتیجے پر پہنچنا چنداں مشکل نہیں، کہ وہ گنگ جمن کی وادی کو ناپسند کرتے تھے اور وادیٔ سندھ سے پیار کرتے تھے۔ اور وادی سندھ میں صرف پشتو بولنے والے لوگ آباد نہیں تھے اس میں دوسری زبانیں اور بولیاں لانے والے لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد آباد تھی وہ اس زمانے میں شاعری اور سیاست کے میدان میں ابھرے، جب نہ افغانستان موجود تھا، نہ پاکستان میرا مطلب یہ ہے کہ یہ جغرافیائی اصطلاحات منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔ ایسے میں وہ جب کسی وطنی اکائی یا وحدت کے بارے میں سوچتے، تو قدرتی طور پر سب سے پہلے اپنے مولد اکوڑہ خٹک کا ذکر کرتے۔ ذرا وسیع تر تناظر میں سوچتے تو ملتِ افاغنہ اور دوسرے لفظوں میں پختون قوم کو بیداری کا پیغام دیتے اور جب وسیع ترین تناظر میں سوچتے، تو کابل سے پنجاب تک کے خطے کو ایک وحدت کی حیثیت سے تصوّر میں لاتے اور ہندوستان سے اُسے بالکل الگ بلکہ صف آراء قرار دیتے۔ اسی طرح جیسے چودھری رحمت علی اس خطے کو جغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے ہندوستان سے مختلف بیان کرتے تھے، میرے نزدیک اُن کے کلام سے یہ اقتباس خوشحال خان خٹک کو خطۂ پاکستان کے قومی شاعروں میں ایک مقام عطا کرتا ہے۔

"وہ ہوا جو کابل کی طرف سے آتی ہے، وہ میرے لئے عنبر بیز ہے جب کوئی کابل کا ذکر کرتا ہے تو میرے دل میں گدگدی سی پیدا ہو جاتی ہے جب پشاور کا ذکر آتا ہے تو میرا دل منور ہو جاتا ہے اور پھر جب کوئی اٹک کو یاد

کرتا ہے تو میں خٹک کا قافیہ باندھتا ہوں جب کہیں کسی سرائے کا ذکر ہوتا ہے تو مجھے سرائے اکوڑہ کی یاد ستانے لگتی ہے جب کوئی لاہور کی بات کرتا ہے تو اس سے میرے دل میں قوت پیدا ہوتی ہے کابل سے لیکر پنجاب تک کے آدمی ہوں یا کتّے،

جب اُن میں سے کسی کو دیکھتا ہوں تو میرے دل میں خوشی پیدا ہوتی ہے اور اس سے اپنے ملک اور اپنی قوم کی ایک ایک بات پوچھتا ہوں۔

[خوشحال و اقبال۔ ص ۴۲۔ ۳۴]

جس خطے کا اس نے ذکر کیا اس کے اجزائے ترکیبی میں زبان نہیں' اسلام قدرِ مشترک تھی اور ہے۔ تعجب کی بات ہے۔ کہ خوشحال خان خٹک کے انتقال کے دو سو سال بعد بھی سید جمال الدّین افغانی جیسے بین الاقوامی شہرت کے مالک سیاست دان اور تحریک اتحادِ اسلامی کے داعی جب دنیائے اسلام کے اتحاد کا ذکر کرتے۔ تو یوں محسوس ہوتا۔ جیسے وہ پنجاب اور سندھ اور بلوچستان میں مسلمانوں کی اکثریت سے غافل ہیں۔ انہوں نے پیرس میں "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے جو ہفت روزہ جاری کر رکھا تھا۔ اس میں لکھا۔

"ادرنہ سے پشاور تک اسلامی مملکتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی سرحدات ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ وہ قرآنی قانون کی ایک اجتماعی وحدت کے اجزاء ہیں ان کی آبادی دو کروڑ سے کم نہیں۔ بہادری اور شجاعت میں وہ ہمیشہ سے تمام قوموں پر فوقیت رکھتے چلے آئے ہیں۔ تو کیا ایسے میں اُن کا یہ مشن نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ وہ دشمنوں کے خلاف اپنی مساعی کو ہم آہنگ کریں اور دوسری قوموں کی طرح اپنی قومی عزت بحال کریں۔"

[مضامین جمال الدین افغانی۔ ص ۔ ۷۰۔۷۱]

اور اگر سید جمال الدّین افغانی نے کبھی پنجاب کا ذکر کیا تو اس حوالے سے، کہ برِ عظیم کے مسلمان افغانوں اور ایرانیوں سے توقع کرتے ہیں کہ وہ آپس کے اختلافات ترک کر کے پنجاب پر یلغار کریں اور ہندوستان بھر میں اسلامی اقتدار کا احیاء کریں۔ انیسویں صدی کے آخر میں، جب یورپی طاقتیں عروج پر تھیں۔ اور ترکیہ مردِ بیمار تھا۔ جمال الدین افغانی کی یہ آرزو پسندیدہ تو ہو سکتی تھی۔ لیکن حقیقت پسندانہ نہیں تھی۔ اس کے برعکس افغانی سے دو سو سال

پہلے خوشحال خان خٹک نے جس خطے کو ایک وحدت تصوّر کیا۔ وہ مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ سے مستقل حیثیت اختیار کر سکتا تھا۔ اس لئے خوشحال خان کا تصوّر زیادہ سائنٹفک تھا

قومی شاعری کے دو بڑے اجزاء ہوتے ہیں۔ ایک وطن سے محبت۔ دوسرے قوم میں بیداری کی تخلیق۔ وطن سے محبّت کبھی مولد سے پیار کا روپ لیتی ہے۔ مثلاً

"وطن کے درخت صندل وعود اور اس کی مٹی مشک عنبر ہے۔ اگر سرائے اکوڑہ اوروں کی نظر میں ایک پتھریلی سنگلاخ زمین ہے تو ہو۔ میری نظر میں تو اس کے پتھر سونا ہیں"

اور کبھی پوری خاکِ وطن سے پیار کی صورت لیتا ہے جیسے :۔

خاک وطن مشک سے اچھی اور وطن کا گرم پانی برف کی طرح خوشگوار ہے۔ یا

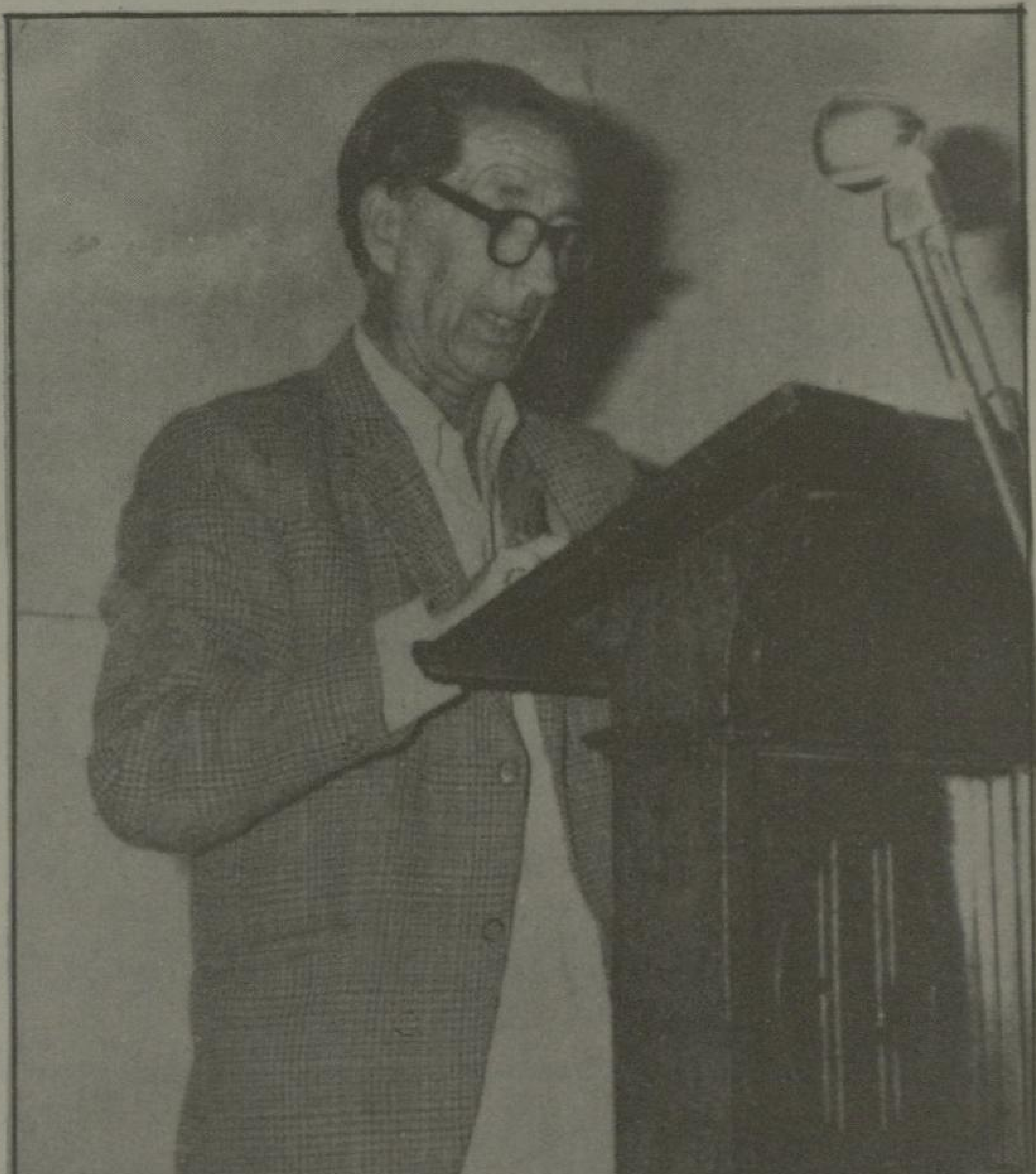
افغان دوشیزائیں اپنی زلفوں کو ہوا میں لہرائیں تاکہ بادِ شمال ان کی خوشبو مجھے رنتھمبور میں پہنچاتی رہے۔

اور جب وطن کا ایک روپ وہ بھی ہوتا ہے جس میں دوسرے ملک سے موازنہ کر کے اپنے وطن کی اچھی باتیں یاد کی جاتی ہیں اس سلسلے میں خاطر غزنوی کی ترجمہ کی ہوئی ایک نظم ملاحظہ ہو۔

ہواؤ
ٹہلتے مچلتے ہوئے خیر آباد سے گر گذر ہو تمہارا
اکوڑہ میں دریا کنارے جو پہنچو
تو میری طرف سے سلام ان کو کہنا
اٹک کو گرجدار آواز دینا
بہ صد پیار دریائے کابل سے کہنا
کہ شاید ترے میٹھے پانی کا اک جام پینا لکھا ہو نصیبوں میں میرے
یونہی عمر بھر میں نہ پیتا رہوں گا
یہاں ہند میں گنگا جمنا کا پانی
ہوا ہند کی راس آئے تو کیسے

کہ پانی یہاں کا نہیں کم بلا سے
اگر چھلنی کرتا ہے آنتوں کو نہروں کا پانی
تو پانی کنوؤں کا نہیں بے خطر کچھ
کہاں ہند میں وہ وطن کے پہاڑوں کا
شفاف، شیریں اور سرد پانی
اگر بھر بھی جائے یہ سارے جہاں کی حسین نعمتوں سے
مری پھر بھی اس خشک خطے سے توبہ
ابھی مجھ پہ چھائے نہیں یاس و حرماں
خدا رحمتیں بھیجتا ہے ہر اک پر
کبھی میں بھی بچھڑے وطن سے ملوں گا
کبھی اس جہنم سے نکلوں گا آخر
ہمیشہ نہ یوں ہند میں میں رہوں گا
یونہی عمر بھر میں نہ پیتا رہوں گا
یہاں ہند میں گنگا جمنا کا پانی
ہواؤ
وطن سے مرا پیار کہنا

باقی رہی خوشحال کی وہ شاعری، جو رزمیہ ہے اور جس کے ذریعے سے اس نے قوم کو جگانے کی سعی کی۔ اس کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اسے ایک مقالے میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ مختصراً یہی کہنا کافی ہے کہ خوشحال خان کی شاعری میں وہ تمام عناصر بھرپور انداز میں موجود ہیں جن سے قومی شاعری عبارت ہوتی ہے۔



سلطان محمد صابر (کوئٹہ)

سلطان محمد صابر
ترجمہ : محمد اسحاق

خوشحال خان کا نصب العین

سب سے پہلے تو میں اباسین آرٹس کونسل پشاور کے ارباب بست وکشاد کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے پشتو کے اس عظیم نابغہ شاعر اور فلسفی خوشحال خان علیین مکان کی اس تقریب میں شرکت کی سعادت کا موقعہ دیا اور ساتھ ہی اپنے خیالات کے اظہار کی سعادت بھی بخشی یہ تو ظاہر بات ہے کہ یہ عظیم محفل محض خوشحال خان کو متعارف کرانے کے لئے نہیں سجی۔ کیونکہ وہ نابغہ انسان کسی تعارف کا محتاج ہے ہی نہیں۔ اس کی یاد گذشتہ تین صدیوں سے پشت در پشت لوگوں کے حافظوں میں محفوظ چلی آ رہی ہے۔ البتہ اس عظیم محفل کا محض ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے کہ اس بڑے مفکر کو معنوی اعتبار سے ہم خود بھی صحیح طور پر جانیں اور اور دوسروں کو بھی اس کے افکار، آثار اور فلسفے سے روشناس کرائیں۔

ہر عظیم مفکر کے افکار سے مستفید ہونے کے لئے لازم ہے کہ قاری اس مفکر کے بنیادی عقیدہ، اساسی نصب العین اور اس زمانے کے صنائع سے مناسب طور پر واقف ہو۔ ہمارا یہ انتہائی زیرک اور فہیم شاعر اگرچہ زندگی کے ہر پہلو پر بسیط اور دلپذیر انداز میں خامہ فرسائی کر چکا ہے اور اس کے کلام کی رنگارنگی اور تنوع نے پشتو ادب میں بہت با اثر اضافہ کیا ہے اور اس کے فن کی سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ اس نے خونریز اور ہیبت ناک جنگی مناظر کو دام وسام کی بجائے لب و جام اور لالہ و فام کی خوبصورت تشبیہات سے ظاہر کیا ہے مثلاً "اپنی سفید تلوار کو خون ایسے گلگوں کیا جیسے اساڑھ کے مہینہ میں لالہ زار شگفتہ ہو جائے۔" اسی طرح رزم و بزم کا عظیم شہسوار اگر شاہین و باز کا ذکر کرتا ہے یا زیست و موت کا فلسفہ بیان کرتا ہے تو ہر جگہ اس کا انداز انتہائی عروج پر نظر آتا ہے۔ اگر اس نے عشق و تصوف کے بحر میں غوطہ لگایا ہے تو بھی بہت گہرائی تک پہنچا ہے اور جہاں درس اخلاق دیا ہے تو زبان کی مٹھاس اور شیرینی کا خیال مد نظر رکھا ہے۔ غرض یہ کہ خان علیین مکان نے مختلف موضوعات پر اپنے

فکر رسا کا توسن خوب دوڑایا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر موضوع اتنا وسیع اور گہرا ہے کہ اس پر بے حساب کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ مگر میں یہاں اس کے نصب العین پر کچھ خامہ فرسائی کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ یہ مضمون بذات خود ایک وسیع میدان رکھتا ہے مگر میں سورج کو چراغ دکھانے کے مصداق اس کا کچھ حصہ واضح کرنا چاہتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ ہر عظیم مفکر کے افکار کو سمجھنے کیلئے اس کے عقیدہ نصب العین اور اصلی تقاضوں کے متعلق کچھ معلومات ضروری ہیں۔ جہاں تک خان علیین مکان کے عقیدے کی بات ہے انہوں نے جیسے اپنی زندگی کے ہر پہلو پر خود بہت کچھ لکھا ہے اسی طرح اپنے نصب العین کے بارے میں بھی واضح طور پر یوں کہا ہے۔

"آپ نے مجھے پانی اور مٹی سے پیدا کیا پھر دین کا متین حصہ عطا کیا میں نے رسول پاکؐ کے دین کو مانا اور دیگر ادیان سے میری توبہ۔"

یہ تو خان علیین مکان کے عقیدے کی بات ہوئی۔ اس ضمن میں اور بھی بہت کچھ واضح طور پر کہا ہے لیکن آیئے ہم اس کے نصب العین کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اسلام محض عقیدے تک محدود مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل قانون اور اکمل نظام کا نام ہے جسے وہ روئے زمین پر اپنے بندوں پر نافذ کرنا چاہتا ہے یعنی انسان خصوصاً مسلمان کی تمام ظاہری و معنوی کیفیات کو تابع کرتا اور ایک مخصوص راہ پر چلاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام سے وہ لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو اسلامی تعلیمات سے آگاہ ہوں اب ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ آیا خان علیین مکان کے زمانے میں اسلامی نظام نافذ بھی تھا؟ مطالعہ تاریخ سے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا یہ نافذ نہ تھا اسی لئے تو مغل بادشاہوں نے ہندو عورتوں کے ساتھ شادیاں کیں۔ اکبر کا زمانہ تو نورتن کا دور تھا۔ اس نے السلام علیکم کی جگہ اپنے نام کی مناسبت سے اللہ اکبر جل جلالہ، کو رواج دینے کی کوشش کی۔ جہانگیر نے تو خود کہا تھا کہ میں نے امور سلطنت ایک سیر شراب اور آدھ سیر گوشت کے بدلے نور جہان کے سپرد کئے ہیں۔ اسی طرح اورنگزیب نے اپنے والد شاہجہان کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ جو شخص اپنے والد محترم کے ساتھ برا سلوک روا رکھے اس سے دیگر لوگ نیکی کی کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ ص[1]

ص[1]:- یہ وہ دور تھا کہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے اسکے طرز حکومت کے خلاف جدوجہد شروع کی تھی۔

مختصر یہ کہ خوشحال خان خٹک کے دور میں جو نظام نافذ تھا وہ مغلوں کی ذاتی پسند کا ایک نظام تھا۔ اور اسے اسلامی نظام کہا جا سکتا چونکہ خوشحال خان خٹک اسلامی تعلیمات سے بخوبی آگاہ تھا اسی لئے وہ اس بات سے اچھی طرح سے باخبر تھا کہ وہ جس نظام کے تحت زندگی کے دن بسر کر رہا ہے وہ اسلامی نظام نہیں۔ اسی لئے تو یوں فرمایا۔

"نہ تو دین ہے نہ آئین۔ شرم کوسوں دور بھاگا۔ سیاہ رو ظالم کافی ہیں۔ جو باج وصول کرتے ہیں۔ عدل کی تلوار تھام۔ اس ملک کو لڑ کر اسلامی ملک بنا۔"

پشتون دو چیزوں کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں جن میں اول دین ہے دوم وطن وہ دین پر وطن کو تو قربان کر سکتے ہیں۔ لیکن دین کو وطن پر قربان نہیں کرتے۔ برصغیر کی مٹی کے ساتھ پشتونوں کی بے انتہا محبت کی ایک وجہ تو یہ بھی ہے کہ اس سرزمین پر ان کے آباؤ اجداد نے اسلامی جھنڈا لہرایا تھا اور اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی تھی جس کے تحت کافی عرصہ وہ حکمران رہے تھے۔ لیکن اس ضمن میں مغلوں کی بات بالکل برعکس تھی۔ اول تو یہ کہ وہ من حیث القوم برصغیر کو نہیں آئے تھے۔ بلکہ انگریزوں کی طرح مٹھی بھر لوگ آئے تھے جن کی تمام دلچسپی محض حکمرانی تک محدود تھی۔ دیس کی مٹی سے انہیں کوئی محبت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے آثار انگریزوں سے بھی کم ہیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ مغلوں نے ہندوستان کی حکومت پشتونوں سے چھینی تھی۔ اسی وجہ سے بھی ان کے درمیان نیک نیتی کا جذبہ موجود نہ تھا۔ خصوصاً مغل پشتونوں کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتے رہے۔ اور انہی سے زیادہ خطرہ بھی محسوس کرتے تھے کیونکہ شیر شاہ سوری نے ایک دفعہ ان سے اقتدار چھین بھی لیا تھا۔

مناسب ہے کہ یہاں یہ بات بھی بتاتا چلوں بلکہ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مغلوں اور پشتونوں کے مابین جنگ و جدل کی ابتدا خوشحال خان نے نہیں کی تھی بلکہ یہ سلسلہ بابر کے زمانے سے جاری تھا اور پھر ایمل خان اور دریا خان کے وقت میں عروج کو پہنچا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ بھی مغلوں کے غیر اخلاقی اوصاف تھے۔ اگر مغل اسلامی رواداری کے حامل ہوتے اور ملک میں اسلامی نظام کو نافذ کرتے تو نہ صرف یہ کہ ان کے اور پشتونوں کے مابین بھائی چارے اور اتحاد و اتفاق کی بنیاد پڑ جاتی بلکہ مغل حکومت کو بھی استحکام حاصل ہوتا۔ خوشحال خود فرماتے ہیں کہ میں ان کا وفادار تھا۔ انہی کی خاطر اپنے بھائیوں

سے لڑتا رہا مگر اس کا صلہ مجھے کبھی اچھا نہ ملا۔

"اگرچہ میں مغلوں کے نمک کا پروردہ ہوں لیکن اورنگزیب کے ہاتھوں میری گھگی بندھ گئی ہے۔"

خوشحال نے اکیلے مغلوں کی طرفداری نہیں کی تھی بلکہ تمام پشتونوں نے بابر کا ساتھ دیا تھا۔ وہ انہی کے طفیل تخت ہندوستان تک پہنچا تھا۔ اور پشتونوں نے محض اسلامی بھائی چارے کی خاطر اس کی مدد کی تھی لیکن کامیابی کے بعد جب اس نے اسلامی اخلاق اور رواداری سے روگردانی کی تو آہستہ آہستہ پشتون اس سے متنفر ہونے لگے نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے خوشحال خان کی غیرت کو للکارا اور پابہ جولاں قلعہ رنتھمبور میں قید کیا، حالانکہ خوشحال خان علیین مکان ایک سچا، مخلص اور شریف انسان تھا۔ جیسے کہ وہ فرماتے ہیں۔

"راستی بادشاہی کا راستہ ہے اس میں گمراہی نہیں۔ صادق لوگ دیگر لوگوں کی بدخواہی کی پرواہ نہیں کرتے وہ سچوں کے ساتھی ہوتے ہیں اور نصرت الٰہی ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی ہے قرآن کہتا ہے کہ سچوں کی جگہ جنت ہے۔ اے خوشحال تم راستی میں کبھی تباہی کا سامنا نہیں کرو گے۔"

جب وہ قید سے رہا ہوا تو عدل کی تلوار کو تھاما کہ لڑ کر ملک کو اسلام کا نمونہ بنائے۔ خوشحال خان جو کہ انتہائی زیرک اور صاحب بصیرت انسان تھا اس بات کو جان گیا تھا کہ مغل اپنے اعمال اور غیر عادلانہ حرکتوں کی وجہ سے روبہ تنزل ہیں۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ ہندوستان کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلے مناسب یہ ہو گا کہ پشتون اسے حاصل کر لیں۔ اس کے مافی الضمیر کو جاننے کے لئے اس کے یہ اشعار کافی ہوں گے۔

ترجمہ:- "اگر کہیں مجھے صاحب حمیت لوگ ہاتھ آئیں تو میرے دل کے ارمان پورے ہو جائیں گے۔ میں مغلوں کو وہ کام دکھا دوں گا جس پر فرید خان کی روح مجھ سے خوش ہو گی۔"

ظاہر بات ہے کہ فرید خان کی روح ایک محدود ٹکڑہ زمین کی حکومت حاصل کرنے پر خوش نہ ہوتی جب تک اس کی کھوئی ہوئی حکومت اور اقتدار خوشحال خان واپس نہ کرتا۔ اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے پشتونوں کا متفق ہونا اولین شرط تھی۔ جو پشتونوں میں آخر وقت تک پیدا نہ ہو سکا۔ اسی ارمان کو دل میں لئے ہوئے خوشحال

خان خٹک اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

خوشحال خان خٹک کی حماسی شاعری میں قبائلی رنگ بھی موجود ہے اور قومی رنگ بھی۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ قومی رنگ قبائلی رنگ پر غالب ہے اور اس کی قومی شاعری اسلام کے دائرہ میں محیط ہے ـــــ فرماتے ہیں۔

"اسلام میں تولاّ و تبرّا چاہیئے۔ جس میں یہ نہ ہو وہ اسلام سے باہر ہے۔ اہل شر کے لئے پنجہ شاہین پیدا کرو اور اہل خیر کے لئے موم سے بھی زیادہ نرم ہو جاؤ۔"

آخر میں اتنا کہوں گا کہ اگر ـــ پشتونوں کو حقیقی اور معنوی شکل میں پہچاننا چاہیں تو ان کا بہترین نمونہ خوشحال خان خٹک ہے۔ کیونکہ خوشحال خان میں اسلام اور پشتون ولی روح اور جسم کی طرح لازم ملزوم نظر آتے ہیں۔ جسم خوشحال اس کی روح کا تابع ہے اسی لئے تو یوں گویا ہوئے۔

"ہر کام شرع کے مطابق کیا کرو رسم ورواج کی پیروی مت کرو۔"



سیال کاکړ

سیال کاکڑ ترجمہ : پرول خان خٹک

خوشحال اور پشتو

خوشحال خان خٹک جیسے نابغہ انسان بذات خود پشتو زبان کے بارے میں یوں فرماتے ہیں۔

"پشتو کی دوشیزہ کی نقاب کشائی کسی نے بھی نہیں کی۔ یہ تو ابھی تک دوشیزہ ہے۔"

ایک دوسرے شعر میں فرماتے ہیں۔

"خوشحال خان خٹک پشتو میں جس قسم کا کلام موزوں کرتا ہے۔ اگر کوئی سوچے تو فارسی زبان میں بھی ایسا کلام نہ ہوگا۔"

خوشحال پشتو کی ادبی دنیا میں وہ نامور صاحب قلم ہیں کہ انھوں نے ہی ہماری محبوب پشتو کو پہلی دفعہ شعوری طور پر لوگوں سے متعارف کرایا۔ خوشحال کا یہ کارنامہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ پشتونخواہ کے علمی اداروں کو علماء کی معاونت سے اس کا یہ کام آگے بڑھانا چاہیئے۔

پشتو اس لحاظ سے ضرور انتہائی خوش قسمت ہے کہ بایزید انصاری المعروف پیر روشان کے بعد پشتو کو خوشحال جیسا عظیم ماہر فن، اعلیٰ سیاست دان اور غیرت مند پشتون ملا۔ اس بے بدل عظیم ادیب نے اپنی مصروف زندگی میں اگر ایک طرف اپنی تلوار کی دھاک لوگوں پر بٹھائی ہے۔ تو دوسری طرف ادبی میدان میں وہ تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ جو اس کی وفات کے بعد تاحال اپنا ثانی پیدا نہ کر سکا۔

خوشحال پشتو کے وہ باشعور اور دردمند اہل قلم ہیں جنھوں نے پشتو ادب کا مورچہ پشتو کی ازلی محبت کے توسط سر کیا۔ اور دل پسند پشتو کو رنگا رنگ ادبی جامہ اور زیور پہنایا اور پھر نہایت افتخار کے ساتھ یوں گویا ہوئے۔

"میں نے مرزا کے دیوان کو تھیلے میں بند کیا اور ارزانی خویشکی زمن کا تمسخر اڑایا خواہ دولت تھا یا واصل یا دوسرے۔ باتوں باتوں میں سب کا مذاق اڑایا۔"

خوشحال کے اپنے آثار سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف پشتو کا زبردست حامی تھا بلکہ اپنی زبان کو دوسری زبانوں کے مقابلے میں اعلیٰ سمجھتا تھا خوشحال اپنے دل کی بات اشعار کی مدلل زبان میں یوں ظاہر کرتا ہے۔

"فارسی شعر کہہ سکتا ہوں، دونوں کا سلیقہ رکھتا ہوں، میں نے پشتو شعر کو ترجیح دی۔ کیونکہ ہر کوئی اپنوں کی تعریف کرتا ہے۔"

اسی طرح فارسی کے بارے میں صاحب ننگ خوشحال کا یہ شعر ہے۔

"میں سادہ پٹھان ان کی بولی کو کیا جانوں جو فارسی ہی فارسی میں مغلوں کی باتیں کرتے ہیں۔"

اور پھر عربی کے بارے میں خوشحال بابا کا یہ شعر قابل توجہ ہے۔

"تم جو مجھے عربی میں مخاطب ہو بھلا ایک عجمی عربی کیا جانے۔"

لہٰذا یہی ملی جذبہ تھا کہ جناب خوشحال خان خٹک نے اپنی محبوب پشتو زبان میں کئی کتابیں لکھ ڈالیں۔ زندگی کا آغاز ادب سے کیا اور پھر نہایت سرعت کے ساتھ شعری اور نثری میدانوں میں ادبی، ملی، اخلاقی، تنقیدی، عشقیہ، فلسفیانہ اور دیگر موضوعات کا ترجمان بن گیا۔ خوشحال نے دیگر کتابوں کے ساتھ ساتھ جامع کلیات کو رنگ برنگی ادبی جواہر پاروں سے مزین کیا۔ اور پھر خود یوں گویا ہوئے۔

"اگر میرے دیوان کے ایک ایک بیت کو شمار کیا جائے تو اس سال ان کی تعداد چالیس ہزار سے تجاوز کر جائیگی۔"

ایک دوسری جگہ اپنے بے بدل دیوان کے بارے میں یوں فرماتے ہیں۔

"میرا تمام دیوان علم کے خزینوں کے باغ کی مانند ہے جس میں قسما قسم پھول مہک رہے ہیں۔"

خوشحال کے اس شعر میں ہمیں کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ یہ شعر ان کے ادبی کارناموں کی ایک مثال ہے جس کی تائید پیر محمد کاکڑ جیسے نازک خیال شاعر نے یوں کی ہے۔

"خوشحال کا شعر کے میدان میں کوئی ثانی نہیں۔ اگر کچھ اثاثہ ہے تو وہ اس کا اپنا شعر ہے۔"

اگر کوئی اُسے بحرِ مواج کہے تو مناسب ہوگا کیونکہ اس کے دیوان میں ہر قسم کے

اشعار ملتے ہیں۔"

خوشحال نے اپنے رنگین دیوان میں ایسی باتیں کیں جس کی وجہ سے اس کے اپنے رشتہ دار اور گاؤں والے ناراض ہو گئے۔ اور یہ ان کی آنکھوں کا خار بن گئے جیسے کہ فرماتے ہیں۔

"اس گاؤں میں میرا کوئی بھی خیر خواہ نہیں کیونکہ میں سچ کہتا ہوں یہی میرا قصور ہے۔"

خوشحال کا یہ تاریخی شعر قابل غور ہے۔

"قید سے رہائی کے بعد خوشحال کا یہ ارادہ ہے کہ یا تو مکہ جاتے یا مغلوں سے برسر پیکار رہے اور یا اسی پہاڑ کے ایک گوشہ میں نماز روزہ اور تلاوت کا اہتمام ہو۔"

خوشحال کو ہم پشتو کے کلاسیکی ادب میں ایک آتش بیان نقاد کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس حقیقت پسند ادیب کو اب دنیا پہچان گئی ہے جیسے کہ ڈاکٹر اقبال اُن کے متعلق یوں فرماتے ہیں ؎

خوش سرود آں شاعر افغاں شناس　　آں کہ بیند باز گوید بے ہراس
آں حکیمِ ملتِ افغانیاں　　آں طبیبِ علتِ افغانیاں
راز قومے دید و بے باکانہ گفت　　حرف حق با شوختی رندانہ گفت

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خوشحال خٹک سے پہلے پشتو زبان میں کافی شعراء اور ادیب گذرے ہیں لیکن یہ فخر انہیں نصیب ہوا کہ پشتو کے میدان نثر اور نظم میں ایک تبدیلی لے آئے۔ ویسے تو خوشحال خان سے پہلے بایزید روشان، مرزا خان انصاری، دولت، واصل اور کتنی دیگر اصحاب نے پشتو ادب کو بہت کچھ عطا کیا ہے۔ خوشحال اپنے زرین دور کی نمائندگی اشعار کے ذریعے یوں کرتے ہیں۔

"جب میں نے پشتو شعر کا علم بلند کیا تو باتوں کے ملک کو اپنے سمند فکر سے فتح کیا۔ حال اور ماضی میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کی باتوں سے مجھے لطف آیا ہو۔"

اس میں شک نہیں کہ خوشحال نے صوری اور معنوی ہر دو لحاظ سے پشتو زبان کو اتنی ترقی دی کہ ہمارے کلاسیکی ادب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ نظم و نثر میں کئی قسم کی ادبی تخلیقات پیش کیں۔ ہمارا یہ عظیم شاعر اور بلند پایہ نثر نگار یہ حق رکھتا ہے کہ پشتو

ادب پر یوں تنقیدی رائے ظاہر کرے ،

"نہ تو اس میں وزن تھا ۔ نہ تقطیع اور نہ ہی عروض ۔ اس کے دو مصرعے خفیف کے اور دو طویل بحر کے ہوا کرتے تھے ۔ غزل میں نہ تو مطلع ہوتا تھا نہ مقطع نہ ہی کوئی تشبیہہ اور نہ استعارہ ۔"

پھر آگے چل کر پشتو کے نامور صاحب قلم یوں فرماتے ہیں ۔

"وزن ، مضمون ، نزاکت اور تشبیہہ میں پشتو اشعار کو عین فارسی تک پہنچا دیا ۔"

خوشحال کا یہ شعر بھی قابل توجہ ہے ۔

"پشتو شعر کو تازہ بہ تازہ مضمون کی بدولت میں نے شیراز اور خجند کا ہم پلہ بنایا ۔"

پشتو کے اس خوشنوا بلبل نے پشتو ادب کے حسین گلستان میں ایسے ایسے ادبی پودے لگائے جسے دیکھ کر وہ خود حیران ہو جاتے ہیں اور اسی عالم میں اپنے فہم و ادراک پر یوں تعجب کا اظہار کرتے ہیں ۔

"میں حیران ہوں کہ خوشحال کو یہ ادراک کہاں سے ملا ہے کہ اس قسم کی ایسی اچھی باتیں کرتا ہے ۔"

خوشحال نے پشتو زبان میں زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے اور اپنے لوگوں کو اپنی میٹھی زبان کے توسط اجتماعی مسائل سے آگاہ کیا ہے ۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ خوشحال کے ادبی جواہر پاروں کا تعارف اہل ذوق سے کماحقہ کرا دیں ۔ وہ اپنے ہمہ جہت افکار کے متعلق یوں فرماتے ہیں ،

"آفرین ہو زبان خوشحال پر جو پشتو میں ہر موضوع پر بات کرتا ہے ۔"

خوشحال کی غیر ثمند پشتو نے گہرے فلسفے کا احاطہ کیا ہوا ہے ۔ جسے مانے ہوئے اور مستند عالم اور صاحب نظر لوگ جان سکتے ہیں ۔ خوشحال خان اس ضمن میں ہمیں یوں متوجہ کرتے ہیں ۔

"جو زمانے کا فاضل ہوگا وہی سمجھے گا ۔ خوشحال خان خٹک کا یہ شعر کتنا دلنشین ہے ۔"

خوشحال بابا نے پشتو کا علم مضبوطی سے تھاما اور گرد و نواح میں اُسے لہرایا ۔ وہ اپنی محبوب زبان کے بہت زیادہ طرفدار تھے ۔ انہوں نے لوگوں سے ترکی زبان میں

باتیں نہیں کی ہیں۔ ایک جگہ یوں فرماتے ہیں۔

"جو شخص اپنی پشتو زبان تک نہ جانے تو ایسے پشتون کو ترکی میں کیا سمجھاتے ہو"

یہی وجہ تھی کہ خوشحال خان نے پشتو زبان پر خاص توجہ دی اور اس میں کافی کتابیں تالیف وتصنیف کیں۔ بابائے پشتو خود فرماتے ہیں۔

"خوشحال نے جب پشتو شعر کا آغاز کیا ہے تو اب پشتو زبان آب وتاب پائیگی"

خوشحال بابا ایک آفاقی شاعر تھے اور دیگر زبانیں سیکھنے کے حامی مگر اس کے ساتھ ہی پشتونوں کے لئے پشتو نہ سیکھنا کمال کی بے ہنری سمجھتے تھے۔ اسی ضمن میں اپنا عقیدہ یوں ظاہر کرتے ہیں۔

"اگر دوسری زبان کا سیکھنا باعث کمال ہے تو اپنی زبان پر توجہ نہ دینا بے ہنری ہے"

خوشحال کو اپنے لوگوں نے زندگی بھر دکھی رکھا۔ لیکن اب یہاں خوشحال کے ایسے عاشق پیدا ہو چکے ہیں جو کہ بابائے پشتو کے اقوال کو سر آنکھوں پہ رکھتے ہیں اسی بات کی پیش گوئی انہوں نے مرنے سے پہلے یوں کی تھی۔

ترجمہ: "اگر اس وقت خوشحال کے قدردان نہیں تو کیا مرنے کے بعد پوری دنیا اسے یاد کرتی رہے گی"

اس میں کیا شک ہے کہ ادبی او زتاریخی شخصیتوں کو کوئی بھی نہیں مار سکتا۔ خوشحال بابا نے پشتو کی نظم ونثر میں ایسی خدمت کی ہے جو بقول ان کے۔

"یہ جو خوشحال خان نے آج باتوں کا باغ سجایا ہے اس پر ہمیشہ ہمیشہ بلبلوں کی چہکار سنائی دیگی"

خوشحال خان خٹک نے صرف زبانی تعلیاں نہیں کی ہیں بلکہ عملی طور پر پشتو ادب کو ناقابل فراموش سرمایہ دیا ہے۔ جب تک روئے زمین پر پشتو بولی جائے گی تب تک خوشحال بابا کے آثار گلستان پشتو کو رنگ وبو سے مزین رکھیں گے۔

خوشحال ایک غیرت مند پشتون شناس تھے۔ اور پشتو زبان کے حقیقی خدمتگار۔ فاضل مصنف نے اس ضمن میں جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں ان میں ارمغان خوشحال، بازنامہ، طب نامہ، سوات نامہ، فضل نامہ، ہدایہ، آئینہ اور دستار نامہ مشہور علمی کارنامے واضح

طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ خوشحال بابا پشتو زبان کی اہمیت کو جانتے تھے۔ اسی لئے اپنی مادری زبان کے اس قدر طرفدار تھے۔ اب یہ فاضل ادیبوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی زبان کو ادبی میدان میں سائنٹفک طریقے پر ترقی دیں۔ تاکہ عظیم خوشحال کی واجب حرمت — پشتو زبان زندگی کے ہر میدان میں اپنا جائز مقام حاصل کر سکے۔ اسی طرح ہمارے محسن بزرگ خوشحال خان خٹک کی روح کو اطمینان حاصل ہوگا۔ اور آنے والی نسلیں ہمیں اچھے الفاظ میں یاد رکھیں گی۔

خوشحال خان خٹک نے خود یوں فرمایا ہے۔

"وہ لوگ جو کہ بہادر ہیں ان کو نغموں اور نوحوں میں یاد کیا جاتا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ خوشحال بابا اس دھرتی کے ایک باعظمت فرزند تھے اور اوران کا ہم سب پر یہ حق ہے کہ اس کی یاد ہر وقت تازہ رکھیں۔ یہاں اگر میں نے اختصار سے کام لیا ہے تو اس کی وجہ وقت کی کمی ہے ورنہ دل تو چاہتا تھا کہ صفحوں کے صفحے لکھے جائیں۔ اس محفل میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ پشتو کی اس ضرب المثل کی روشنی میں پرکھیئے کہ "مہمان کو پیاز دو لیکن محبت کے ساتھ۔"

اس دور کے عظیم ادیب اور شاعر استاد امیر حمزہ خان شنواری نے خوشحال خان خٹک کو اپنا ہدیۂ تبریک یوں پیش کیا ہے۔

"انسان کی سعادت کے سلسلہ میں اگر اس کے فن کو مدنظر رکھا جائے تو وہ ایک عظیم انسان تھا۔"

آخر میں پشتون غیرت اور حمیت کی مثالی شخصیت کو جو کہ ایسوڑی کے پہاڑ کے دامن میں ابدی نیند سو رہی ہے، میں اپنی طرف سے یہ نذرانہ عقیدت پیش کر سکتا ہوں۔

جب سرائے اکوڑہ میں خوشحال خان پیدا ہوئے تو اس کے طفیل سارے پشتون سرخرو ہوئے۔ خوشحال نے اپنی زبان کی جو آبیاری کی اسی وجہ سے مرنے کے بعد پشتونوں کی محبوب شخصیت بن گئے۔ اس طبیب اور پشتو زبان کے حبیب کو اسی لئے محفلوں میں یاد کیا جائے گا۔"



میر عبدالصمد خان

میر عبدالصمد خان

رجائیت پسند خوشحال

خوشحال خان خٹک کے کلام میں رجائیت کا جو بے اندازہ اظہار و ابلاغ ملتا ہے وہ اس کی اپنی نمایاں خصوصیت رہی ہے اس کی ایک ملاطم خیز اور شور انگیز زندگی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ تمام عمر ؎

عاقبت ملجائے ما دادئی خاموشاں است　　　حالیہ غلغلہ در گنبد افلاک انداز

کو پیشِ نظر رکھ کر کار زارِ حیات میں مصروفِ تگ و تاز رہا۔ اپنی شور انگیز اور حشر خیز زندگی کے بارے میں وہ خود کہتا ہے کہ ابھی ایک شور سے فارغ نہیں ہوتا کہ دوسرا پیدا ہو جاتا ہے۔ شاید میں شعر و شر ہی کے روز اس دنیا میں آیا ہوں۔ ایک عظیم انسان کے جوہر خطرات اور آزمائشوں میں زیادہ کھلتے ہیں۔ جب اورنگ زیب کی مستحکم اور عظیم الشان سلطنت نے اس کی خودی کو چھیڑا تو اس کا جوہر آشکارا ہوا۔ اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے مقابلے میں چٹان کی طرح ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اس کی بے پناہ ہمت و عزیمت نے اسے سپرمین کا مرتبہ بخشا اور اس نے ثابت کیا کہ وہ گفتار اور کردار دونوں میں غازی اور ننگیالے رہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں خوشحال خان خٹک ایک پیدائشی اور خاندانی رئیس زادہ، نواب سردار اور سپہ سالار تھا۔ وہ خود کہتا ہے۔

بخرہ ہے د تیغ راکڑہ پہ اصل کنبے پښتون یم　　　پلار پہ نیکہ عدیم بے دولتہ بے حشمتہ

(میرے حصے میں تلوار آئی کہ میں اصل سے پختون ہوں۔ دولت و حشمت تو آباؤ اجداد سے میری میراث چلی آ رہی ہے)

خوشحال خان خٹک کے آباؤ اجداد نے بھی مغلوں کے لئے تلوار چلائی لیکن ان کا غلام بن کر نہیں بلکہ اپنے قبیلے اور قوم کا سردار ہو کر آزاد اور خود مختار خان و سلطان بن کر اور پختونوں کی عزت و ناموس کے پاسبان بن کر خوشحال خانندہ چوتھی پشت میں اپنے والد شہباز خان کا جانشین ہوا۔ یہ شاہ جہان کا زمانہ تھا۔ خوشحال خان اپنے نامور والد کی زندگی میں بھی

شاہ جہان کے دشمنوں کے خلاف دادِ شجاعت دے چکا تھا اور منصب دار ہونے کے بعد تو اس نے اتنے زیادہ اور اعلیٰ کارنامے انجام دیئے کہ قدرداں شاہ جہاں کی نظر التفات کا ہمیشہ مستحق ٹھہرا۔ لیکن جیساکہ مورخین کا متفقہ خیال ہے اورنگ زیب سخت شکی مزاج انسان تھا اس لئے خوشحال خان خٹک اس کے شکوک کا شکار ہو گیا۔ اس کا جدی منصب اس سے چھین لیا گیا۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ ختم کیا گیا اور اسے اہل و عیال سے جدا کرکے بڑی عیاری اور مکاری کے ساتھ گرفتار کرکے ہندوستان لے جایا گیا جہاں اُس نے متعدد مقامات پر قید و بند کے سالہا سال گزارے۔ رہائی اور اپنے وطن واپسی کے بعد چند پختون قبائل کا یہ سردار بالکل مختلف آدمی بن چکا تھا۔ اس نے اپنی مجروح خودی میں تمام پختونوں بلکہ اس خطے کے سارے باشندوں کی خودی کو مجروح دیکھا۔ چنانچہ اس نے نعرہ لگایا۔

یا مغل لا مینځ ورک یا پښتون خوار

(یا مغل نہیں ہوں گے اور یا پختون خوار و ذلیل ہوں گے)

مغل جب اسے بزورِ شمشیر مغلوب نہ کر سکے۔ تو انہوں نے ڈپلومیسی اور زر و مال کے ذریعے اس کے اپنوں کو اس کا مخالف بنایا۔ اس کے اپنے ایک بیٹے بہرام خان نے مغلوں کی منصب داری قبول کرکے اپنے باپ کے خلاف لشکر کشی کی۔ خوشحال خان کا اپنا قبیلہ باپ اور بیٹے میں بٹ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خوشحال خان جوانی اور سرداری دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اس کے دو عالیشان یارانِ ننگ و جنگ ایمل خان اور دریا خان اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ تھوڑے سے پختون محض ننگ و ناموس کی خاطر اس کے ہمرکاب رہ گئے تھے۔ یہ اس کی زندگی کے تاریک ترین ایام تھے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو گھٹنے ٹیک دیتا اور یا نیست و نابود ہو جاتا مگر ننگیالے اور جنگیالے (غیور و جسور) خوشحال خان ایسے میں بھی اپنی انتہائی رجائیت پسندانہ طبیعت کا اظہار کرتا ہے۔

د عالم ډیرے خبرے تود په تود تورے لښکرے

زړه م نه خوځي له ځایه غرخووي هسے کنه

(لوگوں کی طرح طرح باتیں اور ہر طرف لشکروں کے سیاہ دل بادل ہیں لیکن میرے دل کو ایسے میں بھی قرار و سکون حاصل ہے پہاڑ ایسا ہی تو ہوتا ہے)

په بنیادئ کښے وارځ زړونه فراغت وی

چه په غم کښے مردانه شی زړه هغه

(مسرت و شادمانی کے دنوں میں تو ہر شخص کا دل پرسکون اور مسرور ہوتا ہے لیکن دل وہ ہوتا ہے جو ایام غم میں مردانہ اور شیر ہو)

گردش دوران کا شکار ہونے والے لوگ اپنی بدقسمتی اور واژگوں بختی کا رونا اکثر روتے ہیں۔ افسردگی اور قنوطیت ان کے چہروں پر بھی چھائی رہتی ہے اور گفتگو سے بھی ظاہر و عیاں ہوتی ہے مگر خوشحال خان کی رجائیت پسندی ملاحظہ ہو۔

که په نحس طالع بند شوم غم ئے نشته
کله کله تندر هم نیسی هلال

(اگر میں نحوس ستارے کی گردش میں آگیا ہوں تو کیا ہوا۔ ہلال بھی تو کبھی کبھی گہنا جاتا ہے)

یہاں یہ امر واضح رہے کہ خوشحال خان ستاروں کی گردش اور قسمت کے باہمی تعلق، فال رمل اور اس قسم کے دیگر توہمات کا سخت مخالف ہے۔ وہ یہ الفاظ محض شاعرانہ استعاروں کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

خوشحال خان ایسے وقت میں بھی اپنی زندہ دلی اور عاشقانہ مزاج قائم رکھتا ہے جب شہنشاہ ہندوستان بنفس نفیس اپنے لاؤ لشکر سمیت خوشحال خان پر چڑھائی کرنے کی غرض سے دہلی سے آکر حسن ابدال میں اپنا کیمپ لگاتا ہے وہ اپنی محبوبہ سے کہتا ہے۔

مرګ لره ئے واړه د دهلی لښکرے راغلے
ته لا د خوشحال په مرګ ځان روغ نه کړے د ننګ کوے

(دہلی کی تمام فوجیں تو اسے موت کے گھاٹ اتارنے آگئی ہیں لیکن تو اب بھی خوشحال کو قتل کرنے میں عار اور تامل محسوس کرتی ہے)

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں قدیم سے آباد پٹھانوں کی بستیاں قائم ہیں۔ عاشق مزاج خوشحال خان ہندوستان میں قید و بند کی حالت میں بھی وہاں کی ایک پختون محبوبہ کی سنگدلی کا شکوہ یوں کرتا ہے ؎

که په اصل ښښتانه ئے د هندوستان ئے
دا د ظلم خوئ دِ زده کړله مغل

(اگرچہ تو اصل میں ہندوستانی پختون حسینہ ہے لیکن یہ ظلم کی خو بُو تو نے

مغلوں سے سیکھی ہے)

خوشحال خان ہر مایوس اور اداس انسان کو اُمس ورجا کی تعلیم دیکر اُسے صبح امید کے ظہور کا یقین دلاتا ہے۔

غمژن دِ طمع دَ بنا دئ کاندی
د شپے ثخنبتن د سحر نه کوری

اسی مضمون کو وہ یوں دھراتا ہے۔

دشپے ثخنبتن دِ سحر ته کوری کوندِ پرِ وخیژی د صبا ستوری
هیڅوک دِ طمع امید پرے نه کا باران په تږیو کښتو وریږی

داسیر شب صبح کا منتظر ہے۔ ستارۂ صبح طلوع ہوگا۔ کوئی شخص ناامید اور مایوس نہ ہو۔ بارش پیاسی زمین پر ہوتی رہتی ہے)

خدا کی ذات پر یقین کامل رکھنے والے مردمومن کی حیثیت سے وہ اللہ کی رحمت کے انتظار میں ہمہ وقت خوش وخرّم رہنا چاہتا ہے۔

په لا تقنطو خوشحاله تل خوشحال اوسه خرّم

پہاڑ کچھ دنوں کے لئے برف سے مستور ہو جاتا ہے لیکن دھوپ پڑنے سے پھر نکھر آتا ہے۔

مخ د غرو تاؤ ته نه دریږی خوشحاله
په داڅه که یو څو ورځے منجمد شه

(آسمان اور زمین باہم پیوست ہو جائیں تو بھی خوشحال کا دل مسرّت سے تہی نہ ہوگا)

که آسمان د مزکه خله و بله وروړی
د خوشحال خاطر به نه وی بے سرور ه

خوشحال خان ہمیں ایسی حالت میں بھی باہمت اور پُرامید رہنے کی تلقین کرتا ہے جب ہمارے بدن کا کوئی حصّہ شیر کے منہ میں ہو۔ ع

که آسمان دِ دَ مزدی په خله کښے ورکړی
د مزدی په خله کښے مه پریږده همّت

ہمارے اس عظیم ہیرو کا فلسفۂ غم اسکی رجائیت سے وابستہ و پیوستہ ہے۔ یہاں غموں سے مراد وہ غم ہے جو اولوالعزم لوگوں کو مہمات عظیم سر کرتے وقت پیش آتے ہیں اور جو آگے بڑھانے میں مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ خوشحال خان بادِ مخالفت اور طوفان غم کو اردو کے اس شعر کے مصداق سمجھتا ہے۔

تندئ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب　　یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کیلئے

لیکن وہ صرف اپنے تجربات بیان کرتا ہے نہ کہ محض کتابی یا شاعرانہ فلسفہ۔

خدائے دِ مابے غمہ مکړه په دنیا کښے
ځکه او غم سره یاران یو دیر پینه

(خدا دنیا میں مجھے بے غم نہ کرے۔ غم اور خوشحال تو آپس میں دیرینہ دوست ہیں)

په ښادئ سره شریک دی اولسونه
غم یواز ے د خوشحال خټک په ځان دے

(ساری دنیا مسرتوں سے بہرہ اندوز ہو رہی ہے اور لوگ مل کر خوشی کے شادیانے بجاتے ہیں خوشحال واحد شخص ہے جس کا سروکار غم سے ہے لیکن ؏

نو څوک هم شته اے غمه!　　که یواز ے د خوشحال شوے

(اے غم! دنیا میں تیرے لائق کوئی اور بھی ہے یا بس خوشحال ہی کے ہو کر رہ گئے ہو!)

غر به هم لکه ویښته نو ے کا
که غمونه د خوشحال کیږ دے په کوه

(خوشحال کا بارِ غم پہاڑ پر ڈالو تو وہ بھی بال جیسا باریک ہو جائیگا)

خوشحال غوندِ که سود لوی که زیان زما قبول دے
عادت یم د غمونو د اندوه په اجاړو

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ خوشحال کو سود و زیان دونوں قبول ہیں اس لئے کہ وہ تو پہلے ہی سے غم د اندوہ کے اجاڑوں کا عادی ہے۔

خوشحال خان کے خیال میں غم مرد اور نامرد میں تمیز کرنے کی کسوٹی ہے ؛

غم ئے بے حکمتہ نہ دے پیدا کڑے
د نامرد او د مرد پہ مینځ کښے غم محک دے

اسی طرح وہ کہتا ہے کہ مرد غم کے لئے ہیں اور غم فقط مردوں کے لئے۔

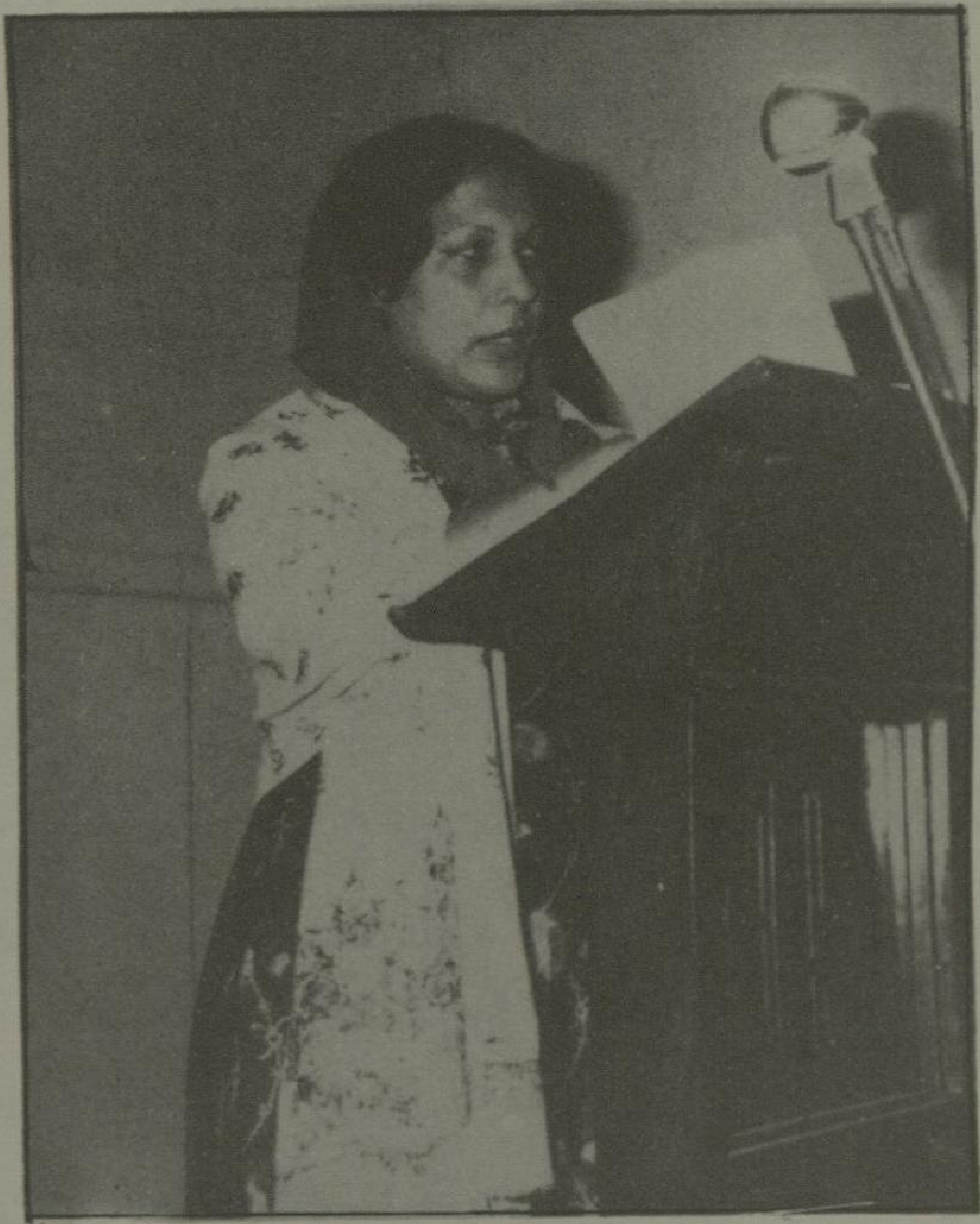
مزید کہتا ہے کہ جہاں جاتا ہوں غم ہی سامنے آتا ہے تاکہ میں اسے شکار کروں۔

" میں نے اس بانور باز کی طرح شاداں طبیعت پائی ہے کہ ہمہ وقت خوشیوں کا شکار تلاش کرتا ہے۔ دل میں غم کے افکار گویا باز ہیں جو شکار مسرت کی تلاش میں محوِ پرواز رہتے ہیں خدا ان کو خوشیوں کا شکار مہیا کریگا۔ بھلا باز بھی کبھی خالی خولی پرواز کرتے ہیں۔

خوشحال خان غم آگیں دلوں کو شادمانی کی نوید دیتے ہوئے کہتا ہے۔

پہ ہر شام پسے سحر شتہ نظر وُکا
عاقبت چہ څوک غمژن شی بیا بہ شاد شی

(ہر شام کے بعد صبح ہوتی ہے۔ جو غمگین ہوں گے وہ بالآخر مسرور شاداں بھی ہوں گے)



چاند بی بی سلطانہ (حیدرآباد)

محترمہ چاند بی بی سلطانہ

خوشحال - ایک شاعرِ غیرتمند

پاکستان کے سربلند و سرفراز صوبہ سرحد کے باشعور اور اہل علم حضرات کے سامنے خوشحال خان خٹک جیسے عظیم شاعر کی شخصیّت اور شاعری پر اظہار خیال کرنا ایسا ہی ہے جیسے چھوٹا منہ بڑی بات۔ میرے دل کو جو اطمینان میسّر ہے میرے دماغ کو جو روشنی نصیب ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خوشحال بابا کی روح یہاں موجود ہے اور اس کی روحانی وابستگی میری روح کو جلال و جمال سے پُرنور کر رہی ہے۔

یہ بھی ممکن تھا کہ اس مضمون کا آغاز اس طرح کیا جاتا کہ خوشحال خان خٹک کس تاریخ کو پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی کس طرح گذری، ان کا خاندان کیسا تھا، ان کی کتنی شادیاں اور کتنی اولادیں تھیں۔ لیکن میں نے یہ انداز اس لئے اختیار نہیں کیا کہ یہ باتیں آپ کے سامنے دہرا کر آپ کا وقت ہی ضائع کرنا ہوگا لہٰذا میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کی شاعری سے ان کی شخصیّت، ان کے مزاج، ان کے کردار اور ان کے پیغام تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ تاکہ وقت کی کمی کا شکوہ بھی نہ رہے اور کام کی بات بھی مکمل ہو جائے۔

پشتو شاعری میں جن موضوعات پر خصوصیّت کے ساتھ اظہار خیال کیا جاتا ہے ان کو فارغ بخاری اور رضا ہمدانی صاحب نے اپنی تالیف "پشتو شاعری" میں اس ترتیب سے بیان کیا ہے۔ حب الوطنی، قومیّت، غیرت و حمیّت، جوش اور ولولہ۔ جرأت اور بیباکی، تمکنت اور خودداری احساس برتری اور سخت جانی۔ اور ان موضوعات کو پشتو شاعروں نے اس قدر پابندی اور مستقل مزاجی سے اپنی شاعری میں جگہ دی کہ اردو کے شعرا بھی اس رنگ میں شعر کہنے لگے۔ گویا پشتو شاعری نے اردو شاعری کے لہجے کو توانائی اور غیرت سے آراستہ کیا۔ اس سلسلے میں پشتو شاعری کے تیسرے دور کے شاعر خوشحال خان خٹک نے بڑا اہم اور تاریخ ساز کردار انجام دیا جس کے لئے پاکستانی قوم اور پاکستانی ادب ان کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور اس احسان کے لئے ان کے شکر گزار ہیں۔

خوشحال کی زندگی اور شاعری کے مطالعے سے جو صورت حال ابھر کر سامنے آتی ہے اس کے مطابق امیر خسرو اور خوشحال کی زندگی میں بڑی مماثلت اور یکسانیت تھی۔ دونوں نے اپنے دور کی ملکی سیاست میں بھرپور حصہ لیا۔ شاہی درباروں سے وابستہ رہے لیکن اس ہنگامی اور مصروف ترین زندگی میں بھی شعر و ادب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور یہ ایک بات ہی ان کی شاعرانہ اور فنکارانہ عظمت کو تسلیم کرانے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے ان دونوں کی شاعری صحیح معنوں میں غم ذات اور غم کائنات کا آئینہ ہے۔ خوشحال کا قلم آتش نوا تھا' اس نے واقعات حقائق اور تجربات کو بڑی صداقت اور جوش کے ساتھ شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثنویاں بھی لیکن غزل میں ان کی شاعرانہ شخصیت کا بھرپور اظہار ملتا ہے انھوں نے جس مہارت اور فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے اس کی بدولت ان کی غزل پوری زندگی کی منہ بولتی تصویر بن گئی ہے۔ زندگی کا گہرا شعور ان کے ہر ہر شعر سے نمایاں ہے۔ ہر جذبے ہر لمحے کی متحرک پرچھائیاں چشم خیال کے سامنے آجاتی ہیں اور اس طرح غالب کی "تنگنائے غزل" کو خوشحال نے ایک بسیط اور بے کراں سمندر کا روپ عطا کر دیا۔ ان کا کلام آفاقیت اور ہمہ گیری کا بھرپور شاہکار ہونے کے باوجود اپنی آن بان اور شان کی انفرادیت بھی برقرار رکھتا ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری پشتو قوم کی سچی اور رنگارنگ تصویر بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے اور ایک غیرت مند قوم کے عظیم کردار کو ابھارنے میں نمایاں کام کرتی ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ عشق و محبت کے جذبات بیان کرتے ہیں تو بھی ان کا آئیڈیل پشتو روایات اور قومی خصوصیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جب وہ ولی دکنی کی طرح اپنی محبوبہ کا سراپا بیان کرتے ہیں تو اس میں بھی پشتون دوشیزہ کے واضح اور دلکش خدوخال نظر آتے ہیں غرضیکہ ان کی نظم ہو یا غزل وہ ہر مقام پر ایک غیرت مند انسان نظر آتے ہیں۔

آیئے خوشحال خان خٹک کی روح کے ساتھ اس کی شاعری کے گلزار میں چلیں' دامن دل کو رنگارنگ پھولوں سے بھر دیں۔ اور چشم نظارہ کو عکس جمال یار کا آئینہ خانہ بنائیں۔ سب سے پہلے وطن کے بارے میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سب سے اچھی ہے پشاور کی زمین
بس رہے ہیں اس میں میرے دوست یار
گرچہ بھارت کی چنبیلی خوب ہے
مجھ کو پیارے ہیں وطن اپنے کے خار

وطن کی محبت کا یہ روپ کتنا خوشنما اور دلآویز ہے

میں کہساروں پہ کیسے اڑ رہا ہوں
اگر خوشحال میرے پر نہیں ہیں

وطن کی محبّت نے خوشحال کو جراُتِ پرواز عطا کی اور وہ شوق بیحد کے ہاتھوں کوہساروں پر اونچی اونچی اڑانیں بھرتا رہا اپنے وطن کے دشمنوں کو وہ ایک شہباز کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہاں اس انداز بیان میں علامہ اقبال کا شاہین پرواز کر رہا ہے۔

میں اپنے صید پر جھپٹوں گا جس دم!
اچک لوں گا اُسے شہباز بن کر
جھپٹتا اور اڑتا ہی رہوں گا!!
اڑوں گا اور اوپر، اور اوپر!

اسلامی تعلیمات کے مطابق مسلمان "غازی یا شہید" کے علاوہ اور کوئی صورت قبول نہیں کرتا۔ اس کا اظہار خوشحال خان کی شاعری میں اس طرح ہوتا ہے۔

ایک غیرت مند انساں کے لئے
زندگی میں دو ہی رستے ہیں یہاں
کھیل جاتا ہے وہ اپنی جان پر؟
لوٹ کر آتا ہے یا وہ کامراں؟

شجاعت و دلیری جنگ آزمائی و سپہ گری خوشحال کو ورثے میں ملی تھی اسی لئے وہ بھی ہمیشہ میدان میں رہا۔ اور قلم کی طرح تلوار بھی اسی آسانی اور مہارت سے چلاتا تھا عزت کی زندگی بسر کرنا ہر دور میں مشکل رہا ہے۔

خوشحال بھی مغلوں کا بڑا قابل اعتماد ساتھی اور وفادار دوست تھا لیکن کسی غلط فہمی کی بنا پر جب اس کی وفاداری اور جاں نثاری کو فراموش کر کے اورنگزیب بادشاہ نے اسے قید و بند میں ڈال دیا تو اس کا دل غم و غصّے اور غیرت سے پاگل ہو گیا۔

بسر ہوتی نہ ہو جو آبرو سے — بھلا وہ زندگی کس کام کی ہے
مجھے غیرت نے پاگل کر دیا ہے — دعائیں نے یہ صبح و شام کی ہے
بچا ذلت سے یارب، جو انہوں نے — مناصب کے بہانے عام کی ہے

پشتو لفظ سنتے ہی غیرت و حمیّت، بہادری و دلیری شجاعت و جواں مردی اور پہاڑوں کی طرح سربلند و سرفراز انسانوں کا تصور ابھرتا ہے خوشحال نے کیا پیاری بات کہی ہے، "سراسی وقت دھڑ پہ اچھا لگتا ہے جب اس کے ساتھ عزت بھی ہو۔" ایک اور مقام پر انھوں نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔ جواں مرد وہ ہے جو کمائے، کھلائے اور بخشش کرے۔ خان وہ ہے جو تلوار چلانے کے ڈھنگ جانتا ہو۔ اور یہ بھی ایک عظیم اتفاق ہے کہ خوشحال بذات خود ان تمام صفات کے حامل تھے۔

خود اعتمادی ایک ایسی صفت ہے جو آدمی کو انسان بناتی ہے اور انسان کو عظیم ترین انسانوں کی صفت اوّل میں مقام عطا کرتی ہے۔ خوشحال نے اس صفت کی تعریف اسطرح کی ہے۔ "شیروں کی بہادری لشکر کے بل بوتے پر نہیں ہوتی۔ ان کی بہادری ہمیشہ اپنی قوت پر اعتماد کا نتیجہ ہوتی ہے۔" اور اس اعتماد کے نتیجے میں خوشحال جب مغلوں کی قید سے رہا ہوا تو اس نے اپنی باقی زندگی مغلوں سے مقابلہ کرتے ہوئے گذار دی یہاں تک کہ جب اس کا بیٹا بہرام بھی مغلوں کی طرف سے اس کے مقابلے پر آیا تو اس نے بھی اس کا مقابلہ کیا۔

نہیں ثانی زمانے بھر میں جس کا
وہ غیرت مند میں خوشحال خان ہوں

غیرت مند انسان ہر وقت ہر موقع اور ہر مقام پر غیرتمند رہتا ہے۔ خٹک اور یوسفزئی ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ اور ہر وقت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں رہتے تھے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب کہ یوسف زئیوں نے اس کے خاندان اور دیگر قبیلے والوں کو پناہ دی ان کی مدد کی اور ان کے جان و مال کا تحفظ کیا۔ کیونکہ خوشحال مغلوں کی قید میں تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ خوشحال جب رہا ہو کر آیا۔ اور اس نے دوبارہ زور و قوت اور جاہ و جلال حاصل کر لیا تو یوسف زئیوں کے اس احسان کا ہمیشہ پاس کرتا رہا اس کا اثر اس کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔

عداوت تھی کتنے قبیلوں سے میری
مگر جب تلک کی نہ طاعت گذاری
کسی طرح بھی ان کو چھوڑا نہ میں نے
مرا رعب رہتا تھا ہر اک پہ طاری

یہ یوسف زئی وہ قبیلہ ہے جس نے
بڑے وقت میں میری پگڑی سنواری

دشمن کا احسان ماننا، اس کی عظمت و برتری کو تسلیم کرنا سب سے بڑی بہادری ہے اور خوشحال خان خٹک اس معاملے میں بھی سب سے آگے نظر آتا ہے۔
مرتے دم تک اس نے مغلوں کی اس بے وفائی کو یاد رکھا۔ اور مرنے کے بعد اپنی قبر کے بارے میں جو وصیّت کی اس سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے اس احساس کو علامہ اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے۔

وہ مدفن ہے خوشحال خان کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ
مغل شہسواروں کی گردِ سمند

غیرت و حمیّت کے اس پیکرِ جلیل نے غزل کو ایک نیا انداز عطا کیا جو پشتو شاعری میں اس سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا۔ مضمون کے اختتام سے قبل اس کی غزلوں کے چند اشعار بھی سن لیجیے۔

گردن ہے کونج کی، تو ہیں پاؤں چکور کے
سنبل ہیں بال، منہ ہے کلی کی طرح سے بند
دل تیرا یوں ہے جیسے کہ پتھر کی قاش ہو
قاتل ہیں آنکھیں اور لب شیریں مثالِ قند۔

رُوئے حسیں نے اس کو بنایا تھا مومنہ
زلفِ سیاہ کی وجہ سے تھا کفر میں شمار

مجروح تیرے غمزوں سے خوشحال خانؔ ہوا
بے زخم کھائے مردِ جری لوٹتا نہیں

مرا دل جو تھا ضیغمِ روزگار   تری چشمِ آہو کا ہے اب شکار

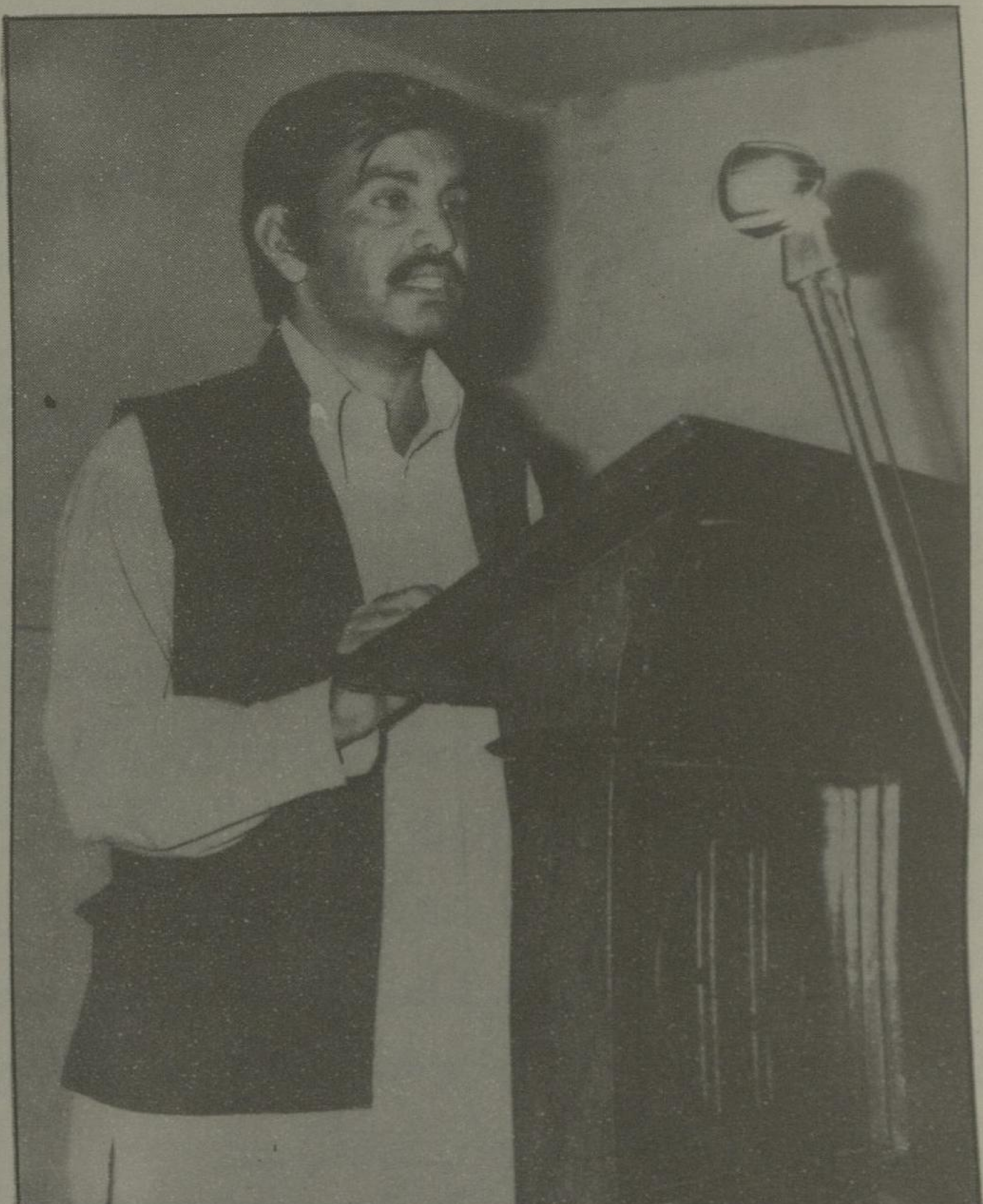
بھیجتے ہیں فوج وہ دلّی سے میکر قتل کو
اور ادھر تجھ کو مِرا سر کاٹنے سے عار ہے

نہیں ہیں بالیاں کانوں میں اسکے — ستارے چاند میں ٹانکے گئے ہیں

نظر آتی ہیں یوں آنکھیں تری، زلفوں کے سائے میں
کہ جیسے مرغزاروں میں ہرن پروان چڑھتے ہیں

اور اختتام پر بابائے پشتون خوشحال خان خٹک کے حضور ایک عظیم المرتبت دانشور اور ماہر تعلیم ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا خراج عقیدت ملاحظہ ہو۔

"خوشحال خان خٹک کو پشتون روایات اور پشتو ادبیات میں بلند رتبہ حاصل ہے۔ اُن کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرت انسانی اور مظاہر کائنات کا صحیح علم، مشاہدہ اور تجربہ رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں بیک وقت قدیم روایات کلاسیکی رجحانات اور جدید تقاضوں کا عکس نظر آتا ہے جو اُن کے علم کی وسعت، نظر کی دقت اور فکر کی صحت کا ثبوت ہے۔ وہ شعر و سخن اور عملی زندگی دونوں میدانوں کے مجاہد تھے اور آزادی کی جدوجہد میں انہوں نے اپنی پوری توانائی صرف کی۔"



رحم زمان خٹک (اسلام آباد)

رحم زمان خٹک
ترجمہ: محمد اسحاق

پیغامِ خوشحال بابا

روئے زمین پر بہتیرے مشہور اور فعّال لوگ پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی ایک بلند مقصد کے لئے گذاری ہے۔ اُن کے اسمائے گرامی صفحاتِ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ہر دور میں ایسے اشخاص نے حالات کے مطابق سعی و کاوش کی ہے۔ اس ضمن میں یا تو وہ پوری طرح کامیاب ہو چکے ہیں۔ یا آنے والی نسلوں کے لئے راستہ ہموار کیا ہے۔ مگر ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ہر ایسے شخص نے کسی ایک وسیلے کے توسط اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن تاریخ عالم میں شاید خوشحال خان خٹک ہی وہ بلند مرتبہ اور ایک حد تک یکتا شخص تھا جس نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف ذرائع استعمال کئے ہیں۔ اگر وہ صاحب دستر خوان تھے تو ساتھ ہی کشادہ دل بھی۔ ان کی تلوار کی جھنکار سے اگر ہندوستان اور روہستان کے پہاڑ اور ریگزار لرزتے تھے تو زورِ قلم سے پشتونخوا اور فارس کے لوگ ناواقف نہ تھے۔ جہاں وہ محفلِ رنداں کو اپنی آواز پہنچاتے تھے تو مسجدوں سے بھی بے خبر نہ تھے۔ جہاں آوازِ حق پہنچا چکے تھے۔ حجروں میں اگر پشتونوں کے جرگے جمع کیا کرتے تھے تو کوہ بیابان اُن کی عسکری سالاری کا بوجھ بھی اٹھاتے تھے۔ ایسے نابغۂ انسان اوراقِ تاریخ میں بڑی مشکل اور کاوش سے مل سکتا ہے۔

آج سے تین سو سال قبل بابا جو باتیں کہتے تھے اور جو آفاقی مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے اس وقت کا بعینہٖ یہی تقاضا تھا۔ بابا ایک خاص وقت کا شاعر نہ تھا' ایک مخصوص دور کا لیڈر نہ تھا' ایک عہد کے طبیب اور حکیم نہ تھے' بلکہ جیسا کہ خود فرمایا ہے اُن کی حیثیت آفاقیت اور عالمگیریت کے تقاضوں کو پورا کرنی تھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ باوجود اس قدر زیرکی' بہادری' حوصلہ اور جدوجہد کے وہ اپنا مقصد کیوں حاصل نہ کر سکا۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھنا ہے کہ ان کا پیغام کیا تھا۔ یہ تو تسلیم شدہ امر ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام کا بیڑا اٹھاتا

ہے تو اس کے خلاف دو قسم کے عوامل بروئے کار ہوتے تھے۔ ایک وقتی عوامل، دوسرے دوامی عوامل۔ دونوں عوامل کی جڑیں اکھیڑنے کے بعد کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ خوشحال بھی انہی دو عوامل سے برسرپیکار تھا۔ خوشحال، ننگ و ناموس حاصل کرنے کے درپے تھا اور یہ تب ممکن ہو سکتا تھا، جب لوگ متفق اور متحد ہوتے۔ ایک ہی رہنما کو تسلیم کرتے اور اس کے لئے قربانی بھی دیتے۔

رہنما اور ننگیال کے بارے میں بابا جو تصوّر رکھتے تھے وہ محض اکتساب کتب کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایسا تصور تھا جو انہوں نے اپنے عمل اور قول سے پیش کیا تھا اگر بابا کی تمام تحریریں اکٹھی کی جائیں اور ان کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ انہوں نے اپنے تمام تصوّرات کا تانا بانا ننگیال کے ایک مرکز پر بنا کیا تھا اسی ننگیال میں پشتو جسے دوسرے لفظوں میں انسانیت کا نام دے سکتے ہیں پوشیدہ ہوتی ہے یہی ننگیال ایک خالص مسلمان ہوتا ہے اور یہی ننگیال لشکر اسلام کا سپہ سالار اور رہنما بھی ہوتا ہے۔ متاسفانہ بابا نے جس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگائی تھی۔ وہ اس مقصد کو خود نہ پا سکے۔ انہوں نے اپنے پیغام کی وضاحت کے لئے زندگی بھر جدوجہد کی۔ عمل اور قلم دونوں سے کام لیا مگر نتیجہ ان کی زندگی میں خاطر خواہ نہ نکلا۔

خوشحال کا پیغام سمجھنے کیلئے اس کی زندگی کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ کیونکہ وہ نہ صرف گفتار کا غازی تھا۔ بلکہ صاحب کردار بھی تھا۔ وہ ان فلسفیوں سے بالکل جدا شخصیت کا مالک تھا جو محض گھر بیٹھے بیٹھے کتابوں میں فلسفے کے داؤ پیچ سے سروکار رکھتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے اپنے اس تصور کو عملی طور پر پرکھا اور اس کے لئے جدوجہد کی۔ جس کی بنا پر وہ تصور ننگیال پیش کر سکا۔ اُس نے ہم سب سے یہ توقع کی ہے کہ ہم ایک بامقصد زندگی گذاریں، یہی تصوّر اس کا مطمح نظر تھا اور اسی کو حاصل کرنے کے لئے جان و مال اور اولاد کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کیا۔

ننگ اور بہادری دو ایسے اوصاف ہیں کہ اسلام کے پکے داعی پشتون اس کے معنی خوب جانتے ہیں اور جو شخص ان اوصاف سے عاری ہو تو پشتون اُسے پشتون نہیں سمجھتے۔ درحقیقت ننگ اور بہادری کا مفہوم ایک ہی ہے۔ بہادری وہ جذبہ ہے جو کسی شخص میں ننگ کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔ اور ننگ وہی صفت ہے جو کسی شخص کو ننگیال

بنتا ہے۔ ننگیال میں جذبہ حریت بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہی جذبہ اور صفت ایک شخص کے اخلاق، عادات و اطوار، نشست و برخواست، صلح و جنگ، گھر اور گاؤں، حجرہ اور مسجد، گویا ہر جگہ لازمی ہے۔ ایک ننگیال صاحب سیف اور صاحب دل ہوگا، مرد میدان ہوگا۔ بہادر ہوگا، اور کوئی بہادر غیرت، حمیت اور شرافت کے بغیر جذبۂ قربانی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بابا ایک بہادر کی بہادری میدان جنگ میں نہایت فصاحت و بلاغت سے بیان کرتا ہے اور اس کی تعریف کرتا ہے۔ جب کوئی ایسا موقعہ پیش آتا ہے تو بابا میدان جنگ میں تلواروں کی جھنکار، بندوقوں کی باڑ، تیروں کی بوچھاڑ کی تشبیہہ فضا میں باز اور شاہین سے اور جنگل میں شیر سے تعبیر کرتا ہے اور اپنے ننگیال میں یہی اوصاف دیکھنا چاہتا ہے۔ بقول بابا کسی بہادر کے لئے لشکروں کی ضرورت نہیں بلکہ وہ تو زور بازو پر عقیدہ رکھتا ہے۔

"بھروسہ تو یا ایک خدا کی ذات پر ہے، یا تلوار پر۔ جرگوں وغیرہ سے یہ کام ہونے سے رہا۔ دنیا میں ایک ننگیال کے لئے دو ہی راستے ہیں، یا تو وہ سر قربان کریگا اور یا کامرانی حاصل کریگا۔" ایک دوسری جگہ ڈرپوک اور نامرد کی برائی یوں بیان کرتا ہے۔

"اگر کوئی بھرا ہوا ترکش لیکر گھوڑے پر سوار ہو جائے تو بھی ایک نامرد سے داد شجاعت کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔"

اب وہ منظر بھی دیکھئے جب بابا کسی بہادر کو یوں مخاطب کرتے ہیں۔

"جو شخص دو دستی تلوار چلانے کا مظاہرہ نہ کرے تو ملک محض میراث میں کسی کو نہیں ملتے۔" ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

"جو شخص ہتھیار سے محبت نہ رکھے وہ اپنے آپ کو مرد نہ کہے۔"

خوشحال خان خٹک کی بہادری کا معیار بہت بلند ہے۔ فرماتے ہیں،

"جو شخص میدان میں تلواروں کے سامنے سربازی کا مظاہرہ کرتا ہے تو خوشحال ایسے ہنر پر قربان ہوتا ہے۔"

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ مادی وسائل میں تسکین دل کا سامان ڈھونڈتے ہیں مگر خوشحال کا معیار دیکھئے۔

"خوشحال خان خٹک کی خوشنودی کا فقط وہ وقت ہوتا ہے جب کہ
چمکتی ہوئی تلواروں کے وار زرہ بکتروں پر ہو رہے ہوں۔"

خوشحال بابا کی دلی خواہش ہے کہ اس کا ننگیال باز اور شاہین کی عادتوں کو اپنائے۔ باز زندگی بھر شکار کا گوشت کھاتا ہے اور یہی ایک بہادر اور ننگیال کی فطرت کا تقاضا بھی ہے کہ وہ ہمیشہ سربکف رہے۔ وہ شاہین کو اونچے پہاڑوں کا بادشاہ سمجھتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا موازنہ گلی کوچوں کے مرغوں، چیل اور کوؤں سے نہیں کرتا۔ باوجود اس کے کہ ان کے پنجے بھی ہوتے ہیں، ناخن بھی اور پرواز بھی کر سکتے ہیں، مگر ان میں باز کی بات کہاں۔

"اگر اس کے پر وغیرہ بہت خوبصورت بنے ہوتے ہیں پھر بھی کونج سے بازی پرواز کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔"

بابا اپنے ننگیال میں شیر کے اوصاف دیکھنا پسند کرتا ہے۔ کیونکہ شیر ہی وہ جانور ہے جس میں شاہی وقار ہوتا ہے۔ دوسروں کے سہارے زندگی نہیں گذارتا۔ اپنے سے کمزوروں کی پذیرائی کرتا ہے۔ ان کے لئے تیار شکار چھوڑتا ہے کسی کو اس وقت تک نہیں چھیڑتا جب تک اسے نہ چھیڑا جائے۔ شیر کی صفات جنگل کے تمام دیگر جانوروں سے ارفع و اعلیٰ ہیں۔ ویسے عام اصطلاح میں شیر کی بہادری بطور ضرب المثل مشہور ہے۔ یہ جانور کسی دوسرے کا زور نہیں مانتا۔ پشت سے حملہ نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ بابا نے اپنا تصور اسی سے اخذ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اپنے زور بازو کا کھاؤ اور کھلاؤ، شیر بنو، نہ کہ لومڑی"۔

خوشحال خان خٹک کے ہاں بہادری اور سربکف رہنا عین انسانیت میں شمار ہوتا ہے۔ اس ضمن میں وہ اپنی ذات میں خود ایک نمونہ نظر آتے ہیں۔ جیسے کہ فرمایا ہے:

"جس کسی نے میرے ساتھ ٹکر لی ہے تو اس کا دماغ ابھی تک ایسا چکراتا ہے جیسے پتھر سے ٹکرایا ہو۔"

ننگیال کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ شمشیر زن اور بہادر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیانتدار، غیرتمند، شجاع، عزت نفس رکھنے والا، ننگ و ناموس کا پاسدار، ہمدردی و مردانگی کا نمونہ اور جھوٹ وعدہ خلافی سے متنفر، عالی اور رجائی

قربانی کے بدلے اپنے حق بات پر اڑے رہنا، سخی اور مہمان نواز، مزدور کا حامی ضعیف کا ہمدرد، آزادی کا پروانہ، زحمت کوش، عزم راسخ اور عقیدہ حق کا پاسبان وفا اور مروت کا پتلا حتیٰ کہ تمام اچھی خوبیوں کا مالک ایک اصلی ننگیال کہلاتا ہے۔ خوشحال کا یہ تصور پیش کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ تو محض اسی کا حصہ ہے کہ کس سلاست اور روانی سے یہ تمام خوبیاں بیان کرتا ہے۔

خوشحال بابا کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ ہر مشکل کا مقابلہ ڈٹ کر کرنا ایک ننگیال کی صفات میں سے ایک اہم صفت ہو۔ چاہے اُسے جتنا بھی آزمایا جائے زیادہ سے زیادہ تکالیف اور صعوبتوں میں پھنسایا جائے پھر بھی وہ ننگ اور بہادری کو ہاتھ سے جانے نہ دے خوشحال فرماتے ہیں۔

"جب نام و ننگ کی بات آجاتی ہے تو میری حالت دیوانوں جیسی ہوجاتی ہے اس حالت میں مجھے سود و زیاں کی ذرا بھر بھی فکر نہیں ہوتی"۔

خوشحال بابا کے ننگیال میں یہ صفت بھی از حد ضروری ہے کہ وہ نہ تو کسی کا خوف دل میں لائے اور نہ ہی لالچ کا شکار ہو۔ اُسے خشک نانِ جویں دوسروں کے حلوے سے زیادہ مرغوب اور کھدر کے کپڑے شاہی پوشاک سے زیادہ عزیز ہوں اور گھاس پھوس کی جھونپڑی کو شاہی محلات سے بہتر جانے۔ فرماتے ہیں۔

"مجھے گھاس پھوس کی جھونپڑیاں ایسی لگتی ہیں جیسے سفید شاہی محل میں قیام ہو۔ مجھے تو سادہ کپڑوں میں آزادی میسر ہوئی اور زربفت اور ریشمی پوشاک کے لوازمات سے جان چھوٹی"۔

خوشحال کے ہاں خوف اور آرام طلبی عورتوں کی عادت سمجھی جاتی ہے۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ اس کا ننگیال ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہے۔ وہ مشکلات سے پہلوتہی کرنے کی بجائے ان کے ساتھ برسرِ پیکار رہے۔ اور حتیٰ الوسع کامیابی بھی حاصل کرے۔ وہ اس بات کا سختی سے قائل ہے کہ زندگی حرکت کا نام ہے۔ اگر کوئی کامیاب زندگی چاہتا ہے تو اُسے اپنی جان اتنی عزیز نہیں سمجھنی چاہیئے جس سے اس کے ننگیال ہونے پر حرف آئے۔ بہادر فتح و شکست کی پرواہ کئے بغیر جان کی بازی لگاتا ہے اور خان بابا اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ موت کا ایک وقت معین ہے جس سے آگے

پیچھے ہونا ناممکن ہے۔ فرماتے ہیں۔

"جب تک کسی کی اجل مطلق نہ ہو کوئی نہیں مر سکتا خواہ اس کا تمام بدن تیروں سے چھلنی ہو جائے۔"

خوشحال بابا کے کلام سے کچھ لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اس کا ننگیال محض ایک لڑاکو فرد ہے اور وہ ہر وقت جدال و قتال کا متمنی رہتا ہے۔ جس سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ خوشحال کے ننگیال کے دل میں مروّت، رحم اور عفو کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ مگر بات ایسی نہیں، خان علیین مکان ببانگ دہل فرماتے ہیں۔

"اگر صلح صفائی سے روزگار چل سکے تو پھر تیغ و تفنگ کی کیا ضرورت ہے۔"

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

"اہل شر کیلئے پنجۂ شاہین پیدا کرو اور اہل خیر کیلئے کبوتر سے بھی زیادہ حلیم بنو۔"

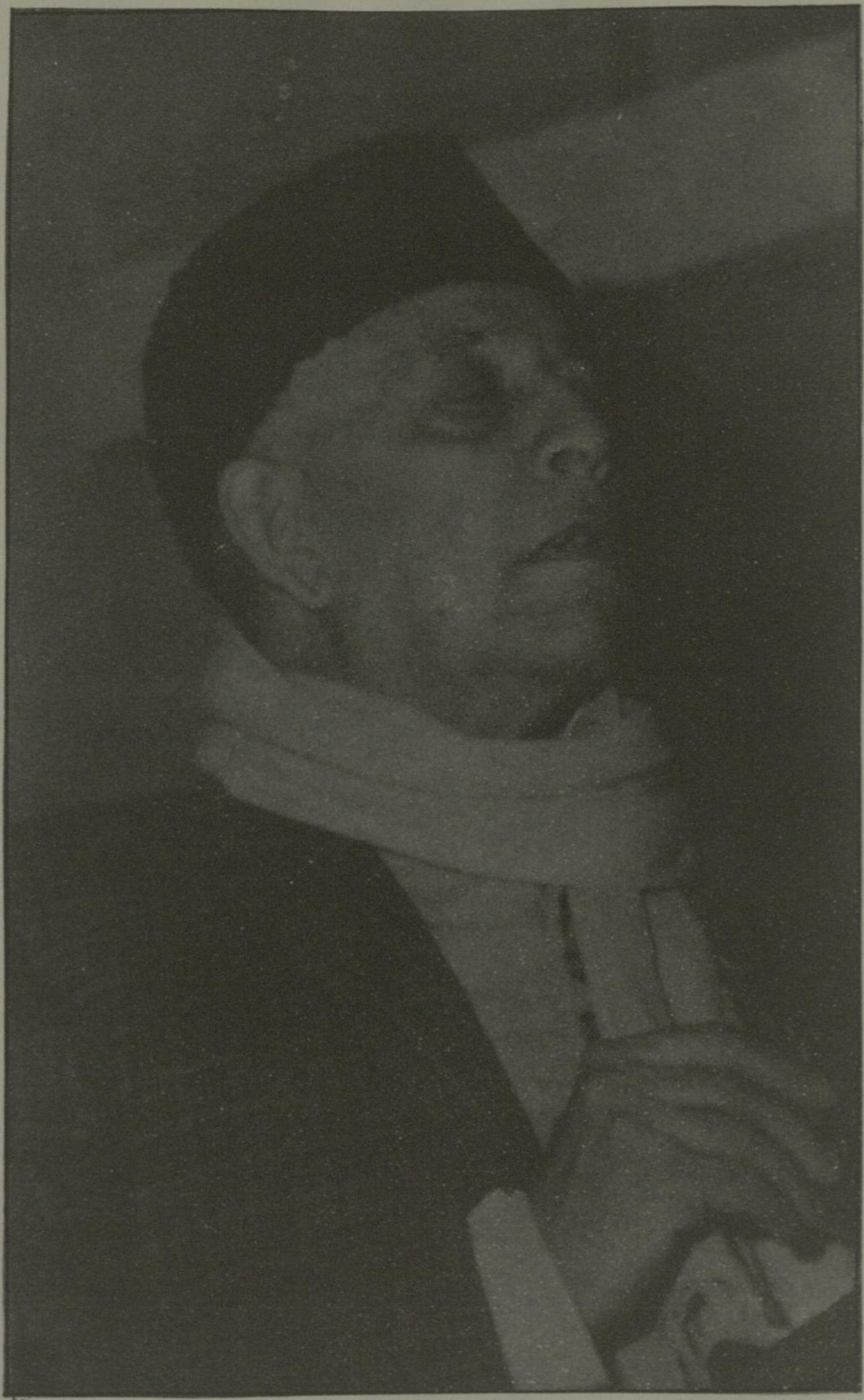
اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خوشحال کا ننگیال تخریب پسند نہیں بلکہ تعمیر کا خواہاں ہے۔

میری یہ کوشش تھی کہ اختصار سے کام لوں۔ مگر فکرِ خوشحال کو ایک مختصر سے مقالے میں سمونا کار دارد۔ اس بحرِ بے کراں میں میری کشتی ایسی ڈولتی رہی جسے سنبھالنا انتہائی مشکل تھا مگر حتی المقدور پیغامِ خوشحال اور کردارِ خوشحال کی چند جھلکیاں پیش کیں۔ جس سے بابا کا تصور ننگیال واضح ہو سکے۔ ہماری تاریخ میں فرید خان جسے دنیا شیر شاہ سوری کے نام سے جانتی ہے اور احمد شاہ ابدالی جیسے مشاہیر اور ان گنت اور مردانِ حر اسکی واضح مثالیں ہیں اس ضمن میں بابا کا معیار نہایت واضح الفاظ میں کچھ یوں نظر آتا ہے۔

"مرد وہ ہے جو صاحب ہمت و برکت ہو۔ لوگوں کے ساتھ رہن سہن میں خوش خلق ہو۔ اسکی بات، اس کا عہد اور اس کا برتاؤ ایک جیسا ہو۔ نہ تو جھوٹ بولے نہ ہی فریب سے کام لے اور نہ لفاظی کرے۔ وہ باتیں کم کرے لیکن عمل زیادہ۔ اس کی مثال غنچے کی ہو۔ جس کا منہ بند لیکن سینہ وا ہوتا ہے۔ جب پستی و بلندی کی بات آجائے، تو وہ بلندی میں آسمان کی ہمسری کرے اور پستی میں مانند خاک ہو۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ

نابغهٔ عصر



ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈائریکٹر دائرہ المعارف اسلامیہ لاہور

ڈاکٹر سید عبداللہ

کلام خوشحال میں شعر عرب کی جھلک

میں نے جب خوشحال خان پر کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو قدرتی طور سے (اور بڑی حد تک ذفت کی تنگی کی وجہ سے) مشہور عام موضوع "اقبال و خوشحال" اختیار کرنے کا خیال آیا۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ میں کچھ سوچ بھی نہ سکتا تھا کیونکہ میری پشتو کمزور ہے اور خوشحال کو سمجھنے کیلئے مضبوط اور توانا پشتو کی ضرورت ناگزیر ہے میں نے میجر راورٹی کو بھی دیکھنے کی کوشش کی لیکن میں نے جب اس کے چند ترجمے پڑھے تو مجھے کچھ یوں لگا گویا میں "چھچھ کی" ہندکو" پڑھ رہا ہوں یا سن رہا ہوں خوشحال کی توانا کہستانی آواز مجھے سنائی نہ دی۔ ناچار مجھے پھر اقبال کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس اثنا میں دفعتاً خوشحال شناس اقبال نے میری رہنمائی کی اور مجھے ایک اور سمت کی طرف متوجہ کر دیا۔

اہل علم کو معلوم ہے کہ اقبال نے اکتوبر ۱۹۲۸ء میں انگریزی رسالہ اسلامک کلچر میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا KHUSHAL KHAN THE AFGHAN WARRIER POET میں اس سے قبل میر عبدالصمد کی کتاب خوشحال و اقبال میں اس مضمون کا خلاصہ پڑھ چکا تھا مگر اس نئی ضرورت نے مجھے مجبور کیا کہ میں اصل مضمون پھر پڑھوں۔

اس نئے مطالعہ کے دوران علامہ اقبال کے جس خیال نے مجھے اپنی طرف فوراً متوجہ کیا وہ یہ تھا کہ :۔

"خوشحال خان کی شاعری میں ابتدائی عرب کی شاعری کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ جب ہم اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس میں بیان کی فطری اصلیت و صداقت کو واضح شکل میں دیکھتے ہیں۔ اس میں عرب شاعری کی طرح آزادی اور جنگ سے محبت کا اظہار ملتا ہے اور زندگی کے بارے میں نقطہء نظر اور تنقید کا رنگ ڈھنگ بھی ویسا

ہی نظر آتا ہے۔"

یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ علامہ اقبال کے دل میں عربی شاعری کی روح (آزادی و صداقت) کی بڑی عزت تھی چنانچہ انہوں نے اسرار خودی کے دیباچے میں معاصر شعراء کو عربی کی پیروی کی تلقین کی تھی اور فرمایا تھا۔ ع

رجعتے سوئے عرب می بایدت

اور اب جبکہ ان کا ارشاد یہ ہوا کہ خوشحال کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کی روح کارفرما نظر آتی ہے تو گویا انہیں ہمارے اس پشتون شاعر کی شاعری میں اپنے تصور کی مثالی اور حقیقی شاعری نظر آئی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، انہوں نے غالب (اور شاید قدرے نظیری نیشاپوری) کے سوا فارسی اور اردو کے کسی شاعر کو یہ رتبہ عطا نہیں کیا جو خوشحال خان کو دیا۔

خیر رتبہ شناسی کی یہ کہانی الگ ہے، اس وقت میری تمنا یہ ہے کہ میں علامہ اقبال کی اس تنقید پر کچھ کہہ سکوں کہ "خوشحال خان کی شاعری میں ابتدائی عرب کی شاعری کی روح کارفرما ہے" اور اس پر بھی کہ زندگی کے بارے میں خوشحال کا نقطۂ نظر اور تنقید کا رنگ ڈھنگ ویسا ہی ہے جیسا کہ عربوں کی شاعری میں تھا۔

معلوم نہیں ابتدائی عرب کی شاعری سے علامہ کیا مراد لے رہے ہیں تاہم اس سے مراد جاہلی عرب کی شاعری تو یقیناً ہے اگرچہ بعد کی عرب شاعری (یعنی بنو عباس کے دور تک کے شعرا) کو بھی اس سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

مذکورہ عرب شاعری کی موضوعاتی و اسلوبیاتی خصوصیات بہت سی ہیں مثلاً جیسا کہ ابن قتیبہ، جرجی زیدان اور نکلسن تینوں نے اپنے اپنے مخصوص پیرائے میں جاہلی عرب شاعری کی خصوصیات میں غیوری وجسوری اور عزت و ناموس کے لئے جنگ کے علاوہ مروت اور شرف آزادی کو نمایاں حیثیت دی ہے۔ یہ وہ خصائص ہیں جنہیں عرب نقادوں نے مجموعی طور سے حماسہ کا نام دیا ہے حماسہ میں جو خصوصی جذبات منعکس ہیں ان میں چند یہ ہیں محاربات میں جرأت وجسوری، مصائب و شدائد میں صبر و تحمل، عزت نفس، خودداری اور غیرت و انتقام، کمزوروں کی حفاظت اور زبردستوں کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ و مزاحمت اور وہ عزم راسخ جس کی نکلسن نے اپنی تاریخ ادب العرب میں ٹمنی سن (TENNYSON) کے ایک مصرعے میں تشریح کی ہے۔

TO STRIVE TO SEEK TO FIND AND NOT TO YIELD

غرض عرب شاعری کی اہم خصوصیات میں حماسی جذبات جزو اعظم کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور جب ابوتمام نے نمائندہ عرب شاعری کے مجموعے کا نام حماسہ رکھا تو یہ بلاوجہ نہ تھا یعنی اس کے نزدیک بھی عرب شاعری کا خلاصہ حماسی خیالات و جذبات پر مشتمل ہے۔ نکلسن نے اس حماسی شاعری کا نمائندہ اعظم شنفرا کو قرار دیکر اس کے لامیہ قصیدے میں عربوں کے حقیقی ابطال اور ہیروز کی ایک عمدہ تعبیر پیش کی ہے۔ بہر حال جو یندہ یابندہ اس طرح مجھے ایک مناسب حال موضوع مل گیا جس پر غالباً کم لوگوں نے کچھ لکھا ہوگا۔ اگرچہ میں بھی چھ مجمل اشاروں کے سوا آپ کو کچھ نہ دے سکوں گا۔

عربی شاعری کی جس روح کا علامہ اقبال نے ذکر کیا ہے اس کے نامور نمائندوں (ہیروز) کے خیالات و جذبات یہی ہیں جن کا سطور بالا میں ذکر آیا ہے۔ یہ میری محرومی ہے کہ میں خوشحال کی اصل پشتو سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا لیکن متفرق اشعار کی صورت میں جو مجھے علامہ اقبال، میجر راورٹی، دوست محمد کامل اور خصوصاً میر عبدالصمد کی کتاب (خوشحال اور اقبال) سے دستیاب ہوئے ہیں ان کی مدد سے میں بقول اقبال "شاعر افغان شناس" کی روح شاعری کا ہلکا سا تصور دلانے کی جرأت کر رہا ہے۔ سب سے پہلے خوش حال کے تصور مروت کو لیجیے، اس رویے یا تصور سے کلام خوش حال بھرا پڑا ہے۔ یہاں چند نمائندہ اشعار کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ خوشحال خان فرماتے ہیں۔

مروّت: اہل شر کیلئے پنجۂ شاہین پیدا کر اور اہل خیر کے لئے کبوتر سے بھی زیادہ حلیم وخاکسار بن جا۔

، عدل کی تلوار اٹھانے میں تاخیر نہ کر اور ملک میں اسلام پھیلانے کے لئے جنگ کر۔

، یا تو خدائے واحد کا تکیہ ہے اور یا تلوار کا، ان جرگوں ورگوں سے معاملے طے نہیں ہوتے

، جو شخص شمشیر و سناں سے محبت نہ رکھتا ہو وہ اپنے آپ کو مرد نہ کہے۔ ایسا آدمی تو بس ہاتھوں میں مہندی لگانے اور آنکھوں میں سرمہ ڈال کر اپنے آپ کو کسی جوان کے لئے دلہن کی طرح آراستہ و پیراستہ کرلے۔

، جہاں میں ننگ و ناموس جس چیز سے حاصل ہوتے ہیں وہ عربی گھوڑے ہیں جو میدان جنگ میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

، جو شخص پیٹھ پر تلوار کا زخم کھاتے وہ ہرگز ہرگز بہادر و شجاع نہیں۔

آزادی: آزادی کی فضیلت اور غلامی کی ذلت کے بارے میں بھی خوشحال خان نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مثلاً۔

جو دوسروں کی نوکری کرتا ہے وہ گیدڑ ہے، شیری صرف آزاد مردوں کا حق ہے۔
۰ شیر کا مقام یا تو پہاڑی دروں کی انتہائی بلندیوں پر ہوتا ہے یا پھر اس کی قسمت میں موت یا زنجیر ہوتی ہے۔

ننگ و ناموس :۔ ننگ و ناموس کے لئے کٹ مرنے کے بارے میں خوشحال خان کا تصور ربلکہ عمل) یہ ہے کہ مرد وہی ہے جو باہمت ہو اور ننگ و ناموس اور غیرت و عزت کے لئے سرگرم و مستعد ہو۔

صبر :۔ مرد وہی ہے جو انتہا درجے کا غیور اور غایت درجے کا صابر ہو۔

صابری و استقامت :۔ شدائد و مصائب میں صابری صبر و استقامت کے بارے میں خوشحال خان کی تلقین یہ ہے۔

۰ خدا نے جو غم پیدا کیا ہے وہ حکمت سے خالی نہیں، یہ تو ایک کسوٹی ہے جس سے مرد و نامرد کو پہچانا جا سکتا ہے۔

غرض خوشحال خان کا تصورِ مروت ان کی شاعری میں جا بجا منعکس ہے اور یہ عربی شاعری کے عین مطابق ہے۔

آدمیت :۔ اس آدمی کو اچھا سمجھ جو دل کا صاف ہو، شرم و غیرت کا پاسبان ہو۔ جس شخص میں یہ اوصاف نہ پائے جاتے ہوں وہ باقی جو جی چاہے کرے مگر وہ انسان نہیں۔

۰ مرد وہ ہے جو انتہائی درجے کا غیور اور غایت درجے کا صابر ہو وہ عفو و کرم اور بخشش میں مشہور ہو۔

اب موازنہ و مقابلہ کے لئے ایک نمائندہ عرب شاعر الشنفریٰ کا مشہور قصیدہ لامیہ پیش کیا جاتا ہے آخر میں ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔

وفی الارض منای للکریم عن الاذیٰ	وفیها لمن خاف القلیٰ معزل
لعمرک ما فی الارض ضیق علیٰ امرءٍ	سریٰ راغباً او راھبا وھو یعقل ؛
ولی دونکم اھلون سید عملس	وارقط زھلول وعرفاء جیال
ھم الاھل لا مستودع السرّ ذائع	لدیھم ولا الجانی بما جرّ یخذل
وکل ابی باسل غیر انّنی	اذا عرضت اولی الطرائد ابسل

وان مدت الایدی لی لزادلم اکن ‏ ‏ ‏ ‏ باعجلهم اذا جمع القوم اعجل
وماذاك الآ لبسطة عن تفضل ‏ ‏ ‏ ‏ علیهم وکان الافضل المتفضل
وانی کفانی فقد من لیس جازیا ‏ ‏ ‏ ‏ بحسنی ولا فی قربه متعلل
ثلاثة اصحاب فواد مشیع ‏ ‏ ‏ ‏ وابیض اصلیت وصفراء عیطل
ھتوف من الملس المتون یزینها ‏ ‏ ‏ ‏ رصائع قد نیطت الیها و محمل
اذا ذل عنها السهم حنت کانها ‏ ‏ ‏ ‏ مرزاۃ عجلی ترن و تقول

(الشنفری۔ قصیدہ لامیۃ العرب۔ مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۳۰۰ اشعار ۲-۱۳)

ترجمہ:۔ اور زمین میں شریف انسان کے لئے ظلم و زیادتی سے دور ہونے کے مقامات اور بغض و عداوت سے خائف کے لئے پناہ گاہیں موجود ہیں۔

تیری زندگی کی قسم! جو شخص کسی کام کی امید سے یا کسی کے خوف سے عقل مندی کے ساتھ کہیں آنا جانا چاہے، اس کے لئے زمین میں کوئی تنگی نہیں ہے۔

اور میرے لئے تمہارے علاوہ بھی ایسے لوگ (پناہ دینے والے) موجود ہیں جو سفید و سیاہ رنگت والے طاقتور بھیڑیوں چتکبرے چکنی جلد والے چیتوں اور لمبی دم والی گوہ کی طرح (طاقتور و توانا) ہیں۔

وہی ساتھی مخلص ہیں کہ ان کے پاس رکھا ہوا بھید ظاہر نہیں ہوتا اور ان کے پاس پناہ لینے والا اپنے جرم کی وجہ سے ذلیل و خوار نہیں ہوتا۔

ان میں سے ہر ایک غیور، خوددار اور بہادر ہے۔ بجز اس کے کہ جب روندنے والے گھوڑوں پر سوار ہو کر حملہ کرنے کا وقت آتا ہے تو میں ان میں سب سے زیادہ بہادر ہوتا ہوں۔

اور اگر کھانے کی طرف ہاتھ بڑھائے جاتے ہیں تو میں لالچی شخص کی طرح جلدی ہاتھ نہیں مارتا۔ (بلکہ اطمینان کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں۔ خواہ مجھے بھوکا رہنا پڑے)

یہ سب کچھ ان پر میرے احسانات کی وسعت کی وجہ سے ہے، اور افضل وہی ہوتا ہے جو دوسروں پر (احسان کر کے عملاً نہ کہ قولاً) دعوائے فضیلت کرے۔

بلاشبہ میں اس شخص کے دور ہو جانے کی کفایت کرنے والا ہوں جو دوسروں پر نیکی کرنے والا نہ ہو اور جس پڑوس میں رہ کر دل کو کوئی تسلی حاصل نہ ہو۔

میرے تین ساتھی ہیں۔ بہادر دل۔ سفید صیقل شدہ برہنہ تلوار، اور زرد رنگ کی لمبی کمان۔

وہ (کمان) اپنے ٹھوس اور صاف وجود کی وجہ سے آواز پیدا کرتی ہے، اس کو اس کے ساتھ کا بناؤ سنگھار اور اس کا محمل زینت دیتے ہیں۔

جب تیر اس سے چھوٹتا ہے تو وہ کمان جلدی سے اس عورت کی طرح المناک باریک آواز میں بین کرتی ہے جس پر کثرت سے مصیبتیں وارد ہو رہی ہوں۔

دیکھا آپ نے اشعار مذکورہ بالا سے شعر عجم اور کلام خوشحال کی مماثلتوں کا کتنا واضح انکشاف ہوتا ہے یقیناً ان سے علامہ اقبال کی مذکورہ رائے کی تصدیق ہوجاتی ہے۔ اب اگر ان اشعار کے ساتھ خوشحال کی ایک اور نظم بھی شامل کرلی جائے تو عرب شاعری کے مسلک مروت کی تصویر کچھ زیادہ روشن ہوجاتی ہے۔ اس نظم کا ترجمہ (جو میر عبدالصمد کی کتاب سے ماخوذ ہے۔) درج ذیل ہے۔

مرد وہی ہے جو صاحب ہمت و برکت اور دنیا والوں کے ساتھ سلوک اور برتاؤ میں خوش خلق اور شیریں مقال ہو، جس کا ظاہر و باطن ایک ہو، جو صادق القول ہو۔ اپنے عہد کا پابند ہو اس میں کوئی جھوٹ اور فریب نہ ہو اس کا دوسروں کے ساتھ تپاک اور محبت و مروت سے پیش آنا ظاہری و نمائشی نہ ہو۔ وہ کم گفتار ہو۔ اور خاموشی میں بسیار کردار ہو۔ جس کا ذہن تو غنچے کی مانند بند لیکن سینہ چاک (کشادہ) ہو۔ جب بلندی کا مقام ہو تو وہ عظمت و رفعت میں آسمان ثابت ہو اور جب پستی کا محل ہو تو مانند خاک ہو۔ تمکین میں مانند سرو بلند ہو، لیکن جب عجز و انکسار کا موقع ہو تو تاک کی طرح اسکی شاخیں زمین پر ہر سمت پھیلی نظر آئیں۔ وہ تازہ اور سرسبز باغ میں پھول کی مانند شگفتہ رُو اور حسین نظر آئے کہ شیریں نوا بلبلوں کے چہچہے اور نغمے اس کے گرد بلند ہوتے رہیں)

اب تک میں نے جن مماثلتوں کا ذکر کیا ہے ان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ مذکورہ عرب شاعری اور خوشحال کی روح شعری ہو بہو ایک ہے۔ واقعہ میں ایسا نہیں۔ ان کے مابین فرق بھی بہت ہیں مثلاً کسی بادیہ گرد شاعر اور کوہ نورد شاعر کے مزاج اور ماحول میں جو قدرتی فرق ہو سکتا ہے وہ یہاں بھی موجود ہے اس کے علاوہ تاریخ اور شخصی حالات اور کردار میں بھی بڑا فرق ہے۔ چرند و پرند بھی الگ ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا غلط نہیں کہ مماثلتیں بھی خاص

نمایاں ہیں۔

میں نے اس وقت تک علامہ اقبال کی نشاندہی کے مطابق ابتدائی عرب شاعری (یعنی قبل از اسلام کے شعرائے کبار) کی روح شعری کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن موازنہ ومماثلت کا یہ دائرہ آگے بھی بڑھ سکتا ہے۔

اس سلسلے میں، میں امرءالقیس اور متنبی کے کلام سے بھی مماثلتوں کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ امرءالقیس اور متنبی کے ساتھ کچھ ملامتیں اور مذمتیں بھی وابستہ ہیں مگر ان کے باوجود ان دونوں کی شاعری کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں کلاسیکی عرب شاعری کی توانائی اور جلال و دبدبہ نمایاں ہے اور اس دبدبے کے پیچھے آزادی وبیباکی، جسوری دغیوری اور حرب وضرب کے وہ نقشے صاف صاف نظر آتے ہیں۔ جو پرانی عربی شاعری کے علاوہ خود کلام خوشحال میں بھی ہیں۔

میں بغرض اختصار امرءالقیس کو اس سفارش کے ساتھ ترک کرتے ہوئے کہ کوئی عربی اور پشتو کا عالم اس موازنے پر وقت ضرور صرف کرے۔ یہاں اس موقع پر مجمل سا جواب متنبی کی شاعری سے پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

متنبی وہی عظیم شاعر ہے جس نے اپنے بارے میں خود کہا تھا۔

فالخیل واللیل والبیداء تعرفنی　　　والسیف والرمح والقرطاس والقلم

ترجمہ: پس گھوڑے اور رات اور خشک جنگل مجھ کو بخوبی پہچانتے ہیں اور ضرب شمشیر و نیزہ بھی اور کاغذ و قلم بھی یعنی میں صاحب رزم و بزم اور مرد سفر و شجاعت وفصاحت ہوں۔

ملاحظہ فرمایئے اس شعر میں ذوق سپہ گری، جسوری دغیوری، توانائی و جلال کے ساتھ شاعر کی دانش پسندی اور شعر پرستی کا کس شان کا تذکرہ ملتا ہے اس کے علاوہ تلوار کی دی ہوئی عبرت کتابوں کی دانش کے مقابلے میں زیادہ سچی ہے۔ متنبی نے اپنے ایک شعر میں کہا کہ معرکہ حق وباطل میں اس کا درج ذیل شعر ہر جہاد پسند قوم کے لئے ایک مؤثر پیغام کا درجہ رکھتا ہے۔

ان السیف مع الذین قلوبھم!
لقلوبھن اذا التقی الجمعان!

ترجمہ:۔ بیشک تلواریں ان لوگوں کا ساتھ دیتی ہیں۔ یا ان کی مدد کرتی ہیں جن کے دل بوقت مقابلہ فوج دشمن ایسے ہوں جیسے تلواروں کے دبے جگر) دل بمعنی جلاوت اور بہادری میں

متنبی کافی عرصہ تک سیف الدولہ کے دربار سے متعلق رہا جس نے عمر کا بیشتر حصہ اپنے مسلم مخالفوں کے علاوہ رومی عیسائیوں کے خلاف جہاد میں گذارا اور اس جہاد میں متنبی بھی اس کے ہمراہ شریک رہا تھا چنانچہ اس کے قصائد میں حرب وضرب اور جنگ وجہاد کے جملہ لوازم (اسلحہ وساز و سامان وغیرہ) کے بھرپور مرقعے موجود ہیں۔

متنبی اور خوشحال کے کلام میں لفظی ومعنوی مماثلتیں پائی جاتی ہیں' خوشحال کی شاعری کا نمایاں ترین وصف وہ جنگ آزمائی اور معرکہ طلبی ہے جو اُسے مغلوں کے مقابلے میں پیش آئی۔ اس لئے قدرتی طور سے اس کے اس رزمیہ کلام میں تلوار' اور نیزہ زخم اور اسپ جنگی اور زرہ بکتر۔ اور اس کے استعارے باز اور شاہین اور عام زندگی میں شوق شکار وغیرہ بکثرت موجود ہیں۔

متنبی کے یہاں رسم زمانہ کے مطابق شعری اصناف اور اسلوبیات کا تنوع ہے لیکن سیف الدولہ کے ساتھ مسلم قبائل اور رومیوں کے ساتھ لڑائیوں میں جنگ وجہاد کی جو وصف نگاری متنبی نے اختیار کی ہے اس سے جنگ وجہاد کی عظمت کا تقریباً وہی تصور پیدا ہوتا ہے جو خوشحال کے کلام سے ابھرتا ہے۔ بطور نمونہ یہاں میں متنبی کے صرف ایک قصیدے کا حوالہ دیکر اس کے منتخب اشعار کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔

اس قصیدے کا مطلع ہے۔

واشقیٰ بلاد اللہ ما لروم اھلھا....

ترجمہ:۔ (۱) خدا کے شہروں میں سب سے بدنصیب شہر وہ ہے جس کے باشندے رومی ہیں اور اس میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ممدوح سیف الدولہ تیرے مجد وشرف کا منکر ہو۔

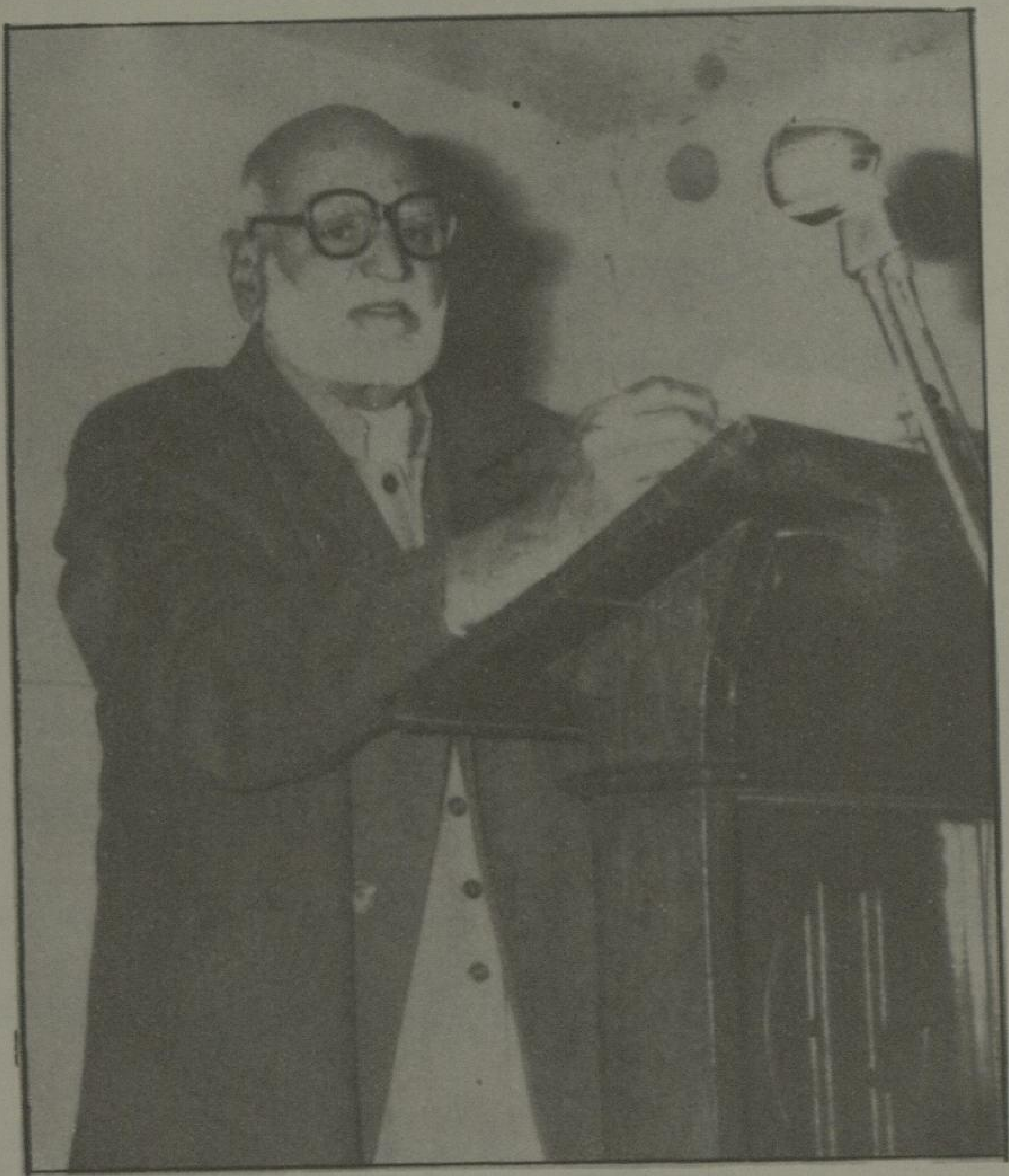
(۲) تونے ان پر سخت غارتیں ڈالی ہیں یہاں تک تونے ان کو ایسی حالت میں چھوڑا ہے کہ مقام فرنجہ کے پیچھے کی پلکیں بھی جاگتی رہتی ہیں (یعنی لوگ ایسے خائف ہو گئے ہیں کہ فرنجہ سے دور دراز مقام کے لوگ تیرے حملہ کے ڈر کی وجہ سے جاگتے رہتے ہیں)

(۳) روم کے شہر خون میں رنگے ہوئے ہیں اور قوم بچھڑی ہوئی ہے۔ گویا وہ شہر مساجد ہیں اگرچہ لوگ دراصل سجدہ کرنے والے نہیں ہیں۔

(۴) اور ان کے بلند قلعے جو پہاڑ کی چوٹیوں پر واقع ہیں۔ تیرے گھوڑے انکی گردنوں کا ہار بن گئے (یعنی انہوں نے قلعوں کا محاصرہ کر رکھا تھا۔)

(۵) لقان کی لڑائی کے دن تیرے گھوڑے ان پر آندھی کی طرح ٹوٹ پڑے۔ اور وہ ان کو قلعہ ہنزیط پر ہنکا کر لے گئے۔ یہاں تک کہ شہر گورے گورے قیدیوں کی وجہ سے سفید ہوگیا۔

یاد رہے کہ یہ قصیدہ متنبی نے اس وقت پڑھا جب سلمان ایک مرتبہ عارضی طور سے رومیوں سے شکست کھا گئے تھے۔ لیکن دوسری مرتبہ بڑی سخت لڑائی کے بعد فتحیاب ہوئے ہیں سمجھتا ہوں کہ نمونے کے لئے یہ اشعار کافی ہیں خوشحال خان کا جتنا کلام میرے مطالعہ میں آیا ہے اس کی بنا پر مجھے خوشحال میں متنبی کا جلال اور جوش سب سے زیادہ نظر آیا ہے۔ ممکن ہے میرا یہ تاثر سطحی ہو۔ لیکن اگر میں اپنے مقالے کے ذریعے کسی پشتون عربی دان محقق کو وسیع تر اور عمیق تر مطالعہ کی طرف متوجہ کر سکوں تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی کیونکہ عالم اسلام میں اس وقت اپنی حیات ذہنی کے تسلسل اور وحدت کی جو آرزو اور جستجو جاگ اٹھی ہے اس کے لئے مختلف ملکوں اور علاقوں کے شعراء و بلغا میں ذہنی و روحانی وحدت کی نشاندہی یقیناً ایک مفید اور تعمیری کام سمجھا جائے گا۔



قاضی عبدالحلیم اثر افغانی

قاضی عبدالحلیم اثر افغانی

نابغۂ عصر خوشحال

شیخ محی الدین ابن عربی نے چالیس جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے ر فتوحات مکیہ۔ امام عبدالوہاب شعرانی اس کا خلاصہ تیار کیا ہے۔ جس کا نام ہے الیواقیت والجواہر فی عقائد الاکابر۔ یہ کتاب مصر میں چھپی ہے۔ اس کے اکتالیسویں باب میں لکھتے ہیں ر

اس دنیا میں جو بھی شخص کسی نہ کسی صورت میں مخلوق خدا کی خدمت کیلئے اپنی زندگی وقف کر دے خلوص اور محبت سے اس میں کمال حاصل کرے تب قدرت خداوندی اس کی خدمات کا صلہ اس صورت میں دے دیا کرتی ہے کہ دنیا میں اس کا نام باقی رہ جاتا ہے۔

امام شعرانی حوالہ دیتے ہیں کہ نوشیروان نے عدل سے کام لیا اس کا نام باقی رہ گیا ہے حاتم طائی نے سخاوت کی آج تک یاد کیا جاتا ہے۔ امیرالمؤمنین عمر فاروق باوجود تیس ہزار شہروں کے فاتح ہونے کے جب بیت المقدس داخل ہوتے ہیں۔ تو ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ان کا غلام اونٹ پر سوار ہے۔ اور وہ اس کی مہار تھامے ہوئے ہیں۔ یہ ان کی شجاعت اور عدالت کی مثالیں ہیں جنہوں نے ان کے نام کو زندہ رکھا ہے خالد بن ولید کا نام باقی ہے کہ وہ سیف اللہ تھے۔

ان مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس دنیائے رنگ و بو میں جس کسی بھی شخص کا نام باقی رہ گیا ہے۔ اس کی وجہ ان کی زندگی کے کارنامے ہوتے ہیں۔ ان کے افکار ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ ہر ایک بڑا آدمی کسی نہ کسی ملک اور کسی نہ کسی قوم میں پیدا ہوتا ہے لیکن جب اس کا نام زندہ رہ جاتا ہے تو اسے آفاقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور ایسے آفاقی نوعیت کے حامل مشاہیر ہزاروں میں سے ایک اور

صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ایک فارسی شعر ہے۔

سالہا باید کہ تا صاحب دلے پیدا شود　　　بایزید اندر خراسان یا اویس اندر قرن

اور ایسے ہی صاحب دل۔ آفاقی مشاہیر میں سے ایک عظیم دل رکھنے والی مشہور شخصیت خان علیئون مکان خوشحال خان خٹک کی ہے۔ وہ پاکستان کے اس خطہ میں پیدا ہوئے جہاں خٹک قوم کے لوگ آباد ہیں۔ یہیں پھلے بڑھے یہیں ان کا مزار بنا۔ ظاہر ہے اس خطہ میں لاکھوں خٹک آباد ہیں۔ مگر خوشحال خان خٹک کو جو شہرت دوام حاصل ہوئی ہے اور ان کا نام باقی رہ گیا ہے وہ ان کے اُن امتیازی کارناموں کی وجہ سے ہے جو اپنی زندگی میں اپنی تلوار اور اپنے قلم سے انجام دے گئے ہیں اور انہیں صاحب سیف و قلم کہا جاتا ہے۔

قوموں کا ایک تاریخی مزاج ہوتا ہے وہ ہر ایک ایسے بڑے آدمی کو بابا کا لقب دیتے ہیں۔ یہ ایک اعزازی لقب ہے جس سے خوشحال خان کو خوشحال خان بابا کہا گیا ہے۔ اس کی مثالیں میری اور آپ کی زندگی میں بھی موجود ہیں۔ ترکی زبان میں باپ کو اتا کہتے ہیں جس نے یورپ کے مرد بیمار ترک قوم کو نئی زندگی بخشی آج ترک عوام اس مصطفےٰ کمال کو کمال اتاترک کہتے ہیں (ترکوں کا باپ) جس طرح قائداعظم محمد علی جناح کو بابائے قوم کہا جاتا ہے اس لئے کہ آپ نے برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک مملکت پاکستان بنائی۔

پشتو بولنے والے لوگ　　　غوث الدہر۔ قطب بنیاد دل۔ قطب قلندر عبدالرحمان مہمند سربنی کو رحمان بابا کہتے ہیں۔ ان کی آفاقی تعلیمات کی وجہ سے جو بنیادی حقیقتوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔

وادی پشاور ضلع مردان علاقہ جلالہ میں عبداللہ ابن عبدالرحمان ابن برہان الدین کا مزار ہے۔ انہی عبداللہ کو مدے بابا کہتے ہیں۔ اپنے عہد میں سلسلہ چشتیہ کے قطب الاقطاب بھی تھے۔ اور بلوچستان کے قلات ڈویژن کے علاقہ مدکا سے آنے والے یوسف زئی قوم کے قائد بھی اس لئے ان کو مدے بابا کہتے ہیں۔ ایک پشتو شاعر نے کہا۔

مدے بابا پہ جلالا دے　　　ختلے ستورے د صبا دے

(مدے بابا کا مزار جلالا میں ہے۔ ان کی مثال صبح کے درخشندہ ستارہ کی ہے)

یہ ایک مثال ہے۔ پشتو بولنے والے اس شخصیت کو بابا کہتے ہیں۔ جن کی مثال صبح کے درخشندہ ستارہ کی ہو اور خوشحال خان بھی بابا ہیں۔ درخشندہ ستارہ ہیں ظاہر ہے ستارہ صبح میں آفاقیت ہوتی ہے۔ خوشحال خان بابا بھی آفاقی عظمت رکھنے والے ہیں اور وہ اپنے افکار کی آفاقی نوعیت کے اعتبار سے ہر اس شخص کا بابا ہے جو اس کی تعلیمات سے روشنی حاصل کرے۔ خوشحال خان بابا کا ایک شعر ہے۔

کرلانی خہ نور شراب سکلی نہ دی　　دا مستی وارہ پہ جام الستی کا

(خوشحال خان خٹک کرلانی نے کوئی دوسری شراب نہیں چکھی اس کی تمام مستی جام الست کی ہے۔)

اشارہ ہے آیت الست بربکم قالوا بلیٰ کی طرف۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوشحال خان بابا کی روح۔ دل۔ ذہن اور فکر اسلامی سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھیں۔ ان کے کلام میں جو بنیادی حقیقتیں بیان کی گئی ہیں وہ اسلامی ہیں اور دین اسلام سے عقیدت رکھنے والوں کے لئے خان بابا کے کلیات میں وہ سب کچھ مل جاتا ہے۔ جو ملت اسلامیہ کے عروج اور زوال دونوں کی حقیقت سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ قوموں کے عروج کی نشانی ہے۔ اتفاق۔ زوال کی نشانی ہے۔ بے اتفاقی۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے۔ اسلام نے اسے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ فرمایا۔ و لا تفرقوا۔ تفرقہ پردازی مت اختیار کرو۔ فتفشلوا فتذھب ریحکم اگر آپ بکھر گئے تو دوسرے قوموں پر آپ کا جو رعب داب ہے آپ کی جو ہوا بندھی ہوئی وہ چلی جائیگی۔ خوشحال خان بابا نے اس اسلامی بنیادی حقیقت کی ترجمانی کی ہے انہوں نے فرمایا۔

ادلسونہ چہ خپل سند وبلہ وکا
بادشاهان ورتہ سجود کاندے اختیار

قومیں جب ایک دوسرے سے سند یعنی اتفاق کرلیتی ہیں تو زمانے کے بادشاہ ان کے سامنے سربسجود ہوجاتے ہیں۔ خان بابا نے جو فرمایا ہے قرآن کی ترجمانی کی ہے ولا تفرقوا۔ ایک ایسی بنیادی حقیقت بیان کی ہے جس کی زندہ مثال پاکستان کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ برصغیر کے مسلمان جب ایک ہوگئے انگریز جیسی قوم اور ہندو

جیسے اکثریت و طاقت والے لوگ مسلمانوں کے سامنے سربسجود ہو گئے۔

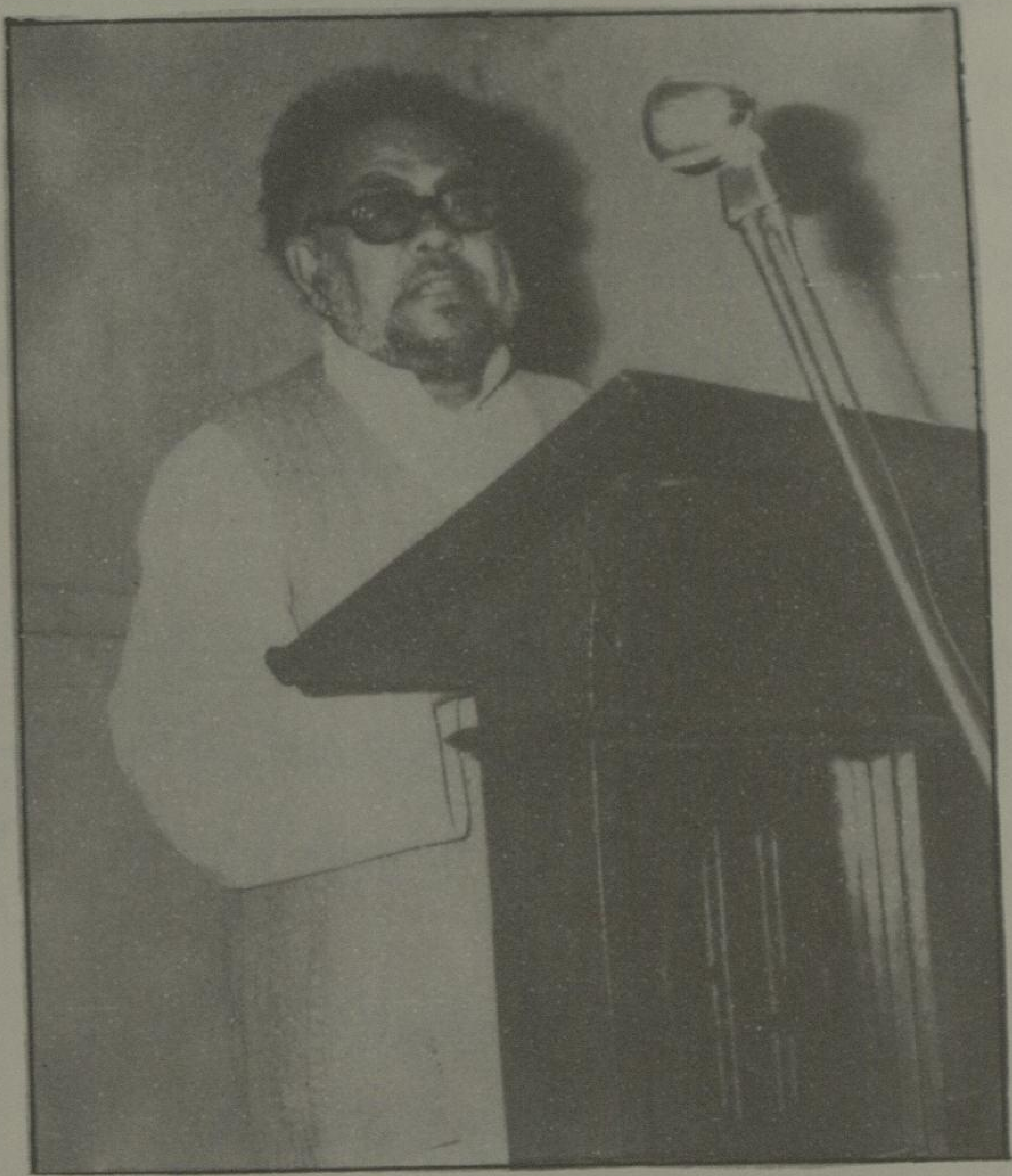
درحقیقت ہمارے لئے بہتر طریقہ اور موجودہ بین الاقوامی حالات کے پیش نظر وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم پاکستان کے رہنے والے خوشحال خان بابا کے اس شعر

اولسونہ چہ جل سند دبلہ دکا   بادشاهان درتہ سجود کاندی اختیار

کو اپنی قومی زندگی کا طغرٰی بنالیں۔ خان بابا نے اولس نہیں کہا۔ اولسونہ کہا ہے۔ اولس ترکی زبان کا لفظ ہے۔ بمعنی قوم و قبیلہ اولسونہ جمع کا لفظ ہے ہم پاکستان کے سات کروڑ مسلمان چاہے جس قوم و قبیلہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ تمام اولسونہ درس خوشحال پر عمل پیرا ہو کر ایک ہو جائیں تو دنیا کی بڑی سی بڑی طاقت ہمارے سامنے سربسجود ہو گی۔ اور جب اس حقیقت کے پیش نظر کہ پاکستان اسلامی نظریاتی مملکت ہے نظریہ اسلام و اتحاد کو آگے بڑھا کر عالم اسلام کی ایک متحدہ اسلامی قوت کی تشکیل کے لئے کام کریں تو مسلمانوں کے اسلامی وجود کی بقاء کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

ہم خوشحال خان بابا کا سال منا رہے ہیں۔ میرے خیال میں خان بابا کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کو صاحب سیف و قلم اور ایک بڑے مفکر، نابغہ عصر اور بقول حکیم الامت علامہ محمد اقبال مرحوم کے جنہوں نے خوشحال خان بابا کو حکیم ملت افغانیان کہا تھا کے طور جانیں اور ان کی تعریف کرنے کے درس خوشحال پر عمل کر کے ہم پاکستان کی اولسونہ ایک ہو جائیں۔ قاعدہ ہے ہر ایک آدمی اپنے فائدہ کی سوچتا ہے۔ ہم یعنی پاکستانی ملت کے ہر ایک فرد کا اسی میں فائدہ ہے کہ ہم ایک ہو جائیں۔

شہید ملت لیاقت علی خان مرحوم کے ساتھ بحیثیت ممبر آل انڈیا مسلم لیگ دو سال دہلی میں رہ کر میں نے کام کیا تھا۔ وہ فرماتے تھے ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے پاکستان کی صورت میں ایک پناہ گاہ حاصل کرنا چاہتے ہیں شہید ملت کی بات کی صداقت آپ نے دیکھی ہندوستان کے لٹے ہوتے مسلمانوں کو پاکستان میں پناہ ملی۔ آج افغانستان کے لٹے ہوئے مسلمانوں کو پاکستان میں پناہ مل رہی ہے۔ اس لئے میں عرض پیش کرنے چلا ہوں کہ آیئے ہم پاکستان کی اولسونہ درس خوشحال پر عمل پیرا ہو کر ایک ہو جائیں اور اس مسلمان قوم کی پناہ گاہ کو تباہ ہونے سے بچائیں۔ درس خوشحال عروج اور زوال کا فلسفہ ہے۔ اس فلسفہ عروج۔ اتحاد و اتفاق کو فروغ دینے کا عہد کیجئے۔



پروفیسر تقویم الحق کاکاخیل

پروفیسر سید محمد تقویم الحق کاکاخیل

خوشحال خان کا تصورِ جمال

ہر فنکار کے ذہن میں شعوری یا غیر شعوری طور پر حسن کا ایک تصوّر ہوتا ہے۔ اس تصوّر سے اس کے فن کو معیار بھی ملتا ہے اور نکھار بھی، اور اس تصوّر کی ہمہ گیری اور گہرائی فن کو قبولیت اور فنکار کو عظمت بخشتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہر بڑا فنکار اپنی دنیا کو اسی تصوّرِ جمال سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر کرتا ہے اور اپنے معاشرے کی جمالیاتی حس کو ایک خاص رخ دیتا ہے۔ راہ ورخ کے اس تعیّن سے کلچر تہذیب اور ثقافت میں ایک تشخص پیدا ہوتا ہے۔ اور تہذیبیں ایک دوسرے سے ممتاز ہوتی جاتی ہیں۔ اس طرح ہر بڑا فنکار پورے معاشرے کی تہذیب وثقافت پر اثر انداز ہی نہیں ہوتا اس کے ارتقائی عمل کی اساس بھی بنتا ہے۔

احساسِ جمال تہذیب وثقافت کی شستگی وشائستگی کا پیمانہ ہے جس معاشرے میں جتنا حسن کا احساس لطیف اور وسیع ہوتا ہے۔ اتنا ہی اس معاشرے کو زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے۔ خوشحال خان کو اس کا احساس ہے، بلکہ وہ احساسِ حسن کو ہی انسانیت سمجھتا ہے۔

گل وسری د کړه چه خوشحال په یوه گل ښی
غره غوایه نظر کله د گل په بشتاره کړه

(پھول انسان کو دو۔ کہ ایک پھول سے خوش ہوجاتے۔ پہاڑی بیل پھولوں کے ڈھیر پر کب نظر ڈالتے ہیں)

مگر یہ احساسِ جمال جو اتنا فطری اور اتنا اہم ہے آج تک پوری طرح منطق و فلسفہ کی گرفت میں نہیں آسکا۔

جمالیات کی اصطلاح اٹھارویں صدی عیسوی کی پیداوار ہے۔ اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ لیکن "جمال" صدیوں سے فکر ونظر کا محور رہا ہے۔ خصوصاً جب سے یونانیوں

نے علوم وفنون کی تدوین و تشکیل شروع کی ہے۔ سقراط۔ افلاطون۔ ارسطو اور ان کے متبعین نے جگہ جگہ مختلف موضوعات کی مناسبت سے حسن وجمال کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ خیالات نہ واضح ہیں۔ نہ مربوط۔ اور ان کو ایک مدّون علم کا نام نہیں دیا جا سکتا پھر بھی ان میں تشخص وتعیّن کی ایک شعوری کوشش پائی جاتی ہے۔

فلاسفۂ یونان کے یہ افکار اس طرح منتشر حالت میں عربی فلسفہ میں منتقل ہوئے ہیں۔ اور وہاں سے فلاسفۂ متصوفین کی کتابوں میں۔ تصوّف میں حسن نے وحدۃ الوجودی تصوّرات کے ساتھ مل کر وحدۃ حسن کا رنگ لیا ہے اور پھر یہ رنگ پوری فارسی شاعری پر چھا گیا ہے۔ حسن دراصل "حسن مطلق" ہے باقی تمام حسن کے مظاہر ہیں اور جہاں جہاں جیسے جیسے اس نور کی جھلک نظر آجاتی ہے دل جھک جاتے ہیں اور روح جھوم اٹھتی ہے۔ محبت جو حسن سے وابستگی کا نام ہے۔ صرف اسی ایک حسن سے کی جاتی ہے اور اسی سے ہو جاتی ہے۔ باقی ہر محبت حقیقت نہیں مجاز ہے اور منزل نہیں رہ گزر ہے۔ بقول خوشحال خان

د مجاز عاشقي واړه حقیقت دے

و هغې تہ ئے زینه اینبي د صُورت دے

(مجازی محبت دراصل حقیقت سے محبت ہے۔ اسی کے لئے جسم کو ایک زینہ بنایا جاتا ہے)

خوشحال خان اس زمانے کے مروجہ علوم کا ماہر تھا۔ ان علوم میں منطق فلسفہ اور تصوّف بھی شامل تھے۔ اور یہ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس حد تک جمالیات کے مروجہ نظریے خوشحال خان کو معلوم تھے اور ان کی اہمیت سے واقف تھا۔ اگر اس کے کلیات یا کتابوں میں جمالیات کی طرف واضح اشارے نہیں تو وہ اس زمانے کے علم فلسفہ میں بھی نہیں۔ اور علامہ اقبال کے مجموعۂ کلام میں بھی نہیں۔ جو بلاشبہ موجودہ جمالیاتی نظریات سے کماحقہٗ آشنا تھے۔ شاعر شعر کہتا ہے۔ فلسفہ کی کتابیں نہیں کہتا ___ اور اس کی پیغام رسانی کا انداز اور ہوتا ہے۔

خوشحال خان کے تصوّر جمال کو جمالیات کے موجودہ پیمانوں سے ناپنے میں ذرا دقت پیش آئیگی۔ لیکن آپ کسی بھی فلسفے کو سائنس کی طرح متعیّن پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سنگلاخ سرزمین کا یہ عظیم فنکار اپنے معاشرے کو کس طرف لے جانا چاہتا ہے۔

(۲)

حسن کیا ہے؟ اس سیدھے سے سوال کا جواب مشکل بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ حسن

سرور انگیز بھی ہوتا ہے اور نظر افروز بھی۔ وہ جسم سے منزّہ بھی ہے اور جسم سے وابستہ بھی۔ اس کی پہچان فطری ہے اور اس پہچان کی تحلیل نے فلسفہ و فکر کی بے شمار راہیں کھول دی ہیں۔ سقراط (۴۷۰ق م - ۳۹۹ق م) کے خیال میں حسن ذات الٰہی کا مظہر ہے۔ اور تناسب و ہم آہنگی اس کے ناگزیر اجزا ہیں۔ افلاطون کی نظر میں "یہ خیر محض" کا فیضان ہے۔ اور اس کو محسوس کرنے کے لئے ذہن کی رفعتیں ضروری ہیں۔ حسین ترین شے وہ ہے جو رفیع ترین ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ ارسطو (۳۸۴ق م - ۳۲۲ق م) افلاطون کے نظریے کو عقلیت کا رنگ دیتا ہے۔ لیکن اس سے بات بدلتی نہیں حسن پھر بھی ایک مظہر رہ جاتا ہے۔ اور حسین صرف عقلِ کل۔ خدا یا روح کائنات کی ذات۔

ظاہر ہے متصوفین کو اس فلسفیانہ تصوّر کے اپنانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ وہ بھی ذات الٰہی کو مظہر جمال۔ خیر محض اور وجود کائنات سمجھتے ہیں۔ اور ان کے ہاں بھی یہ باقی تمام موجودات اس کے عکس۔ ظل یا پرتو ہیں۔ خوشحال خان اس حد تک اپنے پیش روؤں کا ہمنوا ہے۔

چه په زړه ئے د وحدت ډیوه شی بله
تجلّی به ئے له مخه ځی آفتاب شی

(جس کے دل میں وحدت کا چراغ جل اٹھتا ہے۔ اس کے چہرے سے نور بکھرنے لگتا ہے۔ اور خود آفتاب ہو جاتا ہے)

اس کے ہاں حسن صرف مظہر جمال ہی نہیں۔ بلکہ حسن بخشی اس جمال مطلق کی ایک فعلیت ہے اور ہر حسین کو وہی حسن سے نوازتا ہے۔

لکه خدائے چه د یار حسن بے نظیر کړه
هسے ما د زړه په سر باند تصویر کړه

(جیسے خدا نے میرے محبوب کو بے نظیر بنایا ہے۔ اسی طرح میں نے بھی اپنے دل میں اس کی تصویر کھینچتی ہے)

اس طرح حسن کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ایک وہ حسن جو مطلق ہے منزّہ ہے۔ دائمی ہے۔ ازلی و ابدی ہے اور موجودات پر اپنا پرتو ڈال کر اس کو "حسین" بناتا ہے۔ اور دوسرا وہ "حسن" جو مجسّم ہے مصوّر ہے۔ اور اس کو حسین بنایا گیا ہے۔ یہ پہلا حسن باقی ہے اور یہ دوسرا حسن فانی۔ اس فانی "حسن" کا تناسب و ہم آہنگی اور اس کی حسینت ایک محدود وقت تک ہے۔ اور پھر نہیں۔ گویا اس کی "حسینت"

ایک باہر سے آیا ہوا "نور" ہے

حسن کی اس دوسری قسم کو "فلاطینوس (۲۰۴ء – ۲۷۰ء) نے اپنے فلسفے کی اساس بنایا ہے۔ "حسن تناسب وہم آہنگی کا نام نہیں۔ بلکہ وہ نور ہے جو چیزوں کے تناسب وہم آہنگی کے اوپر چمکتا ہے۔ اس لئے یہ نور زندہ چیزوں پر ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد نہیں"۔ خوشحال خان کے ہاں یہ تصوّر زیادہ واضح ملتا ہے۔

وارہ نور د نمر دے هم د ننه هم د باندِ
هر چرته دا نمر دے په هر ښهر په هر کلی

(یہ سب خوبصورتی تو آفتاب کی روشنی ہے "اندر" بھی اور "باہر" بھی ہر جگہ یہی ایک روشنی ہے، ہر شہر میں اور ہر قریہ میں)

یہ "اندر" کا نور فلاطینوس کے تصوّر پر ایک اضافہ ہے جس کی تشریح کچھ آگے جا کر کی جائیگی۔ بنیادی تصوّر وہی ہے کہ یہ "حسن" فانی بھی ہے اور زوال پذیر بھی۔ اور اس سے آپ "لطف" تو لے سکتے ہیں۔ "وابستگی" قائم نہیں کر سکتے۔ یہ تصوّر خوشحال خان کی پوری شاعری پر چھایا ہوا ہے۔ اور جہاں بھی وہ حسن وجمال کی لذت انگیزی میں کھو جاتا ہے۔ یہ احساس جاگ اٹھتا ہے۔

په باغ وراغ کښے گلونه وارہ   یو گل به نه وی بیا ترا هارہ
هستی دا هسے نیستی دا هسے   ژاړه حیرانه بلبله ژاړه

(باغ وصحرا میں یوں پھول کھلتے ہیں۔ اور پھر اساڑھ تک ایک بھی نہیں رہتا۔ یہ ہستی ہے اور یہ نیستی ہے روئیے اے حیران بلبل! روئیے)

چه ته ئے د دینے په سترگو وارہ   بقاءئے نه شته باندِله ویا ره
هغه چه تا وینی هغه باقی دے   فانی په څه کړے باقی وغواړه

(یہ جو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو یہ سب فانی ہیں ان پر کیا فخر کرنا ہے وہ جو تمہیں دیکھ رہا ہے وہ باقی رہنے والا ہے اس کو چھوڑو۔ اس کو تلاش کرو)

۳

آگسٹائن (۳۵۳ء – ۴۳۰ء) نے کہا ہے۔ "ہر مادی چیز کا حسن اس کے حصوں کا تناسب اعتدال اور رنگ کی نظر افروزی ہے"۔ رنگ کا یہ تصوّر خوشحال خان کے ذہن پر بھی چھایا

ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے پورے مجموعۂ شعری میں کہیں بھی "مادی حسن" رنگ کی نظر افروزیوں کے بغیر نہیں پایا جاتا حسن انسانی کا سراپا ہو۔ یا مناظر فطرت کی تصویر۔ خوشحال خان کے ہاں "رنگ" کا تذکرہ ضرور لیگا۔

د گلونو ھار یہ غاړه د دلبرو　　　شرموی لال و یاقوت او د لالا ھم

ارغوان که بنفشه که شقائق دی　　　زیبائی لوی یو ځائے جدا جدا ھم

(پھول کے ہار حسینوں کے گلے میں لعل، یاقوت اور گوہر تابدار کو غیرت دلاتے ہیں۔ ارغوان ہوں۔ بنفشہ ہو۔ یا گل لالہ ہوں۔ مل کر بھی خوبصورت ہیں اور الگ الگ بھی۔)

دیکھئے ایک ساتھ تین تین چار چار رنگوں کی ہم آمیزی ہے۔ اور اس آمیزش سے ہی نہیں وہ ان کے باہم امتیاز سے بھی لطف لیتا ہے ___ بلکہ میدان جنگ میں بھی رنگوں کا حسن اس کے احساسات پر حاوی نظر آتا ہے۔

سپینے تورے ئے گلگونے کړے په وینو

په اهاړ کښے شگفته شو لاله زار

(انہوں نے اپنی سفید چمکتی تلواریں خون سے سرخ کیں اور اساڑھ کے مہینے میں گل لالہ کے کھیت کھل اٹھے)

مگر وہ جو بات اگستائن کے ہاں نہیں۔ اور خوشحال خان کے ہاں ہے وہ "رنگ" کے ساتھ "بو" کی ضرورت ہے۔ خوشحال خان کے ہاں صرف رنگ ہی نہیں "بو" بھی حسن کے لئے ضروری ہے جس کو آپ "حسن سیرت" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

که د رنگ خوبی ئے شته بوئے ئے نه کوی

د کاغذ گلونه هم د گل په شان شی

(اگر رنگ کی خوبی ہے۔ تو خوشبو کہاں ہے؟ کاغذ کے پھول یوں تو پھول کی طرح لگتے ہیں)

چا دے په هر چا باندِ نسکارده　　　د گل یا بوئے دے یا ئے ننداره ده

چه نه ئے بوئے وی او نه ئے رنگ وی　　　گل به ئے نه بولم د چا د پاڅ چاره ده

(یہ بات سب پر عیاں ہے۔ پھول میں یا خوشبو ہوتی ہے یا نظارگی اگر خوشبو بھی نہ ہو اور رنگ بھی نہ ہو تو پھر پھول نہیں جو پالیوں کا چارا ہے)

(۴)

"حسن کو اہل نظر حسن نظر کہتے ہیں۔ اور حسن پر ہی کیا موقوف۔ کچھ لوگ تو ساری دنیا کو ہی حلقہ دام خیال سمجھتے ہیں۔ اسی کو نظریہ موضوعیت" کہتے ہیں جس کو ہندو فلاسفر تو ایک مدت سے پیش کر رہے تھے۔ مغربیوں میں بارکلے (۱۶۸۵ء-۱۷۵۳ء) نے زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد لوگوں نے اسے صرف حسن تک محدود رکھا ہے اور فارسی شعراء نے تو اپنے محبوب کو رہا سمجھایا ہے کہ یہ چشم مجنون ہے جس نے "لیلیٰ" میں محبوبیت پیدا کی ہے۔ ورنہ وہ بچاری تو یونہی سی تھی۔ مگر اکثر فلاسفہ حسن کو بذات خود ایک حقیقت سمجھتے ہیں۔ اور وصف الوجودی فلاسفہ و متصوفین تو اس کو "حقیقت مطلق" اور وجود مطلق مانتے ہیں۔ اس فلسفے کو معروضیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دراصل صحیح بات وہی ہے جو افلاطون نے کہی ہے۔ کہ حسن کو محسوس کرنے کے لئے ایک ذہنی رفعت کی ضرورت ہے۔ حسن موجود ہے لیکن اس کے لئے جو اسے محسوس کر سکتا ہے۔ وہ اس معنی میں موضوعی ہے کہ ہر شخص اس کو اندرونی صلاحیت سے محسوس کرتا ہے۔ اور اس معنی میں معروضی کہ وہ محسوس کئے جانے کے لئے خارجی طور پر موجود ہے۔ یہ اندرونی صلاحیت کہاں سے آتی ہے؟ یہ انسان کے اندر خود موجود ہے یا باہر سے اس کا فیضان ہوتا ہے؟ اس کو جلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے یا یہ ہر فطری حسن کی طرح قوت کار لیکر آتی ہے۔ خوشحال خان کے ہاں یہ صلاحیت وہی نور ہے جس نے کائنات کو "حسینیت" بخشی ہے۔

ډیر دي کتابونه مشتمل په ډیرش حرفونو
کل وارړه که ګوري لا الف دي زړه ولی
وارړه نور د نمود ے هم د ننه هم د باندِ
هر چرته دا نور د ے په هر ښهر په هر کلی

کتابیں بہت سی ہیں جو تیس حرفوں پر مشتمل ہیں۔ لیکن دیکھو تو یہ سب حرف الف سے بنے ہیں۔ یہ سب آفتاب کی روشنی ہے "اندر بھی" اور "باہر" بھی۔ ہر جگہ یہ نور ہے ہر شہر میں اور ہر قریہ میں)

اور جہاں بھی حسن نظر آتا ہے وہ اسی نور کی روشنی میں نظر آتا ہے۔

بے دیارہ لہ مخہ نہ وینم پہ کسی
دوا پرہ کسی ملک وغرپہ شعلو کسی

دیار کے چہرے کے سوا کوئی چیز آنکھوں سے نہیں نظر آتی۔ تمام دنیا کے لوگ
سورج کی روشنی سے دیکھتے ہیں)

یہ اندرونی حسن جو اپنے "بیرونی حسن" کا نظارہ خود کراتا ہے انسان کی "سرشت" میں ہے۔ اوراس کا مرکز "قلب" ہے جس کو "فیضان روح" سے جلا ملتی ہے۔ یہی انسان جلال بھی پیدا کرتا ہے اور جمال بھی۔ حسن بھی پیدا کرتا ہے اوراس کا مشاہدہ بھی کرتا ہے یہ سب کچھ ہے تاہم یہ کچھ بھی نہیں۔ اوراس مرحلے پر پہنچ کر خوشحال خان اور علامہ اقبال کے افکار بالکل ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

تند رھم زما لہ ذاتہ نہ پیدا شے	پہ سپین ذرہ کنبے باران پسینے او یم
دکونینو ننداره د ذره پہ عین	دویلنی والی پہ دود کوم تا تہ اودہ یم
ھم م شیزھم م ناشیز کہ پہ میدان کنبے	زہ خوشحال پہ خان خبر نہ یم چہ څہ یم

(بجلی بھی میری ذات سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر دل کی صفائی ہیں بارش کا صاف قطرہ نظر آتا ہوں۔ کونین کے نظارے دل کی آنکھوں سے جاگتے ہوئے کرتا ہوں اور تمہاری نظروں میں سویا ہوا ہوں۔ مجھے "شے" بھی بنا دیتا ہے اور "لاشے" بھی بنا دیتا ہے۔ میدان کار میں مجھ خوشحال کو معلوم نہیں کہ میں کیا ہوں)

انسان کی یہ سرشت خاک و آب سے مرکب نہیں اسکی ترکیب کوئی اور ہے۔

دَ عنصر د صنائع فکر ونہ پریږدہ
کہ پوھیږے شرع نور لری ترکیب
(عناصر اربعہ اور صنعتوں کی فکر چھوڑ دو۔ سمجھتے ہو۔ تو شرع میں ترکیب کچھ اور ہے)

۵

خوشحال خان نے جہاں بھی حسن کا ذکر کیا ہے حسن فطرت کا ذکر کیا ہے۔ وہ انسانی جسم میں ہو یا باغ وراغ میں۔ انسانی فکر اور انسانی ہاتھوں کا تخلیق کردہ حسن اس کی نظروں میں نہیں ہے۔ اس لئے جمالیاتی فعلیت کے متعلق ہم اس کے نظریات جمع نہیں کر سکتے۔

اس کے ہاں انسانی فکر کی حسین ترین تخلیق شعر ہے۔ اور اس میں وہ الوہی فیضان کا بھی قائل ہے اور فنی ریاضت کا بھی۔ معانی و افکار کا فیضان عالم بالا سے ہوتا ہے۔

نہ پہ ذکر نہ پہ فکر را بر سیږی
ناکہانہ لکہ اوری بشکال

(نہ ذکر سے شعر سامنے آتا ہے نہ فکر سے۔ یہ اچانک برس پڑتا ہے جیسے برسات کی بارش)

اور الفاظ کی تلاش و ترتیب محنت و ریاضت سے۔

خلق خوښ په خوب اوده وی دے بے خوبه
دپالنګ د پاسه خوب وی ہر محال!
پټ په پټه وبله اوړی تر صباحه
د ښہ لفظ و ښہ مضمون په اتصال؟

(لوگ میٹھے خواب میں ہوتے ہیں اور یہ شاعر بے خواب ہوتا ہے۔ پلنگ پر سونا اس کے لئے محال ہوتا ہے۔ چپکے چپکے کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ صبح تک۔ تاکہ اچھے لفظ کو اچھے مضمون سے ملا سکے)

اور اس کے ہاں انسانی ہاتھوں کی حسین ترین تخلیق وہ مناظر ہیں جہاں (مست ہاتھیاں خونی مزری "نور وکبلی) مست ہاتھی اور خونی شیر تلواریں کھینچے غنیم سے انتقام لے رہے ہوں۔

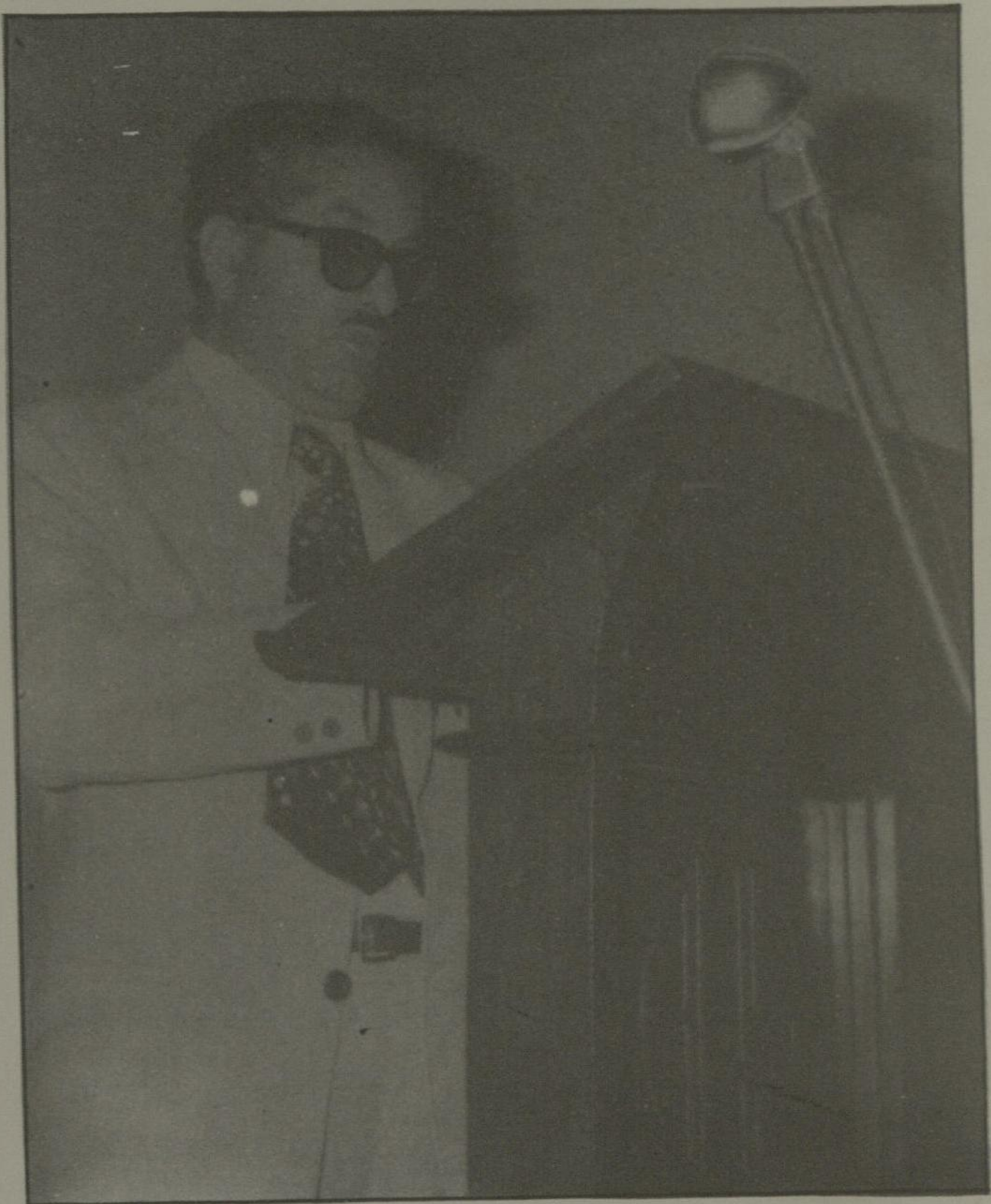
پښتنو ځلمیو بیا لاسونہ سرہ کړل
لکہ باز منګلے سرے کړه په ښکار

سپینے تورے ئے ګلګونے کړے په وینو
په اهار کښے شګفته شو لاله زار

(پشتون جوانوں نے پھر خون سے حنا بندی کی۔ جیسے باز شکار کے خون سے اپنے پنجے رنگ لے۔ انکی سفید تلواریں خون سے "گلگون" ہو گئیں اور اساڑھ میں گل لالہ کے کھیت کھل اٹھے)

لہ هیبتہ آسمانونہ پہ لرزہ شو　　چہ ډنو روخرپا واؤریدہ بهرام
ڈٹوپکو دو یشتلو پہ لوګیو　　یوا تم آسمان پیدا شو کیو د خام
دختکو نیزے ھسے تلے پہ نورو　　لکہ ستن پہ خیمہ درومی دخیّام

رہیبت سے آسمان میں بہرام ستارہ لرزنے لگا۔ جب اس نے تلواروں کی کڑک سنی۔ بندوقوں کے دھوئیں سے ایک آٹھواں آسمان تعمیر ہوا۔ نیلا نیلا۔ دھواں۔ دھواں اور خٹکوں کے نیزے زرہ بکتروں میں سے یوں گزرنے لگے۔ جیسے خیمہ ساز سوئی سے خیمے سی رہے ہوں)
زندہ قومیں اپنی رفعتیں اسی طرح تخلیق کرتی ہیں۔



پروفیسر محمد نواز طائر

پروفیسر محمد نواز طائر

جغرافیہ دان خوشحال

ہر مفکر کے ذہن پر خواہ وہ فلسفی ہو، ادیب ہو یا شاعر، سائنسدان ہو یا مصوّر، اپنے ماحول کا بڑا عمیق اثر ہوتا ہے اور اسی اثر کے زیرِ سایہ وہ اپنے افکار، اشعار، نگارشات اور فن دنیا کو پیش کرتا ہے۔ انسانی ماحول کی وسعت اور تنگی انسان کے اپنے فکری استعداد کے مطابق ہوتی ہے۔ ایک عالی مرتبت مفکر اور ژرف نگاہ صاحبِ نظر کیلئے اس کے محدود و مسدود ماحول میں بھی دنیا جہان کے راز موجود ہوتے ہیں ؎

خائستہ عالم خانہ دہ پرے تکئی ہے وارہ ستا دی

ددنہ کوری حیرا نیبزی چہ دچا ستر کے بینا دی

(ترجمہ:- یہ عالم خانہ بے حد خوبصورت ہے اور اس کے تمام تر نقش و نگار تیرے ہی پیدا کردہ ہیں، جب اہل نظر اس کی طرف دیکھتے ہیں تو حیران اور ششدر رہ جاتے ہیں۔)

یہی صاحبِ نظر جب میدانوں، پہاڑوں، صحراؤں، جنگلوں، آباد اور غیر آباد زمینوں، سمندروں اور آسمان کی بلندیوں، فضا کی لامحدود وسعتوں اور اس کے عجیب و غریب اور حیران کن نظام پر سوچتا ہے تو معاً اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کائنات کوئی بے مقصد تخلیق نہیں ہے۔ اس کی ہر چیز کے ساتھ اس کے خالق اور اس کے خلیفہ انسان کا حتمی تعلق لازمی ہے۔ انسان کا تعلق اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ تمام چیزیں خالق کائنات نے اس آسائش اور فائدے کے لئے کام پر لگائی ہیں۔ انسان کے لئے یہ پوری کائنات ایک منظم گھر کی سی ہے اور اس میں موجود تمام چیزیں گھر کے سامان کے مترادف ہیں۔ اس میں بعض استعمال کے لئے ہیں، بعض آرائش و زیبائش کے لئے اور بعض اس کی نشو و نما اور جسمانی ارتقاء کیلئے ہیں۔ دنیا اور انسان کے اسی قسم کے تعلق کے مطالعے کے علم کا اصطلاحی نام جغرافیہ رکھا گیا ہے۔

علما اور مفکرین ماضی میں یہی مطالعہ اپنے اپنے فہم، عقیدے اور رسائی کے مطابق کرتے رہے ہیں۔ کوئی اخلاقیات کی زنجیر کے ساتھ اس کی کڑیاں ملا رہا ہے۔ کسی نے فنا اور بقا کے تسلسل کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑا ہے۔ کسی کے لئے یہ فکر و عمل اور تعمیر و ترقی کا پیغام لئے ہوئے تھا اور کسی کی نظر میں تخلیق، تعمیر اور تخریب کی نشانیاں اس میں موجود تھیں۔

پشتو کے نامور شاعر خان خوشحال خان خٹک نے بھی اپنے اس وسیع و عریض مکان کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے اور ایک ذہین اور بلند خیال ہیئت دان کی حیثیت سے ہر چیز پر فرداً فرداً بحث کی ہے۔

جدید تحقیقات کی رُو سے جغرافیہ اور ہیئت کے اکثر قدیم نظریات میں فرق واقع ہوا ہے اور بعض تو بالکل ہی غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ جیسے کہ کسی زمانے میں یہ عام خیال ہوا کرتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور آسمان گردش کرتا ہے۔ یا یہ کہ زمین کی گولائی کا کسی کو یقین نہیں تھا۔ اسی طرح اور بھی بہت ساری باتیں ایسی تھیں کہ عرصۂ دراز تک لوگوں کے لئے معمہ بنی رہیں۔ اور بعض صوفیا نے تو ان رازہائے سربستہ پر "تفکر" اور سوچ کرنے کو تضیع اوقات سے تعبیر کیا اور حافظ شیرازی کی طرح اعلان کیا کہ ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کم تر جو
کہ کس نہ کشود و نہ کشاید بہ حکمت ایں معما را

لیکن بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کی نظر میں زندگی مسلسل کاوش، تفتیش، تحقیق اور تجسس کا نام تھا اور انھوں نے کائنات کے رازہائے سربستہ کو معلوم کرنے اور ان معموں کے حل کیلئے انتھک کوشش اور مسلسل تحقیق جاری رکھی۔ اور ان کے بارے میں اپنے خیالات، مشاہدات، افکار اور نظریات کو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کیا۔ اسی طرح مختلف علوم کے دروازے کھلنے لگے اور علوم کے ہر دفتر میں آہستہ آہستہ اضافہ اور ترمیم ہونے لگی۔

زمین کی گردش، اجرام فلکی کی حرکات اور ستاروں اور سیاروں کے مشاہدے زمانہ قدیم سے اہل علم، فلاسفر اور مفکرین کے زیر مشاہدہ رہے ہیں۔ خوشحال خان نے بھی ان موضوعات پر بھرپور قلم فرسائی کی ہے۔ موسمیات اور دن کے گھٹنے بڑھنے اور چاند

اور سورج کی مختلف حالتوں کا بڑے عالمانہ انداز میں انھوں نے اپنی تحریروں میں ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ خان موصوف نے آسمان کے بارہ برجوں کے لئے پشتو نام بھی وضع کئے ہیں۔ یوں خوشحال خان پشتو تقویم کی اساس رکھنے والوں میں ہیں۔ جو نام انہوں نے پشتو میں وضع کئے ہیں حسب ذیل ہیں۔

اُورے	عربی نام حمل	فارسی نام فروردین	۲۲ مارچ تا ۲۰ اپریل
غوئیکے	״ ثور	״ اردی بہشت	۲۱ اپریل تا ۲۱ مئی
ځینود (غبرگونی)	״ جوزا	״ خرداد	۲۲ مئی تا ۲۲ جون
کنی کبر	״ سرطان	״ تیر	۲۳ جون تا ۲۳ جولائی
زمرے	״ اسد	״ امرداد	۲۴ جولائی تا ۲۳ اگست
وږے	״ سنبلہ	״ شہریور	۲۴ اگست تا ۲۲ ستمبر
تلہ	״ میزان	״ مہر	۲۳ ستمبر تا ۲۳ اکتوبر
لړم	״ عقرب	״ آبان	۲۴ اکتوبر تا ۲۲ نومبر
لیندہ	״ قوس	״ آذر	۲۳ نومبر تا ۲۲ دسمبر
ورغومے	״ جدی	״ دے	۲۳ دسمبر تا ۲۲ جنوری
بوقہ	״ دلو	״ بہمن	۲۱ جنوری تا ۱۹ فروری
ماهی (کب)	״ حوت	״ اسفندار	۲۰ فروری تا ۲۱ مارچ

یہ بارہ برج یا بارہ مہینے تین تین برجوں یا مہینوں کے حساب سے چار موسم بناتے ہیں خان فرماتے ہیں ؎

پہ خلہ پسے گلونہ د بہار دی — پہ اهاړ پسے راد رومی پشکال
پہ دولس برجہ گرځی نمر پوره پہ دولس میاشتے
پہ دا خبردار نہ دے چہ سیفی دے کہ شتاقی

(ترجمہ:- سردیوں کے بعد بہار کا موسم ہوتا ہے اور گرمیوں کے عقب میں برسات ہوتی ہے۔ سورج بارہ برجوں میں بارہ مہینے میں گردش کرتا ہے۔ اس کو یہ معلوم نہیں کہ وہ موسموں پر کیا اثر ڈالتا ہے)

لیکن سورج کے اس موسمی عمل سے چار موسم پیدا ہوتے ہیں اور انہی کی بدولت روئیدگی نباتات اور ان کے اُگنے بڑھنے، پھلنے اور تخم ریزی و تخم کاری کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

زمین کی گردش سورج کی اس فیض رسانی کا موجب ہے۔ اور زمیندار فصلوں کی کاشت اور بوائی کٹائی کے اوقات میں صحیح طور پر تمیز کر سکتا ہے۔ وہ مناسب وقت پر فصلوں کی آبیاری، انکی گوڈی اور شاخ تراشی یا کھاد ڈالنے کے موسم اور وقت کا اندازہ لگاتا ہے خان فرماتے ہیں۔

چہ پہ ژمی شاخ بری وشی دَ ونے　　　پہ بہار کہ ئے لا نیہ وی پر و بال

(ترجمہ:- جب جاڑوں میں درخت کی شاخ تراشی ہو جاتی ہے تو بہار کے موسم میں اس کے پر و بال اور بھی نکھر آتے ہیں)

زمین کی سطح اگر ہموار رہتی ہے اور اس میں کہیں سطوح مرتفع، کہیں پہاڑ اور وادیاں وغیرہ ہوتے تو سورج کی تمازت معین کرنے والے فرضی خطوط بھی آسمان میں متعین کردہ بارہ برجوں کے ساتھ متوازی ہوتے۔ لیکن زمین پر نشیب و فراز کے اس تفاوت نے ان فرضی خطوط کو ٹیڑھا اور بے ربط کر دیا ہے۔ اور جس طرح شمال اور جنوب کی جانب درجہ حرارت میں فرق واقع ہوتا ہے اسی طرح بلندیوں پر جاتے وقت بھی درجہ حرارت میں بتدریج کمی آتی ہے۔ خان علیین مکان کا مشاہدہ یہ ہے کہ۔

نور باغونہ د لنو روز پہ وخت غوړیږی
پہ اهاړ کښے غوړیدل کا د کابل باغ

(ترجمہ:- اور باغ نوروز کے دنوں میں کھلتے ہیں لیکن کابل کے باغ پر جون کے دنوں میں بہار آتی ہے)

اسی طرح سوات اور بنیر کے علاقے چونکہ پشاور اور پنجاب کے میدانوں سے بلندی پر واقع ہیں۔ اس لئے وہاں بھی بہار کا موسم بعد میں آتا ہے اور حمل یعنی ۲۲ مارچ اور ۲۰ اپریل کے درمیانی عرصے میں کھلنے والے پھول سوات اور بنیر کے علاقوں میں جوزا یعنی ۲۲ مئی تا ۲۲ جون کے درمیانی عرصے میں کھلتے ہیں۔ سنبلہ یعنی ۲۲ اگست تا ۲۲ ستمبر کے مہینے میں ۸ سنبلہ یعنی ۳۱ اگست کو موسم بدلنا شروع ہو جاتا ہے۔ خان فرماتے ہیں ؎

پہ اتم د سنبلے منتہی شی دوہ ځلے　　　اباسین پہ تھہ کښے کښینی پہ تن و چے شی خولے
وڑی اوښتری د تښو لو کار تښکارہ شی د غلے

(ترجمہ: سنبلہ کی آٹھویں تاریخ یعنی اگست کی ۳۱ تاریخ کو گرمیوں کے دو چلے

پورے ہوجاتے ہیں ۔ دریائے سندھ کے پانی میں کمی آجاتی ہے اور جسم پر پسینہ خشک ہوجاتا ہے ۔ دھان میں بالیاں نکل آتی ہیں اور غلے کی امید پیدا ہوجاتی ہے)

آب و ہوا اور موسمیات کے ساتھ کسی علاقے کے درختوں اور پودوں کا خاص تعلق ہوتا ہے موافق آب و ہوا میں درخت اور پودے بہتر طور پر پروان چڑھتے ہیں ۔ خان فرماتے ہیں ؎

کہ پہ شہد ورئے ساتے مزہ ئے نہ وی ناشپاتئی دسمرقند دھند پہ زمکو

(ترجمہ :۔ اگر شہد سے بھی اُن کی آبیاری کرو تب بھی سمرقند کی ناشپاتی ہند کی سرزمین میں بے مزہ ہوتی ہے)

ہواؤں کی گردش بھی زمین کی حرکت اور سورج کی تمازت سے وابستہ ہے ۔ اس طرح دو قسم کی ہوائیں پیدا ہوتی ہیں ۔ ایک دائمی اور دوسری موسمی ۔ دائمی ہوائیں اپنے مخصوص راستہ پر چلتی ہیں اور موسمی ہوائیں اپنے خاص موسم میں ۔ خان کا قول ہے کہ ؎

پہ درست جہان کښے گرځی باد میوان پہ څلور کُنجہ
پہ ھر لوری چہ گرځی ناخبر چہ څہ پیمائی

(ترجمہ :۔ سارے جہاں میں ہر طرف ہوا چلتی ہے جس طرف بھی یہ جاتی ہے اُسے یہ معلوم نہیں کہ یہ کیوں جارہی ہے)

لیکن ہوا کی اس حرکت اور پرواز میں زمین کی آبادی اور زندگی کے متحرک ہونے کا راز پنہاں ہے ۔ یہ ہوائیں جب بڑے بڑے سمندروں پر سے گذرتی ہیں تو اپنے ساتھ آبی بخارات اڑا لاتی ہیں اور بخارات سے یہ لدی پھندی ہوائیں جب ٹھنڈے طبقات میں پہنچتی ہیں تو وہاں پر بارش کی شکل اختیار کرکے زمین پر برستی ہیں ۔ یہی بارش کا پانی یا برف مردہ زمین کو زندگی بخشتی ہے ۔ دریا' ندی نالے' کنویں اور چشمے سب اس کے مرہون منت ہیں ۔ اسی طرح بارانی زمینیں بھی روئیدگی کے لئے بارش پر دارومدار رکھتی ہیں ۔ اگر وقت پر بارش ہوجائے تو فصل کامیاب ہوجاتی ہے اور ملک آباد اور لوگ خوشحال ہوتے ہیں ۔ لیکن اگر بارش بروقت نہ ہو اور خشک سالی ہو تو نہ دانہ پانی آسانی سے ملتا ہے اور نہ گھاس چارہ ۔ اس بارے میں خان کا قول ہے ؎

پہ وریرہ م کار لتنہ لہ آسمان وریږو وریږی :: دیاران سرہ م کار دے کہ تښہ شی کہ پہ دخ شی

(ترجمہ:۔ بادل سے مجھے کوئی سروکار نہیں چاہے آسمان پر بادل ہی بادل کیوں نہ ہوں۔ میرا مطلب تو بارش سے ہے اگر وہ دن کو برسے یا رات کو)

اسی طرح موسمیات پر خان علیین مکان نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کا مشاہدہ عمیق بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔ وہ ان سالوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جب ملک میں خشک سالی تھی اور ان کا بھی حال بیان کرتے ہیں جب ہر طرف خوشحالی تھی۔ ۱۰۷۵ ہجری میں ایک دمدار ستارے کا آسمان پر ظاہر ہونے کا ذکر بھی بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ اسی طرح پانی کی صفائی اور صحت بخش پانی کے معاملے میں بھی خان کی نگارشات قابل ذکر ہیں۔ مختلف جغرافیائی علاقوں خصوصاً کابل، باگرام اور ہند، ازبکستان اور سوات وغیرہ کی بود و باش، رہن سہن، اخلاق و عادات اور پیداوار کے بارے میں بھی خان کا مشاہدہ بہت دلچسپ اور عمیق ہے۔ خان علیین مکان کی نظر میں سمندر کی اتھاہ گہرائیاں بیش بہا خزانوں سے معمور ہیں۔ سمندر انسانی زندگی کیلئے بیحد اہم ہے۔ بین الاقوامی شاہراہیں، آبی حیوانات، بیشمار قسم کے معدنیات سمندر میں موجود ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے صرف محنت و کاوش اور انسان کی ہمت و عزم کی ضرورت ہے۔ خان فرماتے ہیں۔

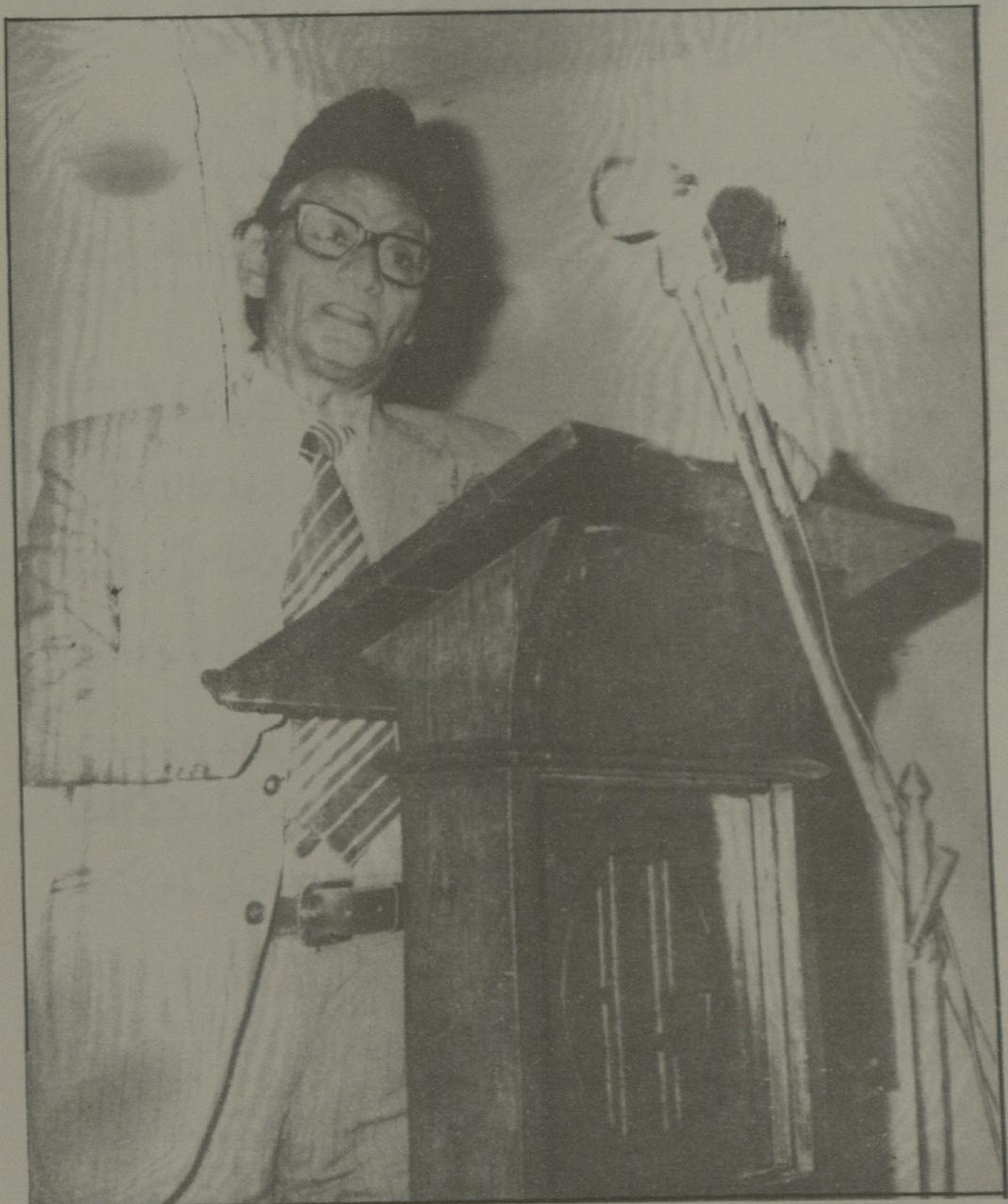
که م لاس لکه دریاب خالی لیدہ شی | د تہتو د ننه ډک په دُر گوهر یم
که غوټے پسے وهے په لاس به درشی | چا ویے داچه په دریاب کښے گوهر نشته
موجونه در و مرجان هاله ولجه کا | چه قبول کاندی د بحر خونی چلے

ترجمہ:۔ خان کے دیوان میں اس زمانے کی معلوم دنیا کے اکثر معدوم اور مشہور پہاڑوں، دروں میدانوں اور سطوح مرتفع وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔ اُن کے جغرافیائی محل وقوع کے بارے میں لکھا ہے۔ اسی طرح سوات پر اُنکی ایک پوری کتاب سوات کے جغرافیائی حالات، لوگوں کی طرز زندگی، اُن کے ذرائع آمدن، پیشوں اور تجارت اور قبیلوی تقسیم وغیرہ پر موجود ہے

خوشحال خان حقیقت میں ایک نامور مفکر اور شاعر ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑے عالم اور حکیم بھی تھے ان کا یہ دعویٰ یقیناً کوئی شاعرانہ تعلی نہیں ہے کہ ؎

په هر فن کښې چه ئې غواړے هغه زه یم | قرینه به م بیا را نه شی په قرنه

(ترجمہ:۔ ہر ایک فن میں اگر کسی ماہر کی تمہیں تلاش ہے تو میں ہوں۔ میرا ہمسفر صدیوں میں بھی پیدا نہ ہو گا)



ڈاکٹر معز الدین احمد، ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی لاہور

ڈاکٹر محمد معز الدین

خوشحال خان خٹک اور علامہ اقبال

خوشحال خان خٹک کی تین سو سالہ برسی کے موقع پر اس عظیم صاحب سیف و قلم اور فقید المثال شاعر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوتے حکیم الامت علامہ اقبال کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

گمان غالب ہے کہ علامہ اقبال براہ راست پشتو زبان سے نہیں بلکہ خوشحال خان خٹک کے کلام کے انگریزی تراجم کے ذریعہ خود بھی متعارف ہوئے اور پھر اردو دان اور انگریزی خوان طبقے کو انگریزی ہی کی وساطت سے ایک سیر حاصل مضمون لکھ کر روشناس کرایا ان کا یہ مضمون پہلی بار ۱۹۲۸ء میں ایک انگریزی رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) میں بعنوان

KHUSHHAL KHAN KHATTAK THE AFGHAN

چھپا اس مضمون سے خوشحال خان خٹک کی ولولہ انگیز شاعری سے ہم پہلی بار متعارف ہوئے علامہ اقبال نے اس مضمون میں اس بات کی ضرورت پر زور دیا کہ خوشحال خان کی شاعری کا بھرپور جائزہ لیا جائے۔

اقبال اور خوشحال کے ادوار میں تقریباً دو سو سال کا بُعد ہے۔ خان بابا علوم مروجہ سے بہرہ ور تھے۔ اس کا ثبوت ان کے کلام کی داخلی شہادت سے بھی ملتا ہے۔ اقبال کا مطالعہ نہایت وسیع و عمیق تھا اس سے ہم پوری طرح واقف ہیں۔ اقبال خوشحال خان کی فطری شاعری حریت پسندی اور سخت کوشی کے جذبے سے بہت متاثر ہوتے انسانی شاعری میں شمشیر و سناں اور جمالی فطرت کی جملہ جلوہ سامانی کے حسین و دلپذیر امتزاج نے اقبال کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچا۔ اور چونکہ ان دونوں کے کلام کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ لہٰذا انکے خیالات جذبات اور عمل و جہد کے پیغامات میں بڑی حد تک مماثلت تعجب خیز نہیں۔

دونوں زندگی کو مردانہ وار دیکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور ہمیں دونوں کے یہاں

زندگی کی تاب و توانائی، صلابت، شجاعت اور صداقت کا پیغام ملتا ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری دراصل اسلامی روایات اور اسلامی اقدار کی تفسیر و تعبیر ہے۔ اور زندگی کے حقائق کی ترجمان۔ ؎

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر　　　تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

اور خوشحال خان کی حیات پرور اور شعلہ بداماں شاعری کا بھی یہی مزاج ہے۔ اس صاحب سیف و قلم کے یہاں اقبال کے مرد مومن اور مرد مجاہد کی پوری عکاسی ہے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت　　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اور یہی صفات خان بابا کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں یعنی ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم　　　رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

یا

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم　　　دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبال کی شاعری مقصدی شاعری کی معراج ہے، وہ کہتے ہیں۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست　　　سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

خوشحال کی شاعری میں بھی "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ" کا سبق آموز پیغام ہے۔

اقبال اور خوشحال کی شاعری اور ان کے پیغامات کی اسی مماثلت کو دیکھ کر مولانا جعفر شاہ پھلواروی نے لکھا ہے کہ (دیباچہ اقبال اور خوشحال مصنفہ میر عبدالصمد خان) تین سو سال پہلے ضلع پشاور کے ایک گاؤں اکوڑہ خٹک میں ایک شخص گذرا ہے جسے دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ پشتو کا اقبال بشکل خوشحال تھا یا تین سو سال بعد اردو کا خوشحال بشکل اقبال پیدا ہوا۔

اقبال کے یہاں عقاب باز اور شاہین کی اصطلاحیں انسان کی فطری قوت مسلسل جہد اور محنت و مشقت کی صلاحیتوں کا بطور استعارہ استعمال ہوئی ہیں

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں　　　نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

جھپٹنا پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا　　　لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

خوشحال خان کی زندگی اسی سخت کوشی سے عبارت ہے۔

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم

کی زندہ و متحرک تصویر ان کی ایک مستقل تصنیف باز نامہ ہے جس میں شہباز یعنی اقبال کے شاہین

کی تمام خصوصیات کا اجتماع ہے۔ وہ خود ایک شاہین صفت مردِ مجاہد تھے۔

"بالِ جبریل" میں خوشحال خان کی وصیت کے عنوان سے ایک مختصر نظم ہے۔ دراصل یہ نظم اقبال کی طرف سے خوشحال کی قوت، غیرت اور حمیت کی ترجمان ہے۔

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم ۔۔۔ کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ۔۔۔ ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں! ۔۔۔ کہستاں کا یہ بچۂ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہمنشیں دل کی بات ۔۔۔ وہ مومن ہے خوشحال خان کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ؟ ۔۔۔ مغل شہسواروں کی گردِ سمند

ان اشعار کو اس دور کی تاریخ اور مغلوں سے ان کی نبرد آزمائی کے تناظر میں دیکھنا چاہیئے خاص کر یہ شعر "محبت مجھے ان جوانوں سے ہے۔ ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند" ضرب المثل کا حکم رکھتا ہے اور اقبال کا بھی یہی ابدی پیغام ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

خوشحال کے یہاں زندگی کا جوہر جہدِ مسلسل، محنتِ پیہم اور خطرات سے مقابلہ کرنے کی جرأت اور صلاحیت سے کھلتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے کہ ؎

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

پیامِ مشرق میں ان کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہی یہ ہے کہ:-

"اگر خواہی حیات اندر خطر زی"

غزالے با غزالے دردِ دل گفت ۔۔۔ ازیں پس در حرم گیرم کنامے
بصحرا صید بنداں در کمین اند ۔۔۔ بکامِ آہواں صبحے نہ شامے
رفیقش گفت اے یارِ خردمند ۔۔۔ اگر خواہی حیات اندر خطر زی

عزتِ نفس، فقر و غنا، توکل و رواداری اور استقامت جیسی مومنانہ اور مردانہ صفات انسانی عظمت کی دلیل ہیں۔ خوشحال اور اقبال دونوں اعلیٰ انسانی اقدار کے علمبردار رہیں۔

جہاں اقبال ؂

آدمیت احترام آدمی
با خبر شو از مقام آدمی

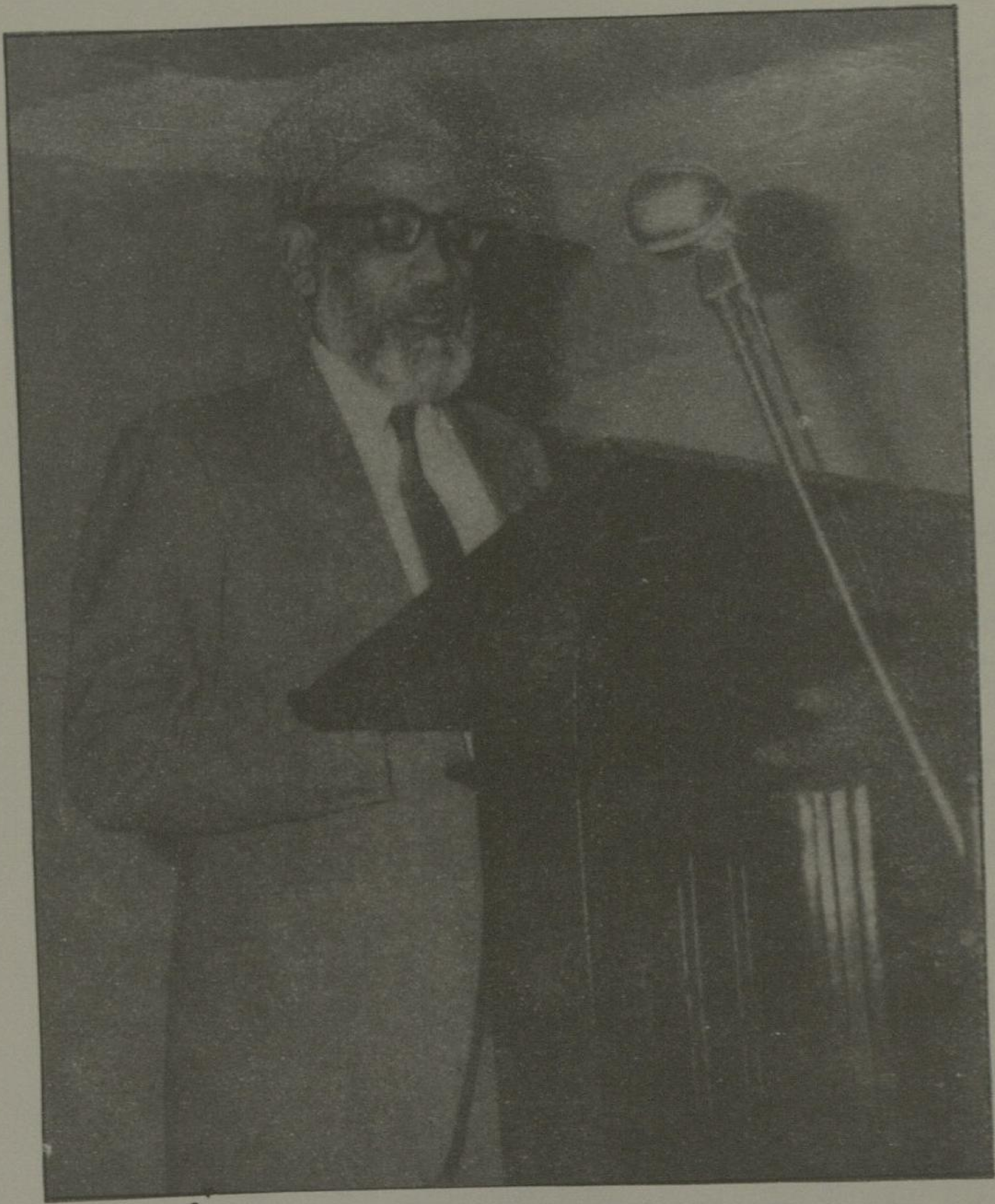
کی تلقین کرتے ہیں وہاں خوشحال خان بھی ہمیں خودداری، شجاعت، سخاوت اور عدل و صداقت کا پیغام دیتے ہیں۔ انفرادی سربلندی اور قومی افتخار کا درس دونوں کی شاعری کی روح ہے۔ اور اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اقدار کے دونوں عکاس ہیں۔

ان دونوں دیدہ ور شاعروں کا ہم پر بڑا احسان ہے جہاں اقبال پاکستان کے فکری خالق ہیں وہاں خوشحال حریّت و حمیّت کے علمبردار اور اسلامی اقدار کے بہت بڑے نقیب ہیں۔ دونوں اعلیٰ اسلامی اقدار کے قبلہ نما ہیں۔ ہمارے نوجوانوں میں ملی شعور، اسلامی جذبہ اور بصیرت پیدا کرنے کے لئے اقبال اور خوشحال کے کلام کا مطالعہ اور ان کے پیغامات کو حرز جان بنانا ضروری ہے۔

جاوید نامہ میں علامہ اقبال نے خوشحال خان خٹک کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

خوش سرود آں شاعر افغان شناس | آنکہ بیند باز گوید بے ہراس
آں حکیمے ملت افغانیاں | آں طبیب علت افغانیاں

راز قومی دید و بے باکانہ گفت
حرف حق با شوخیٔ رندانہ گفت



پروفیسر محمد شفیع صابر

پروفیسر محمد شفیع صابر

خوشحال خان - ترجمان العصر

آج سے تین سو سال پہلے پشتو شعر و ادب کے چمن میں دو نغمے گونجے۔ ایسے نغمے جو اس سے پیشتر کبھی اٹک کے اس پار سُنے نہ گئے تھے، ہر کوئی انہیں سن کر جھوم جھوم اٹھا اپنی سحر آفرینی، شیرینی اور تاثیر کے اعتبار سے دونوں نغمے ہم پلہ تھے۔ لافانی اور عہد آفریں تھے۔ دل و دماغ پر چھا جانے والے تھے تاہم ان میں بنیادی فرق یہ تھا کہ ایک جگر لالہ کو ٹھنڈک بخشنے والا تھا تو دوسرا فکر اور جذبے کی آگ بھڑکانے والا۔ ایک مابعد الطبیعاتی (METAPHYSICAL) رنگ لئے ہوئے تھا تو دوسرا دنیوی اقدار (TEMPORAL VALUES) کا حامل سا ایک آفاقیت اور روحانیت کا علمبردار تھا تو دوسرا اپنے ماحول اپنے معاشرے اور اپنے دور کے احوال و کوائف کا عکاس اور سرحدی عوام کی تمناؤں اور امنگوں کا ترجمان ــ کلام کا یہ فرق اس لئے تھا کہ صاحبان کلام کی شخصیتیں جدا جدا تھیں ــ جہاں حضرت رحمٰن بابا علیہ الرحمتہ کا ذہن جذب و مستی اور عشق حقیقی کی مئے سرمدی سے سرشار ملکوتی بلندیوں پر محو پرواز تھا وہیں سردار خوشحال خان خٹک اپنے گرد و پیش، اپنے ماحول اپنی تاریخ، اپنی روایات اور اپنے مقامی مسائل کا گہرا شعور اور عملی تجربہ رکھتے ہوئے "قمار زندگی مردانہ بازیم" کے حیات آفریں اصول پر عمل پیرا اور کامزن تھے۔ غم جاناں کے ساتھ ساتھ خوشحال خان کے کلام میں غمِ دوراں کو بھی موزوں جگہ ملی ہے۔ خان بابا کی تحریروں میں اُن کا تاریخی، سیاسی اور سماجی شعور کمال کی حد تک پہنچا ہوُا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے افکار میں روح عصر اس طرح رچی بسی ہوئی ہے جیسے پھول میں خوشبو ــ میرے نزدیک خوشحال اپنے دور کے صحیح نمائندے اور "ترجمان العصر" کے لقب کے سچے حقدار ہیں۔

بڑا ادب یوں بھی قومی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس لئے کہ کوئی ادیب، شاعر

یا فنکار خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے زمانے کا جیتا جاگتا حساس اور باشعور فرد ہوتا ہے وہ گرد و پیش کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے تجربات و محسوسات کو جذبات کی کٹھالی میں پگھلا کر دلکش انداز میں پیش کرتا ہے ۔ عام ادیب یا شاعر تنکے کی طرح وقت کے سیلاب میں بہہ جاتا ہے لیکن بڑا شاعر یا ادیب تقلید کی رَو میں بہہ جانے کی بجائے اپنا سر عامۃ الناس سے ہمیشہ بلند رکھتا ہے ۔ خوشحال خان خٹک اپنے دور کی عظیم شخصیّت بھی تھے اور عظیم فنکار بھی' ایسے نابغۂ عصر لوگ نہ صرف معاشرے سے متاثر ہوتے بلکہ معاشرے کو متاثر کرنے کی پوری اہلیّت بھی رکھتے ہیں، ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر ادب ایک جامد شئے نہیں رہتا بلکہ ایک متحرک قوت بن جایا کرتا ہے ۔ یہ عظیم لوگ اپنے کلام سے اپنے ہمعصروں کے ذہنوں کو جھنجھوڑنے اور ان میں فکر و عمل کی قوتیں بیدار کرنے کا کام لیتے ہیں۔ اور افرادِ قوم کو مقصدیت اور معنویت کی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ شاعری اُن کے لئے قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی بن جاتی ہے' ایسے کلام کے متعلق اقبال فرماتے ہیں کہ ؎

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا صورِ اسرافیل

کلام کا رخ متعین کرنے میں ماحول کے علاوہ شاعر کی افتادِ طبع بھی اہم کردار ادا کرتی ہے' بعض لوگ فعّال طبیعت کے مالک ہوتے ہیں اور بعض انفعالی مزاج کے، خوشحال خان کی شخصیت بڑی پہلو دار اور زور دار تھی ، انہوں نے ایک بھرپور زندگی گذاری' زندگی کے گرم سرد چکھے' وہ شاعر بھی تھے اور سپاہی بھی ، ادیب بھی اور طبیب بھی' سیر و شکار کے شائق بھی اور حکیم فرزانہ بھی' عشق و محبت کے رموز و اسرار سے آگاہ بھی تو سیاسی مہرہ بازیوں کے ماہر بھی' حکمران بھی اور اہل دل بھی ـــــ صاحب قلم بھی اور تلوار کے دھنی بھی' چنانچہ اُن کا کلام اُن کی اسی ہمہ گیر اور بھرپور شخصیّت کا آئینہ دار ہے ۔ اُن سے پہلے اور ان کے بعد بھی داخلیت کا رجحان پشتو بلکہ سارے مشرقی ادب و سخن کا طرّہ امتیاز تھا لیکن انہوں نے داخلیت سے جان چھڑا کر فن کو ایک مقصدیت بخشی اور اسے زندگی سے قریب تر بلکہ زندگی کا ترجمان اور خادم

بنا دیا، تسخیر ذات اور تسخیر کائنات کے دروازے کھول دیئے اور پشتو ادب کو ایک نئی راہ سجھا دی۔

اعلیٰ شاعری یوں بھی چار عناصر سے ترکیب پاتی ہے، سچا جذبہ، عظیم خیالات تخیلی اظہار اور موسیقیت، خان بابا کے کلام میں یہ چاروں اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہیں، انھوں نے وہی کہا جو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا، اُن کے کلام اور عمل میں گہری ہم آہنگی پائی جاتی ہے، ان کی تمام مساعی کا ہدف اور مقصود عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی تھا، اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنی جان تک داؤ پر لگانے کو تیار تھے، ان کا کہنا ہے کہ

ایک غیرت مند انساں کے لئے زندگی میں دو ہی رستے ہیں یہاں
کھیل جاتا ہے وہ اپنی جان پر! لوٹ کر آتا ہے یا وہ کامران

اور یہ افکار محض سخن آرائی نہیں بلکہ ان کی عملی زندگی کا مرکز و محور بھی ہیں، وہ ننگ، غیرت یختو یا بالفاظ علامہ اقبال "خودی" کے پیغام بر ہیں اور اسے زندگی کی عزیز ترین متاع اور اوّلین بنیاد گردانتے ہیں، شاعری میں علائم و رموز اور امیجز (IMAGES) کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے شاہین، باز اور جرّہ کی علامتیں خوشحال کے ارفع و اعلیٰ نصب العین، حرکت پسندی اور قوت پرستی کی نشان دہی کرتی ہیں، وہ خود ایک مرد شاہین صفت تھے، اُن کی ساری زندگی جھپٹنا، پلٹنا پلٹ کر لپکنا، کی عملی تفسیر رہی، شخصیت کی اسی عظمت نے انہیں وہ احساس برتری بخشا کہ ان کا کلام جرأت اور صداقتِ بیان کی ایک مثال بن گیا، اُن کا دیوان مظہر ہے کہ وہ اپنے خاندانی خانگی بلکہ ذاتی رازوں سے سرِ عام پردہ اٹھانے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے اور جو دیکھتے ہیں برملا کہہ دیتے ہیں، یہ بات صرف خوشحال خان جیسے مردِ جری ہی کا حصّہ ہے، کہتے ہیں ؎

خدا مرے سر کے دشمنوں کو بھی دے نہ بہرام کا سا بیٹا
کہ جس کے ہاتھوں سے مستقل غم میں مبتلا سارا خاندان ہے
پڑا ہے ٹیری میں فوج اسکی، زمانہ حیران ہے اس جنوں پر
مرے مقابل وہ ہے صف آرا، یہ میرا بیٹا عدوئے جاں ہے

اُن کا کلام اپنے زمانے کی کش مکش کا پتہ دیتا ہے اور اُس دور کے حالات و واردات کا مرقع بھی ہے اس میں جگ بیتی کا رنگ بھی ہے تو آپ بیتی کا عنصر بھی، اُن کی تحریروں سے اُن کے حسب و نسب، ذاتی اور خاندانی حالات، تعلیم، تربیت، بچپن، جوانی، قبائلی عداوتوں ،

سیاسی رقابتوں، سرحدی مزاج کے محاسن اور قبائح پر روشنی پڑتی ہے تو اُن کی بیویوں، بیٹوں بیٹیوں، پوتے پوتیوں تک کے بارے میں تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے میرے چالیس بیٹے ہیں، پانچ پوتے ہیں، ایک حقیقی بھائی ہے جو راہِ حق پر گامزن ہے۔ میرے اپنے قبیلے کے چالیس ہزار جنگجو میری حمایت پر کمر بستہ ہیں، قدرت نے انہیں جو گہرا تاریخی شعور بخشا ہے اُسے بروئے کار لاکر وہ اپنے دیوان میں پختون قوم کے ماضی و حال، اس کی اہمیت و عظمت اور اس کے کردار پر پوری روشنی ڈالتے ہیں۔ نہایت بے تکلّفی سے اپنے اردگرد کی تلخ اور خوشگوار حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں اور انتہائی چابکدستی سے اپنے معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ خوشحال خان کے کلام کی ایک بڑی خوبی مضامین کا تنوّع بھی ہے۔ اُن کی واقعاتی، حادثاتی اور تجرباتی نظمیں بڑی ٹھوس، مفکرانہ، منطقیانہ اور فاضلانہ ہیں، اپنے دَور کی معاشرتی خرابیوں کو وہ محض تماشائی کے طور بیان ہی نہیں کرتے بلکہ ان پر طنز کا نشتر چلانے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں، اپنے عوام کی زیادتی کے متعلق اُن کا کہنا ہے کہ ؎

نہیں پہچانتے حق ماں بہن کا — یہ خود میراث کھا جاتے ہیں ساری
کرے بھائی تو فوراً کرتے ہیں یہ — جواں بھاوج سے شادی کی تیاری
کسی کا بدلہ لیتے ہیں کسی سے — اسے کہتے ہیں ظالم وضعداری

اپنی دھرتی اور اپنے لوگوں سے خوشحال خان کی محبت اور جذباتی وابستگی مثالی حیثیت رکھتی ہے، بھارت کے قید خانے سے وہ اپنے وطن کو کس والہانہ لگاؤ سے یاد کرتے ہیں ؎

بڑھ کے عنبر سے یہ خاکِ وطن — گرم پانی بھی ہے اس کا خوشگوار
عود و صندل اس کے بوٹے ہیں مجھے — خشک مٹی اس کی ہے مشکِ تتار
لوگ کہتے ہیں جنہیں پتھر فقط — میری نظروں میں ہیں درِ شہوار
سب سے اچھی ہے پشاور کی زمین — بس رہے ہیں اس میں میرے دوست یار
گرچہ بھارت کی چنبیلی خوب ہے — مجھ کو پیارے ہیں وطن اپنے کے خار
قدر کیا جانے اکوڑے کی کوئی؟ — مجھ کو ہے فخار یہ اپنا دیار

یا

زلفیں لہرائیں فضائیں سرحدی دوشیزگاں
تا کہ خوشبو مجھ کو رنتھمبور میں آتی رہے

خوشحال خان کے رجزیہ اور رزمیہ مضامین پشتو ادبیات کا لازوال سرمایہ ہیں، وطنی سرحدوں کے پاسباں ہونے کی وجہ سے اہل سرحد سے یوں بھی جنگی صفات اور عسکری اوصاف کے حامل ہیں اس لئے اُن کے غیور سردار خوشحال خان کا یہ کہنا شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ عین حقیقت ہے کہ:

میں اپنی قوم کی عزت کی خاطر
عدو کے واسطے تیغ و سناں ہوں
نہیں ثانی زمانے بھر میں جس کا
وہ غیرت مند میں خوشحال خاں ہوں

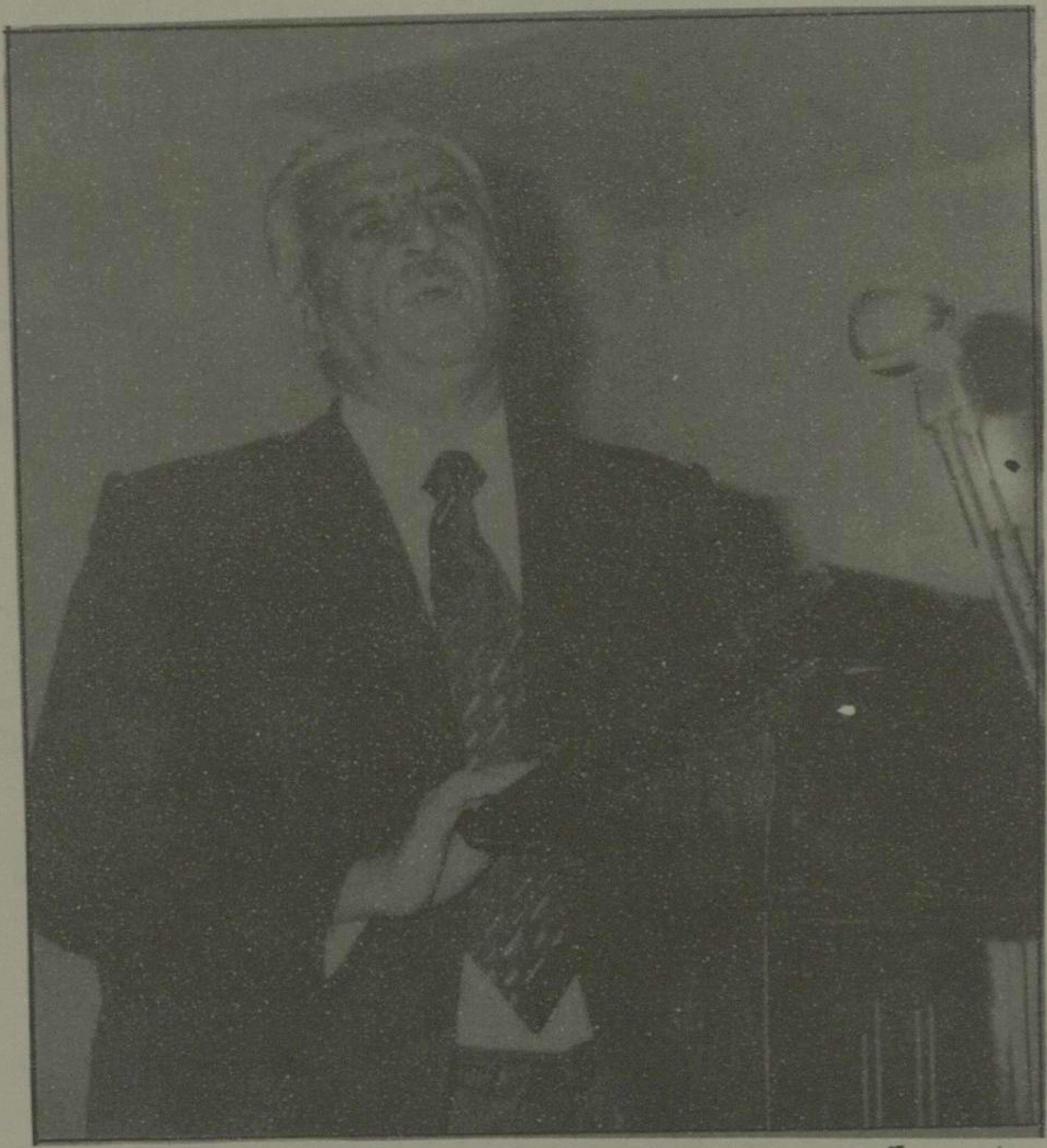
(یا) میری تلوار کی جھنکار سنی ہے جس نے
اب بھی بستر سے لرزتا ہوا گر پڑتا ہے
میں ہی وہ سرکش و خود دار جواں ہمّت ہوں
جس نے اورنگ کو معذور بنا رکھا ہے

خوشحال خان کا سارا دیوان حب الوطنی، قومیّت، غیرت و حمیّت، جوش اور ولولہ، جرأت اور بیباکی، تمکنت، احساس برتری اور سخت جانی کے انہی جذبات کا آئینہ دار ہے، اس کی دوسری تصانیف باز نامہ، صحت البدن، ہدایہ، فضل نامہ، سوات نامہ، دستار نامہ، بیاض وغیرہ بھی اپنے دور کی تاریخ، تہذیب، معاشرت، علمی و ادبی سرگرمیوں، رسم و رواج اور سماجی قدروں کی پوری عکاسی کرتی اور خوشحال خان کی آگاہی اور روح عصر سے کامل ہم آہنگی کا پتہ دیتی ہیں، ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خوشحال ایک دُور بین شاہین تھے جو اُفق تا اُفق ہر چیز کا بغور مشاہدہ کرتے اور اپنے مشاہدۂ عمرانی کو چابک دستانہ مہارت سے شعر کے لباس میں ڈھال دیتے تھے، علامہ اقبال کا یہ قول کہ "شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو" صاحب سیف و قلم خوشحال خان پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے خان بابا کا ہدف شاعری بھی اپنے عوام کو اپنے ماحول اور مسائل حیات سے آگاہی اور شعور عطا کرنا ہے، شاعری برائے شاعری کے لئے نہ ان کے پاس وقت تھا نہ ضرورت — تاہم اس سے بھی انکار نہیں کہ خوشحال عظمت فن کی انتہائی بلندیوں پر فائز اس لئے ہیں کہ انہیں زبان و بیان پر کامل قدرت حاصل ہے، قدرت نے اُن کی طبیعت میں ہر وہ جوہر ودیعت کیا ہے جو اس مقصد کے لئے ضروری تھا، انہوں نے جو کچھ دیکھا عمدہ پیرایہ میں بیان کر دیا — اُنکے ہاں آمد ہے آورد نہیں، "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں" کی سی کیفیت، بلا کا زور بیان اور بے ساختہ پن ہے۔ معلوم ہوتا ہے خوشحال خود بھی اپنی ان صلاحیتوں کا پورا شعور لئے

ہوئے تھے، تبھی تو ان کا کہنا ہے ؎

ھر کلام م واردات دے یا الہام دے
چہ موزوں م پہ تقطیع د بحرو بند کړو
پہ تشبیہ او پہ تمثیل پہ نزاکت سپکنے
عذوبت م د خبرو چند د رچند کړو

میرا ہر سخن یا واردات ہے یا الہام
میں نے اسے تقطیع اور بحر کا پابند کر دیا
ہے۔ تشبیہ، تمثیل اور نزاکت کے بارے
میں، میں نے باتوں کا مرتبہ بلند کر دیا۔
گویا یہ اشعار میر کے اس شعر کی تفسیر ہیں
کہ ؎
مستند ہے میرا فرمایا ہوا



ڈاکٹر سید مرتضیٰ اختر جعفری

ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری

خوشحال بابا کی فارسی شاعری

اس حقیقت میں کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں کہ پشتو ادب میں خوشحال خان خٹک ایک ایسا عظیم روشنی کا مینار رہے جس نے نہ صرف اس ادب کو تابندگی اور درخشندگی عطا کی۔ بلکہ آئندہ آنے والے ادیبوں اور شاعروں کے لئے اس روشنی میں اپنا صحیح راستہ اور درست منزل متعین کرنے میں مدد دی۔ ایک ایسا شخص جس کی زندگی کا بیشتر حصہ جنگ و جدل میں گذرا جس نے شاہین کی طرح تمام زندگی جہد و عمل میں گذاری ہو۔ اس کے لئے اتنا ضخیم دیوان مرتب کرنا اگر مشکل نہیں تو آسان بات بھی نہیں۔

یہ صاحب سیف و قلم امیرزادہ زندگی بھر اپنی قوم ملت اور علاقے کی بقا اور سالمیت کے لئے نہ صرف دشمنوں سے برسرپیکار رہا۔ بلکہ اس کے حصول مقصد کی راہ میں اگر اپنے بھی حائل ہوئے تو خوشحال خان نے ان سے بھی الجھنے سے گریز نہ کیا۔ ان کی یہ جد و جہد کی زندگی حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم کو بجد پسند تھی۔ چنانچہ اقبال نے اپنے شاہین کے لئے جو صفات مختص کیں ان میں بیشتر صفات اس مرد مجاہد کی شخصیت سے اخذ کی گئیں۔

خوشحال خان کی زندگی اور ان کی زندگی کے ہنگاموں کی جانب مجھے ہلکا سا اشارہ اس لئے کرنا پڑا کہ ہر شاعر اور ادیب کا فن اس کی زندگی کا پرتو ہوتا ہے۔ اس لئے جب تک کسی ادیب یا شاعر کی پوری زندگی سامنے نہ ہو اس کے فن پر درست تنقید کرنا ممکن نہیں۔ تاہم یہاں میں انکی زندگی سے قطع نظر ان کے فن کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اور فن میں بھی میرا موضوع ان کی شاعری ہے صرف فارسی شاعری۔

خوشحال خان خٹک کے ضخیم دیوان میں صرف پچیس فارسی غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جس میں اشعار کی مجموعی تعداد کم و بیش دو اڑھائی سو کے لگ بھگ بنتی ہے۔ لیکن اس قدر کم شعر کہہ کر بھی خان نے فارسی ادب میں اپنے لئے ایک ایسا مقام پیدا کیا جس کی ایرانی ناقد

بھی تائید کرتے ہیں ۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شاعر اپنی طویل زندگی میں چند غزلیں یا ایک نظم کہہ کر وہ مقام حاصل کر لیتا ہے کہ اس کے یہ چند شعر دوسرے شعراء کے پورے دیوانوں پر بھاری ہوتے ہیں اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ چند شعروں نے شاعر کو گمنامی کی اتھاہ گہرائی میں دفن ہونے سے بچایا میری ناقص رائے ہے کہ اگر خوشحال خان خٹک اپنی ۷۸ سالہ زندگی میں صرف فارسی کے چند شعر ہی چھوڑ جاتے تو تاریخ ادب میں ان کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہوتے۔

سرحد میں فارسی گو شعراء کی ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ لیکن باوجود کوشش اور جستجو کے اب تک خوشحال خان خٹک سے پہلے کسی فارسی شاعر کا کلام دستیاب نہ ہو سکا لیکن جب خوشحال خان خٹک کے فارسی شعروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی پختگی اور فنی آرائش سے اندازہ ہوتا ہے کہ خوشحال خان بابا سے صدیوں پہلے اس خطہ میں فارسی شعر و ادب کا آغاز ہوا ہوگا۔ اور اپنے ابتدائی مراحل طے کر کے جب فنی پختگی کے مراحل میں داخل ہوا تو خوشحال خان خٹک نغمہ سرا ہوئے۔

اب خوشحال خان خٹک کے فارسی اشعار کی خصوصیات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ دیکھا جائے کہ ان کی فارسی شاعری کی کونسی خصوصیات ہیں جن کی بناء پر خوشحال خان اتنے کم شعر کہہ کر فارسی شعراء کی صف اول میں اپنا مقام پیدا کر گئے ان کی فارسی شعر کی خصوصیات کی تفصیل کچھ یوں ہے ۔

ان کی غزل میں تغزل کی فراوانی ہے۔ ان کے اشعار گنگناتے چشموں اور گاتی ہوئی آبشاروں کی طرح نغمے بکھیرتے ہیں اور ان نغموں کے سبک اور لطیف آہنگ میں سننے یا پڑھنے والے محصور ہو کر کھو جاتے ہیں۔ اور بے اختیار سعدی شیرازی حافظ اور نظیری کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ایک غزل ملاحظہ فرمایئے کس قدر تغزل اور نغمگی سے لبریز ہے ۔

بکام دل نرسیدم به بوسهٔ ز لبش	اگرچه جان من آمد بلب ز بن طلبش
نگار من غضب آلوده من زساده دلی	بقهر خنده وی آگه نگشتم از غضبش
دو هفته شد که درون برز کین من دارد	ازانکه ماه تمامی نهاده ام لقبش
زحور زاده پری شکل کا آدم نیست	چه حاجت است که پرسم ز نسل و ز نسبش
بجوی آن صنمی رفت دل نیامد باز	زبا ز نامدنش شد دو زلف او سببش

زتیغ غمزہ او سر متاب خوشحالہ
فزوں زکشتن عشاق می شود طربش

خوشحال خان بابا کی فارسی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں ایران کا ہمہ گیر فرہنگ و ہنر۔ فلسفہ اخلاق اور تصوف ان کا ادب اور آرٹ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ خوشحال اپنی فارسی شاعری میں سعدی اور حافظ کے شیرین اور مترنم لب و لہجے سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ اس غزل میں شیراز کی شیرینی کا لطف آجاتا ہے۔

ازاو دل برگرفتن کار من نیست — کہ ازجان ہیر گشتن کار من نیست
چمن را گرچہ گلہا بس شگرفست — مگر ہمچو رخت گل در چمن نیست
مرا گوئی بگو وصف دہانش! — چگویم چوں درو جائ سخن نیست
من و سودائی رویت تا کہ ہستم — اگر چہ خود ترا بر رائ من نیست
غمت تا در دل و جانم وطن کرد — مرا در کوچۂ شادی وطن نیست

مرا خوشحال او پرسی کہ چونی
مگر از چہرہ حالش ہبرہن نیست

خوشحال خان خٹک نے اپنی فارسی شاعری میں ایک بڑی پیاری جدت پیدا کی جس کی وجہ سے ساری فارسی شاعری کے دامن میں وسعت پیدا ہو گئی۔ وہ جدت یہ تھی کہ انہوں نے پشتو کے قافیے اور ردیفیں فارسی شعروں میں اس طرح خوبصورتی سے استعمال کی ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر خوشحال بابا ان قافیوں اور ردیفوں کو اس طرح فارسی شاعری میں داخل نہ کرتے تو فارسی شعر پر زیادتی ہوتی۔ ان پشتو الفاظ نے ان کے شعروں میں بڑی خوبصورتی حسن اور رعنائی پیدا کی۔ اس انداز کی ایک غزل ملاحظہ کریں جس میں قافیہ اور ردیف دونوں پشتو ہیں۔

بگرد کوی تو گشتن مراد خما دے — بود کہ روی تو بینم کہ کعبۂ ما دے
من ایں جمال ترا کے مثال دریابم — کہ خود خیال تو از مہر و ماہ اعلیٰ دے
منم کہ غیر ترا در جہاں نمی یابم!! — خلاف نیست خبردار حق تعالیٰ دے
نمی تنوم متحمل برو زوعدہ وصال — بیا بیا کہ دلم خوار و زار بے تا دے

گمان مبر کہ بگردد ز عشق تو خوشحال
چرا کہ بر رخ خوب تو ڈیر شیدا دے

خوشحال خان غزل میں غنائیت کو بے حد پسند کرتے تھے۔ ان کی غزلیں موسیقی اور آہنگ سے بھرپور ہیں۔ بعض شعروں میں انہوں نے موسیقی پیدا کرنے کیلئے قافیوں میں تکرار سے کام لیا ہے۔ ایک غزل ملاحظہ ہو جس میں قافیہ کی تکرار نے ایک نیا آہنگ پیدا کیا ہے۔ پشتو قافیوں نے غزل میں نئی بات پیدا کر دی ہے۔

باتو خلوت بر گزینم در تو بینم سیر سیر	گرچہ وقت نوبہار است باد جود ڈھیر ڈھیر
پنجروزی بیش نبود صحبت گل با ہزار	ای دریغا در گلستان گر بماندی دیر دیر
آہوی چشم تو از شیران عالم دل ربود	گرچہ بر شیران ندیدی ہیچ آہو چیر چیر
گفتم ای جان جہان از من گہی یاد آیدت	گفت وقت قتل می آئی بیارم ڈیر ڈیر

می نیا ساید و می خوشحال بید ردت بلی
لشکر درد تو اکنون کرد دل را زیر زیر

خوشحال خان نے فارسی میں خوشحال اور کوہی دونوں تخلص استعمال کئے ہیں۔ لیکن فارسی غزلوں میں زیادہ تر کوہی تخلص سے کام لیا ہے۔

خوشحال خان اپنے فارسی اشعار میں کبھی تو حافظ شیرازی کی طرح جام شراب کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور کبھی سعدی کی طرح اپنے دل کے رازوں کو شعر کا جامہ پہناتے ہیں اور ان دونوں عظیم شعراء کے رنگ کو بڑی خوبی اور سلیقے سے نبھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ غزل ملاحظہ ہو۔

چشم مخمور تو آخر کار کرد	زاہد صد سالہ را میخوار کرد
در درون سینہ راز عاشقان	عشق اندر کوچہ ہا اظہار کرد
سخت می پیچد بر د عشق بتان	ہر کہ امروز از بتان انکار کرد
عاشق بے چارہ اندر عاشقی	بر جنون خویشتن اقرار کرد

روی زرد و آہ سرد و چشم تر
عشق کوہی را چنیں بیمار کرد

خوشحال خان نے اپنی فارسی شاعری میں اکثر چھوٹی بحروں سے زیادہ کام لیا ہے۔ ان چھوٹی بحروں میں لکھے ہوئے شعر تیز۔ دھار خنجروں کی طرح ادھر منہ سے نکلے ادھر دل میں پیوست ہوئے ان شعروں میں ان کی زبان سادہ۔ شیریں اور ترنم ہے۔ اس غزل میں سادگی اور تغزل ملاحظہ ہو۔

لبت از آبِ حیواں آب بردہ   رخت نور از رخِ مہتاب بردہ
ندانم در دو چشم او چہ جادوست   کہ از چشمانِ عاشق خواب بردہ
بتاب زلف و پیچاپیچ گیسو!!   صبوری از دل بیتاب بردہ
گراں بت را چو محراب است ابرو   من او را سجدہ در محراب بردہ
نہ تنہا دل ز خوشحال خٹک برد
کہ زہد از دستِ شیخ و شاب بردہ

چھوٹی بحر میں ایک اور غزل ملاحظہ ہو۔

دلم بردی اگر در قصد جانی   بکن بسم اللہ اینک ہر چہ دانی
بہ تیغ غمزۂ تو گر بمیرم!   بیابم از تو عمر جاودانی
لبانت را چہ گویم واں دو زلفت   میانِ ظلمت آبِ زندگانی!
وصال آں پری رو رایگان نیست   بباید باختن جاں رایگانی
اگر روہی ترا در دل الم نیست   چرا از دیدگاں خوں میچکانی

صنعت تلمیع اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں ایک شعر کا ایک مصرعہ ایک زبان میں ہو اور دوسرا مصرعہ دوسری زبان میں۔ خوشحال خان خٹک کے دیوان میں دس شعروں کی ایک مرصع غزل ہے جس میں مطلع کے علاوہ باقی تمام اشعار اس صنعت میں ہیں یعنی پہلا مصرعہ فارسی میں ہے اور دوسرا پشتو میں۔ اس صنعت کو استعمال کرنا کسی بھی کمتر درجے کے شاعر کے بس کا روگ نہیں۔ جب تک دونوں زبانوں پر کامل طور پر دسترس نہ ہو، ایسی غزل کہنا ممکن نہیں۔ شعر ملاحظہ ہوں۔

چہ کنم چہ چارہ سازم   چہ لہ زړہ ہم شئے کنار
بکہ گویم از فراقت   چہ ہم زړہ شہ پارہ پارہ
نکند بدل سرایت   کہ زاد ے کوم بے شمار
اگر از فراق میرم   لا بہ خوبنی شئے لہ دے کار

توچه سنگ دل نگاری ! چه می ستاوکړه ننداره
اے نگارمن خدرکن دو بشتلو ده آشنا ره
نزود زدرگے تو ! ! که خوشحال شرړی سل واره

خوشحال کی شاعری میں بڑی عجیب اور خوبصورت تجربوں سے واسطہ پڑتا ہے. جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں ان کو پشتو اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی اور اپنے فارسی اشعار میں پشتو کے خوبصورت اور موزوں الفاظ استعمال کرکے زبان کو زیادہ خوبصورت اور شیریں بنا دیا ہے. ان الفاظ کے استعمال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ان پشتو الفاظ کی بجائے فارسی کے لفظ استعمال ہوتے تو شاید اس قدر حسن، رعنائی، روانی اور سادگی پیدا نہ ہو سکتی. چند شعر ملاحظہ ہوں.

راشه بر چشم نشین ای شاه خوباں چیگل لمعهٔ خورشید را بر چشم باشد جای تل
تا ویل قند و نبات و شهد یکجا دیده ام آری آری آں لبان و آں دہان و آں ویل
سرد هم تا هر چه فرمائی ترا فرمان رواست از تو حکم ای بادشاه مهوشان و زما منل
زار و قربان تو گردم گر به تیغ خود کشی نی به تیغ دیگراں خونم ترا باشد بحل
نن بمن میگفت در کوی تو میرفتم رقیب شوخ چشمی بر نمیگردی ازیں کو بر شرل
چوں به تن گشتم ضعیف و لاغر و زار و نخیف نیست اندر فرقتت جاناں مرا خواب و خورل
تا جفا و جور از حد نهایت بیش کرد من نیاز و عجز و زاری می نمایم بو په سل

هیچ بے مثل تو دلبر می نیاید در نظر
زیں سبب خوشحال میل دل نمیدارد به بل

خوشحال خان خٹک کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود عمر بھر جنگ و جدال میں مصروف رہنے کے انھوں نے ہر موضوع کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس زمانے کے متداول موضوعات پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے. فلسفہ اس دور کا نہایت پسندیدہ اور دل پسند مضمون تھا۔ اور اس کا مطالعہ کم و بیش ہر آدمی کے لئے لازمی تھا خوشحال خان نے بھی اس مضمون کا مطالعہ کیا تھا اور بڑی گہری دلچسپی سے کیا تھا جس کا ثبوت ان کے فارسی اور پشتو کلام سے ملتا ہے.

وقت ہر دور میں انسان کا ایک مسئلہ رہا ہے جس کی طرف فلسفہ دانوں نے

مختلف زاویوں سے سوچا۔ خوشحال نے بھی وقت کی اہمیت کا احساس کیا اور اس احساس کا اپنی ایک مسلسل غزل میں اس طرح اظہار کرتے ہیں فرماتے ہیں۔

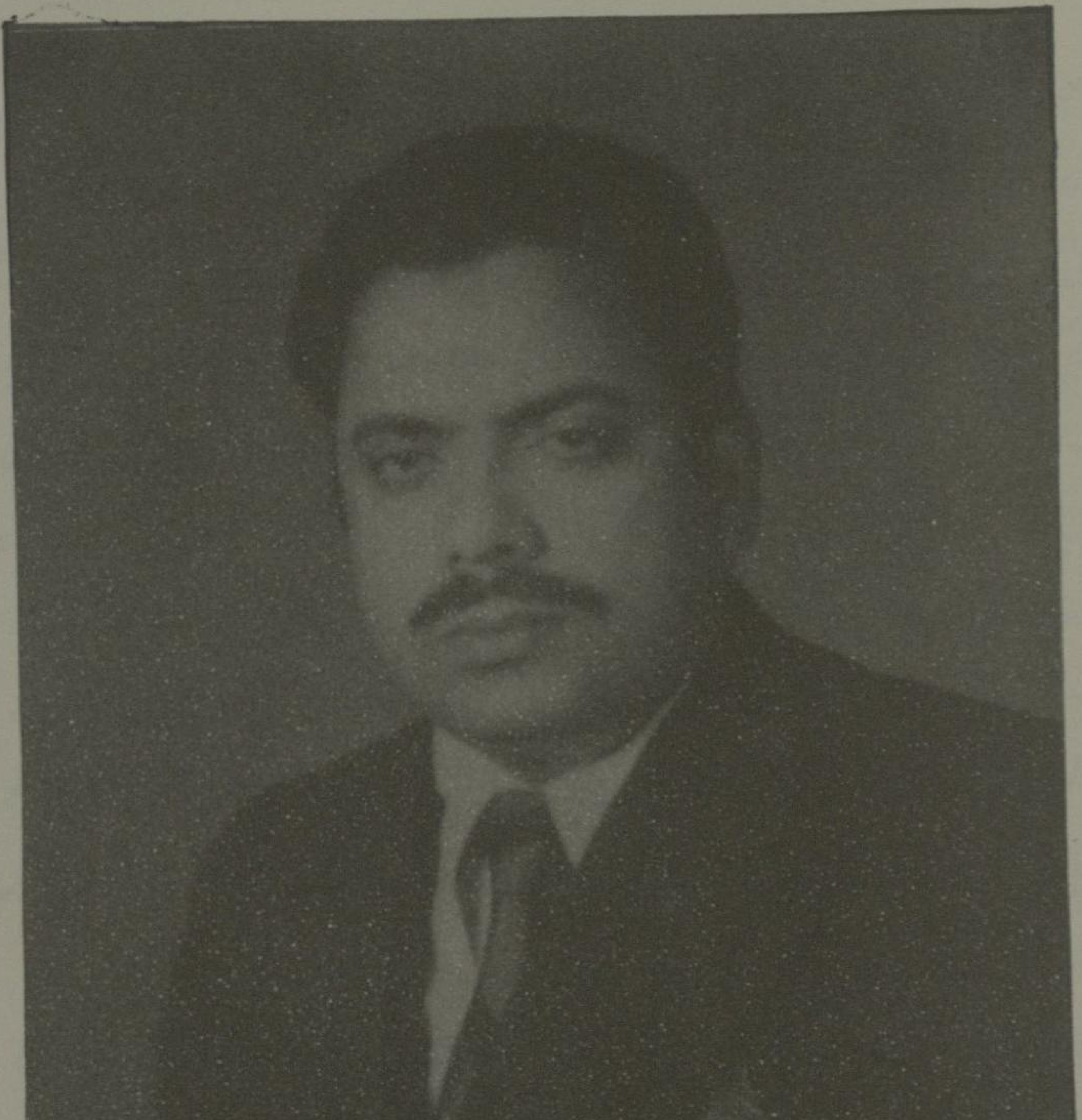
پیر فرتوت و ضعیفم دیدہ بر خوبانِ وقت | با منم سلطان وقت و با منم سلطانِ وقت
میرسد حیت بگوش اہل دل شام و سحر | اینکہ در ماتم نشیند عاقبت خندانِ وقت
آہ و واویلا کہ دیدم بی ثبات و بی بقا | عمر چوں باد بہار و عیش چوں پیمانِ وقت
نالۂ مرغانِ ایں گلشن بمن معلوم شد | آہ و فریاد و فغاں دارند در بستانِ وقت
دشمنِ وقت خودیم و خود روا داریم ما! | صد ستم از دست خود در ساعت از خوبانِ وقت

می زیم خوشحال خورم ہر زماں بر یادِ دوست
گرچہ از ما بردہ نقد وصل را ہجرانِ وقت

غرض خوشحال خٹک نے اپنے مختصر سے فارسی کلام میں فارسی ادب کی تمام خصوصیتوں اور خوبیوں کو سمویا ہے۔ اور اگر تفصیل میں جاؤں تو شاید گھنٹوں میری گفتگو ختم نہ ہوسکے۔ اپنے کلام کو ختم کرتے ہوئے آخر میں خوشحال خان کی ایک غزل پیش کرتا ہوں جو مجھے بےحد پسند ہے۔

حدیث روی او با من بگوئید | بہ بلبل از گل و گلشن بگوئید
نہ آن چشم و نہ آن مژگان نہ ابروست | بلای دین و جان و تن بگوئید
شب وصل است موی آنجا نماندہ | تو کی گنجی بہ پیراہن بگوئید

زلعل شکرین او نباتے
بگو ہی میرسد من من بگوئید



مطلوب الرؤوف

مطلوب الرؤف

خوشحال بطورِ وجودی

کبھی نہ کبھی آپ کو مصوری کی کلاس دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ درمیان میں ماڈل یا نمونہ مجسم ہوتا ہے اور مصوری کے طالب علم ارد گرد بیٹھے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے نمونہ مجسم کو کاغذ پر اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر ایک کا انداز ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے اور ہر ایک نقل فنکار کی سمجھ کے مطابق ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ دراصل ان میں سے کوئی تصویر بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتی ہر چند کہ چیز وہ ایک ہی ہوتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال عظیم مفکرین، شعراء اور فنکاروں کا ہوتا ہے۔ میرا یہاں یہ ہرگز ارادہ نہیں کہ میں افراد کے مابین Communication کے سلسلے میں کسی Theory کو زیر بحث لاؤں مگر اتنا کہنے کی ضرور جسارت کروں گا کہ خوشحال خان خٹک نے جو کچھ کہا یا لکھا اور تشریح کی اسے پڑھنے والوں نے اپنے زاویہ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کی۔ خوشحال کے کلام کے مافی الضمیر کو سمجھنے کیلئے صرف اس وقت کے سیاسی حالات یا معاشرتی اقدار ممد ثابت نہیں ہو سکتیں جب تک کہ اس کی شخصیت کو اس معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے نہ پرکھا جائے۔

وجودیت یا Existentialism انسانی خیالات کے ارتقاء کے لئے بیسویں صدی کی ایک اصطلاح ہے۔ انسان اور اس کے وجود کے مابین کیا رشتہ ہے۔ انسان اپنے وجود کو کس طریقہ سے Register. یا تسلیم کروانا چاہتا ہے۔ کیا وہ کسی واضح مقصد کے حامل ہے۔ اس کے حصول کے لئے اس کا طریقہ کار کیا ہے۔ اس تمام انداز فکر میں اہمیت اس فرد کی ہے جو سوچ کے دائرے میں ہے۔ معاشرہ بحیثیت ایک اکائی کے اپنے جزو کے انفرادی انداز کو قبول نہیں کرتا بلکہ اس سے Censor کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جزو اپنے تقین کے بل بوتے پر اپنے وجود کو علیحدہ برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ معاشرہ کے دوسرے اجزاء بھی اس اکائی کو Goal oriented بنا دیں۔

خوشحال خان خٹک بھی اسی قسم کی کیفیت کا شکار رہا۔ وہ اپنے اردگرد ان اوصاف حمیدہ کو اجاگر کرنے میں مصروف رہا جو اس کے معاشرہ کے افراد کو جوہر قابل بنا دیں۔ اور معاشرہ بحیثیت ایک اکائی دوسروں سے اپنے آپ کو تسلیم کروا سکے۔ فرد کیلئے چند اوصاف وہ اپنے کلام میں یوں بیان کرتا ہے۔ ے

مرد هغه چه همت ناک برکت ناک ۔۔۔ له عالم سره خوښه په زیست و زواک
مخ ئې مخ قول ئې قول عهد ئې عهد ۔۔۔ نه دروغ نه ئې فریب نه تش تپاک
لږ ویل ډیر ئې په خاموشئ کښې ۔۔۔ د غنچې غوندې خله پورې سینه چاک
چه خبره د پستئ و بلندئ شي ۔۔۔ په لوئ لکه آسمان په پستئ خاک
چه دا هسې ښه ویل کا نه پوهیږم ۔۔۔ چه خوشحال راوړو له کومه دا ادراک

(ترجمہ:- مرد وہ ہے جو ہمت والا ہو۔ برکت والا ہو۔ اس کا چہرہ روشن ہو۔ قول اور عہد کا سچا ہو۔ نہ جھوٹا ہو۔ نہ فریب دینے والا ہو۔ اور نہ صرف زبانیں کرتا ہے۔ باتیں کم اور عمل زیادہ کرتا ہے۔ غنچہ کی طرح اس کا منہ بند اور سینہ چاک ہو۔ پستی اور بلندی کی بات میں وہ بلندی میں آسمان اور تواضع میں۔ خاک ہو جائے۔ یہ جو اچھی باتیں کہتا ہے۔ نہ جانے خوشحال کو یہ ادراک کہاں سے نصیب ہوا مگر اس سے ہٹ کر اس کا تجربہ اپنے معاشرہ کے افراد کے بارے میں کچھ اور بتلاتا ہے۔

ښه سړي لعل و یاقوت دي موندہ نشي ۔۔۔ لکه نور کانړي لږ ندي ناکسان

اچھے آدمی لعل و یاقوت کی طرح نایاب ہیں۔ اور نکمے لوگوں کی پتھروں کی طرح کمی نہیں۔

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

پښتانه لکه مګس دی باندې ګرځي ۔۔۔ ورته ایښي د مغل د حلوا تال دے

افغانوں کے آگے مغلوں نے حلوے کا تھال رکھا ہوا ہے اور وہ اس پر مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے ہیں۔

خوشحال خان خٹک نے اپنی تحریر اور عمل سے ایک جدا معاشرہ تشکیل دینے کی کوشش کی۔ اس کا مقصد پختون معاشرہ کے لئے اچھے شہری تیار کرنا تھا۔ جو بے انصافیوں کے خلاف

یقین کے ساتھ سینہ سپر ہو سکیں، کچھ اس قسم کی کیفیت ہمیں ولندیزی مذہبی رہنما Soven Kierkeguard کے ہاں بھی ملتی ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اچھا عیسائی کیسے بنا جائے اس لئے مغربی اخلاقی قدروں کے ڈھانچوں کو پرکھتے ہوئے وہ Existentialism یا وجودیت کی تحریک کا بانی سمجھا گیا۔

جیسے خوشحال کے نزدیک اپنی زمین سے محبت عین ایمان ہے اور اس کی آزادی کے لئے تگ و دو جائز۔ اسی قسم کے تصورات ہمیں بیسویں صدی کے آغاز میں ہسپانوی شاعر اور ادیب Unamuno اونامونو کے ہاں ملتے ہیں۔ اس کی کتاب The Tragic Sense of Life نے جدید وجودیت کی تحریک کی نشوونما میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ Unamuno کے ہاں فرد کی زمین سے وفاداری کامیاب وجود کے تسلیم کئے جانے کی اولین شرط ہے۔

فلسفہ وجودیت میں اپنی ذات کا ادراک انسان کو بامقصد عمل کی راہ پہ لا کھڑا کرتا ہے مگر اپنی ذات کا ادراک ہو کیسے؟ کیا انسان اور اس کی ذات دو علیحدہ اکائیاں ہیں۔ کیا انسان اپنے وجود سے ہٹ کر کوئی چیز ہے۔ فرانسیسی ادیب Marelle یہ سمجھتا ہے۔

As man is/here and now/of Being/he distinguishes himself from other forms of existence. Man is always Being in the world as opposed to all else which is Being in midst of the world.

اسکی مثال کچھ اس طرح ہے کہ خوشحال خان خٹک اپنی ذات کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے ایک وہ جو جدوجہد کر رہی ہے، دوسری اس کے وجود سے باہر ہے اور مقصد کا علم رکھتی ہے وہ اسے تبلاتی ہے۔

تہ مطلوب بہ پورے شے د رسیدو ڈے   کہ تمامہ لار و ینو شی آلودہ

بات تمہارے مطلوب تک پہنچنے کی ہے چاہے تمام راستہ مشکلات سے پر ہی کیوں نہ ہو۔

جین پال سارتر اور البرٹ کامیوؔ وغیرہ دوسری جنگ عظیم میں فرانس پر جرمن قبضہ کے دوران تحریک مزاحمت کے بڑے فعال کارکن تھے، جنگ کے خاتمہ پر انکے ذہنی انقلاب کو ۵

۵ J. P. Sartre and ALUTCAMUS . . . .

ان کی تحریروں میں بڑے نمایاں طور پر محسوس کیا گیا۔ سارتر نے وجود کے دو رخوں کی نشاندہی کی ہے ایک Being/in/itself اور دوسرا Being/for itself فرق in اور for کا ہے۔ ایک کو ہم وجود کے اندر ذات کا شعور کہہ سکتے ہیں اور دوسرے کو ماحول کا۔ خوشحال خان خٹک اپنی ذات کا ادراک رکھتے ہوئے اپنے معاشرہ سے شعوری طور پر منسلک تھے۔ اس لئے ان کے بعض اشعار جو ان کی ذات کے حوالے سے ہیں ہمیں عجیب کیف ومستی و مردانگی اور بہادری کے جذبے کی بیداری سے ہمکنار کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے بعض دوسرے اشعار انتہائی تلخی اور نفرتوں کا بھرپور تاثر دیتے ہیں۔ Existentialism یا فلسفہ وجودیت ہمیں بیسویں صدی کے قلمکاروں کی تحریک نظر آتی ہے مگر شعور اور وجود کے مابین تقابلی تعلق ہمیں قدیم کلاسیکی ادب میں بھی نظر آتا ہے۔ اس صدی میں ادیب اپنی ذات کے حوالے سے معاشرہ سے بے شمار سوال کرتے ملتے ہیں جب کہ اس حوالے سے ہمیں ان سوالوں کے جواب قدیم ادبی نسخوں میں نظر آتے ہیں Existentialism بنیادی طور پر ہیومنزم'' Humanism پہ یقین رکھتا ہے اور یہ ایک ایسا تصوّر ہے جس میں خدا کے وجود کے لئے عقلی بنیاد پر کوئی مقام نہیں۔ انسان اور اس کا وجود باہمی ارتقائی انداز میں ہی سب کچھ ہے۔ دوسری طرف ہمیں خوشحال خان خٹک ایک راسخ العقیدہ مسلمان کے روپ میں نظر آتا ہے اسلام کی اخلاقی اقدار اسے دل وجان سے عزیز ہیں۔ اس کے ننگیالے کا تصور ہمیں حضورؐ کی ذات سے عبارت نظر آتا ہے۔ خوشحال خان خٹک کردار کے ارتقاء کے لئے محنت اور مسلسل کوشش کو ضروری سمجھتا ہے۔ اس کے ہاں وجودی فلسفے کی اخلاقی اقدار فرد کے حوالے سے ہمیں نظر آتی ہیں، مگر اختلاف ایک Monothiest اور athiest کا ہے۔ وجودی حضرات existence اور Essence. کے مابین ذہنی ورزش میں مصروف نظر آتے ہیں Existence Precedes Essence Essence Precedes existence کے دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ اس لئے منکر خدا ہیں۔ جب کہ خوشحال نے پورے اعتماد کے ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ کی ذات کو مرکز سمجھ کر اس جھگڑے سے جان بچائی۔ خوشحال ایک عالم ہے۔ بقول امیر حمزہ شنواری تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ ہر عالم کو دہریت پر کچھ نہ کچھ عرصہ پڑاؤ کر کے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ خود امیر حمزہ شنواری نے مکمل صوفی مسلک اختیار کرنے سے پہلے پانچ سال دہریت کے گزارے، مگر ہمیں یہ کیفیت

خوشحال کے کلام میں کہیں نہیں ملتی بشنایداس پر یہ دور گزرا بھی ہو مگر اس نے قلم بند نہیں کیا۔

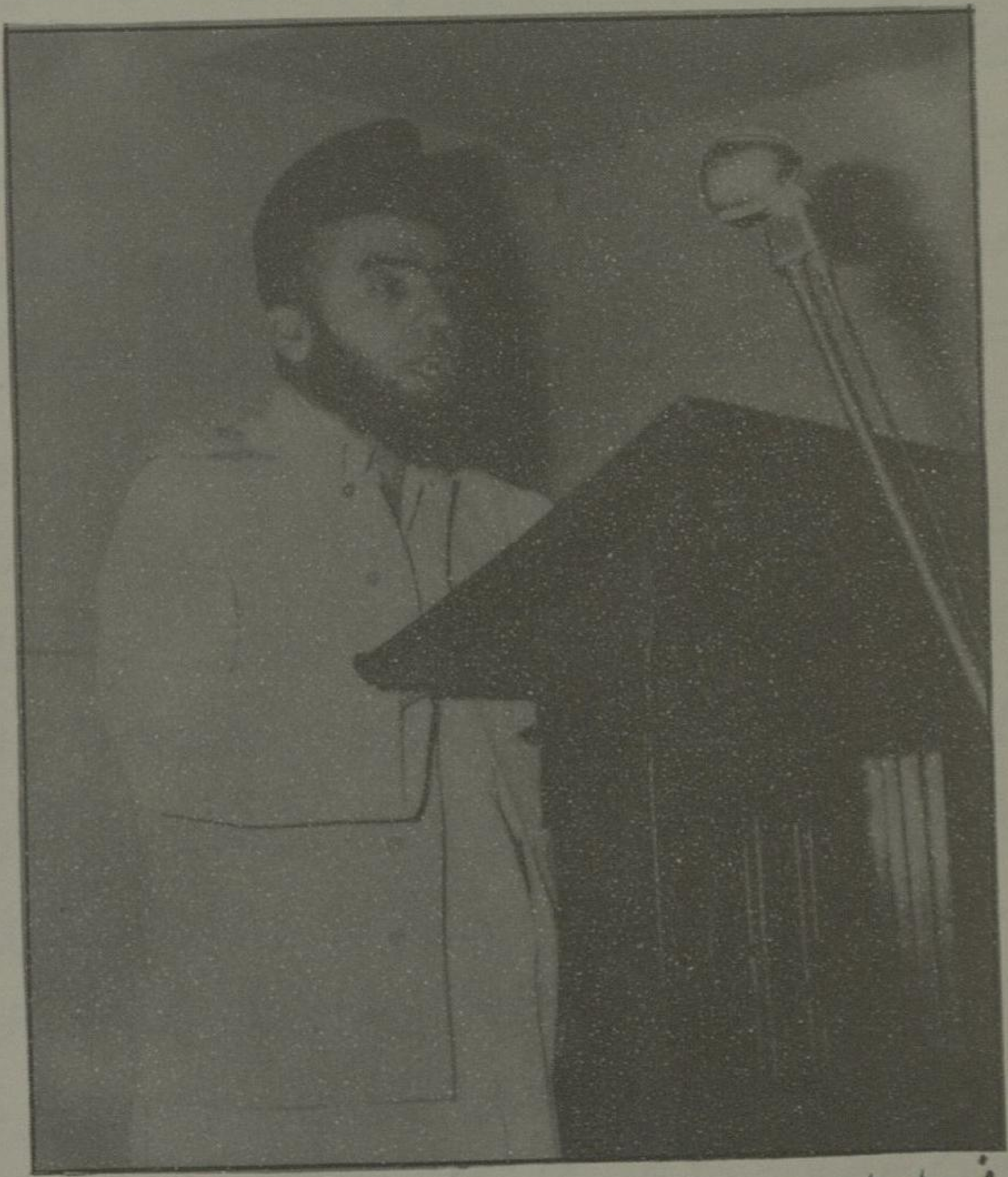
وجودیت اگرچہ ایک امید کا فلسفہ ہے اور اس میں انسان کو اپنے قول و فعل میں مختار سمجھا جاتا ہے مگر پھر بھی ہمیں اس میں ناامیدی کا انداز جھلکتا نظر آتا ہے۔ کچھ یہی حال خوشحال کا بھی ہے۔ وہ بظاہر اچھے وقت کی امید میں ہے مگر انداز اس کے برعکس ہے۔

به هر شام پسے سحر شته نظر ادکړه   عاقبت چه څوک غمژن شو بیا به بناد شی

دیکھو ہر شام کے بعد صبح ہے۔ جو غمگین ہوا آخر کار خوش ہوگا۔

غرض خوشحال اور فلسفہ وجودیت میں کافی کچھ مشترک ہے۔ Existentialism کی تحریک بنیادی طور پر قلم کاروں کی تحریک ہے۔ خوشحال ایک قلم کار ہے اور وہ ایک Existentialist. ہونے کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے۔

اس لحاظ سے وہ آج کا ادیب اور آج کا شاعر ہے۔



فہم دل راہی

فہم دل راہی

دیدہ ور خوشحال

خوشحال خان خٹک جیسی متنوع، گھمبیر اور پرشکوہ شخصیت کے بارے میں جب کوئی شخص کچھ لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس الجھن میں خود کو مبتلا پاتا ہے کہ وہ ان کی شخصیت یا شاعری کے کس پہلو سے آغاز کرے، اور کن محاسن اور اوصاف کو پہلے بیان کرے اور کن کا تذکرہ بعد میں ہو۔ لیکن میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کی شاعری کے معروف اصناف اور پہلوؤں کے تفصیلی ذکر سے گریز کیا جائے۔ اور صرف اشاروں ہی اشاروں میں دو تین باتیں عرض کروں پشتو زبان و ادب کے اس عظیم شاعر کی زندگی اور کارناموں سے مختصراً عام پشتون تو واقف ہیں لیکن پشتونوں میں بھی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو تفصیل سے ان کے کارناموں اور ادبی مقام سے متعارف نہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پشتونوں کے اس عارف، حکیم، عالم، مفکر اور مدبر سے عوام الناس تو کیا کہ خواص بھی زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ عام طور سے ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ خان بابا بس ایک شاعر تھا، اور مغلوں کے زمانے میں شاہجہان کا ساتھی اور اورنگ زیب کا مخالف تھا۔ اور بعد میں حکومت وقت اور اپنے خاندان کے لوگوں سے خراب تعلقات کی بنا پر اپنے قبیلے کی سرداری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ نیز زندگی کے آخری ایام بھی انہوں نے بڑی کس مپرسی اور یاس وحسرت میں گذارے، اور یہ حقیقت بہت کم لوگ جانتے ہیں، کہ خوشحال خان خٹک نے اپنی عظیم شاعری اور خداداد صلاحیتوں سے ایسے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ جو رہتی دنیا تک عظمت کی علامت بن گئے ہیں۔

یوں تو خوشحال خان خٹک کی زندگی بڑی پُرآشوب اور ہنگامہ خیز تھی اور انہوں نے کبھی بھی معمولی اور حقیر کاموں میں وقت ضائع نہیں کیا وہ حق گوئی اور بیباکی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور ان کی تلوار میں جو چمک اور تیزی تھی ان کی شاعری میں اس سے بڑھ کر قوت اور زور تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں اگر مغلیہ خاندان کے لئے

اپنا خون پسینہ ایک کیا۔ اوران کی سلطنت کو استحکام بخشنے میں ان کا ہاتھ ہوا تو دوسری جانب جب انھوں نے مغلیہ خانوادوں کی غلط پالیسیوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو آخر دم تک اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ اگرچہ مغلیہ سلطنت بڑی مضبوط تھی۔ لیکن خوشحال خان نے جس چیز کو حق سمجھا تو اس کی خاطر ایسی عظیم سلطنت سے یوں ٹکر لے لی۔ کہ اپنے مٹھی بھر ساتھیوں سمیت سلطنت مغلیہ کو ہلا کر رکھ دیا اوران کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔

شاعری کے میدان میں ان کا ہمسر اور ہم پلہ آج تک نہیں۔ اپنے اشعار کے ذریعے اگر انہوں نے پشتونوں کو ایک طرف خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کی تو دوسری طرف ان کو اتحاد اور اتفاق کا درس دیا۔ کسی قوم کے مدبّر اور مفکر کا یہی کام ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنی قوم کے افراد کو غلط اور بُرے کاموں سے باز رکھنے کی کوشش کرے اوران کو متحد اور متفق رکھنے میں سر دھڑ کی بازی لگا دے، اور اگر کوئی ان کی آزادی کو چھیننے کی کوشش کرے تو اس کے خلاف قومی مفاد کی خاطر جان و مال کا نذرانہ پیش کر دے۔ اس کے علاوہ اگر اس کی قوم میں کوئی عام اخلاقی یا سماجی مرض ہو، تو اس کے علاج کے لئے دن رات کوشاں رہے۔ لیکن خوشحال خان کو زندگی میں بہ وقت اس کا افسوس اور ارمان رہا۔ کہ اس کی قوم کے افراد اس کی نصیحت پر کان دھرنے والے نہیں ہیں یہی سبب ہے کہ انہوں نے حزن و ملال کے لہجے میں کہا۔

ځنے لوٹے دعوے لوم په زړه کښے   خو افسوس چه پښتانه واړه بے ننګ دی
هره چارد پښتانه تو مغل ښه ده   اتفاق ورځنے نشته دیر ارمان

(میں دل میں کئی بڑے دعوے رکھتا ہوں، مگر افسوس کہ سارے پشتون بے ننگ ہیں
پشتونوں کا ہر کام مغلوں سے بہتر ہے، پر افسوس ان کے ہاں اتفاق نہیں)

خوشحال خان خٹک نے اپنے کلام میں اکثر مقامات پر درس اتفاق دینے کی کوشش کی ہے اور نفاق و بے اتفاقی سے اپنا دامن بچانے کی تلقین کی ہے۔ ان کے دور میں اگر اتفاق و اتحاد کی اشد ضرورت تھی۔ تو آج اس کی ضرورت شدید ترین ہے۔ اور اقوام عالم میں مسلمانوں کو اپنا مقام پیدا کرنے کے لئے اتحاد کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر اپنی انفرادیت قائم کرنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیئے۔ آج اگر دنیا کے ایک ارب کے لگ بھگ مسلمان دوسری اقوام کے دست نگر اور خوشہ چین ہیں۔ تو اس کی وجہ محض بے اتفاقی ہے۔ خوشحال خان نے اتفاق و اتحاد کا درس اپنی ایک رباعی میں یوں مثال دیکر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

پنځه دِ کوتې دي که يوه نۀ وي   د تو وکوتو چار به د څه وي

دلاس خوبي ده په پنځه کوتې   چه سره جوړ وي کار به دِ ښه وي

(اگر تمہاری پانچوں انگلیوں میں سے ایک نہ ہو، تو اس کا کیا انجام ہوگا۔ ہاتھ کی خوبی پانچ انگلیوں پر ہے اگر یہ باہم متحد ہو تو کام صحیح ہوگا)

ان کے خیال میں انسان تب ہی آگے بڑھ سکتا ہے۔ جب وہ آپس میں اتفاق سے رہتا ہو۔ اور اگر نفاق نے اس کے بدن کو دیمک کی طرح چاٹنا شروع کیا۔ تو گلزار کی بجائے وہ خارزار کا مالک بن بیٹھے گا۔ اور ہمیشہ کے لئے بربادی اور تباہی کا شکار ہوگا۔ اتفاق کی یہ تعلیم وہ یوں دیتے ہیں ؎

چه درست گلزار دے د اتفاق دے   چه درست خارزار دے گنده نفاق دے

خار دے په نحره د خار کښا نوشي   هوښيار د گلو گلزار مشتاق دے

(اتفاق سراسر گلزار ہے۔ نفاق برا اور سراسر خارزار ہے۔ خار کے متلاشیوں کو خار مبارک، دانا گل و گلزار کا مشتاق ہوتا ہے)

ہم جب خوشحال خان خٹک کی عملی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں، تو ہمیں ان کے ہاں جس چیز کی خواہش اور بے پناہ تڑپ دکھائی دیتی ہے۔ وہ اتفاق کی تعلیم اور اس کا حصول ہے۔ ان کی زندگی کا گویا مقصد عظیم یہ تھا۔ کہ کسی طرح پشتون متحد اور متفق ہوں۔ اور یہ لوگ کاروان حیات میں دوسرے انسانوں کے ساتھ اس دھرتی کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں پشتونوں کو دل کی گہرائیوں سے برا بھلا کہنے میں اس لئے کوئی باک محسوس نہیں کیا۔ کہ جب وہ ان کو اتحاد کی جانب دعوت دے رہے تھے۔ تو ان لوگوں نے ان کی نصیحت پر کان نہ دھرے۔ ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ وہ دل کے پھپھولے دکھانا چاہتے تھے۔ لیکن کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھانا پسند نہ کیا۔ وہ ان کی آزادی اور حریت کے لئے تلوار چلا رہے تھے۔ جبکہ یار لوگ مغلوں کے حلوے مانڈے کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ یہ صورت حال جب وہ دیکھتے تو ٹھنڈی آہ بھرتے اور کہتے ؎

هر چار د پښتانه تر مغل ښه دے   اتفاق ورسره نشته ډير ارمان

(پشتون کا ہر کام مغل سے بہتر ہے۔ لیکن ارمان! کہ ان کے ہاں اتفاق نہیں)

وہ اپنی کشت ویراں سے ہرگز مایوس نہ تھا۔ وہ صرف اپنی حیات میں اس زرخیز

مٹی میں رنگ برنگ کے پھول دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی آرزو تھی۔ یہ اس کا نصب العین تھا۔ اور یہ اس کی ہمتوں اور صلاحیتوں کا فطری تقاضا تھا۔ وہ عظیم نابغہ اور نادر روزگار شخصیت جب انسانوں کے اس جم غفیر پر نظر دوڑاتا۔ تو وہ ان میں انسان، فرشتے، شیاطین اور جانور دیکھ پاتا۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ سجدوں کا لائق انسان شیطان یا جانور بن جائے یا بنتا پھرے وہ انسانیت پر فدا اور شیدا تھا۔ وہ گہرے تجربے اور عمیق نظر رکھتے ہوئے اس طرح کہنے میں حق بجانب تھا ؎

فکرم کو مے چہ دا انسان دی ۔۔۔ ځینے فرشتے دی ځینے شیطان دی
ځینے سړي دی خوئی خصلت کښے ۔۔۔ ځینے بے شکه لکه ددان دی

(انسانوں کے حال پر میں نے فکر کیا ہے بعض فرشتے اور بعض شیطان ہیں۔ بعض خصلت کے لحاظ انسان ہیں اور بعض بے شک جانور ہیں)

خان بابا نے ہمیں اپنے فکر و عمل سے اتفاق کا درس دیا ہے۔ اور اپنے اشعار میں وہ انسانوں میں یہ جوہر پیدا کرنے کے لئے زور دیتے رہے وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ اگر انسان اس کائنات میں چین اور سکھ سے رہنے کا متمنی ہے تو وہ جھوٹ اور نفاق سے خود کو محفوظ رکھے، اور اسے اتفاق کی دولت کے حصول کو نہ بھولنا چاہیئے۔ مسرت اور خوشی، اطمینان قلب اور افکار کی پاکیزگی اتفاق میں پنہاں ہیں، اور فتنہ و فساد، کشت و خون نفاق کے نتائج ہیں اس لئے ان کا کہنا ہے۔

خوشحو بنادی دی په دا آفاق کښے ۔۔۔ واړه بیامومی په اتفاق کښے
خوشحو غمونه یا محنتونه دی ۔۔۔ یا په دروغو یا په نفاق کښے

(آفاق میں جس قدر مسرتیں ہیں۔ یہ سب اتفاق ہی کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہیں جتنے غم اور مشقتیں ہیں۔ وہ جھوٹ یا نفاق کے ذریعے ہاتھ آتی ہیں)

اب وہ کون نادان ہوگا۔ جو جھوٹ اور نفاق کے کھوٹے سکے کو لیکر اتفاق کے کھرے سکے کو دریا برد کریگا لیکن افسوس! عقل و دانش سے معمور لوگوں کا بھی آئے دن یہ دھندا دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ مکر، فریب، جھوٹ، خیانت اور نفاق کی دکانداری چمکاتے ہیں۔ اور سادہ لوح لوگوں کو اپنے دام ہمرنگ زمین میں پھنسانے کے لئے دن رات سعی کرتے ہیں اور مخلوق خدا کے درپے آزار رہتے ہیں۔ اور جو لوگ اتفاق و اتحاد کا درس دیتے ہیں، بھائی چارے اور اخوت کے لئے تگ و دو کرتے ہیں۔ ان کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں۔ ان کو پچھاڑنے

کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا جاتا۔ جب تک جھوٹ اور نفاق کا غلبہ نہیں ہو پاتا۔ وطن عزیز میں اس قماش کے کھوٹے سکوں کا چلن زیادہ ہے آج بھی اس ماحول میں خوشحال خان خٹک کی طرح شاعر و ادیب حضرات کو اس محاذ پر لڑنے کے لئے چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ عوام الناس اپنے دوست دشمن میں تمیز کرنے کے اہل ہوں۔

خوشحال خان خٹک لوگوں کی کامرانی و سربلندی اس نکتے میں مضمر پاتا ہے، کہ لوگ جب اتفاق کی رسی مضبوطی سے تھامنے کے لئے بےقرار ہوں۔ اور نفاق سے نفرت کے خوگر ہوں وہ ظاہر و باطن ایک کرنے کا داعی ہے۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ انسان دو رنگ ہو۔ اور اس کا ظاہر باطن کی ضد بنا رہے اس کے ہاں دو طرح کے معیار یعنی
کا کوئی پیمانہ نہ تھا جس طرح آج کل کے انسانی معاشروں میں رواج پا گیا ہے اور روباہی اور چالاکی کو کامیابی کا حربہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ یک رنگ تھا اور یکرنگی کو محبوب سمجھتا تھا وہ کہتا ہے :۔

زار تو یک رنگی چہ زړۀ یو، یو ئے اقرار دے
هاچہ دوزبان وی پخل غمونہ دوبارہ کا

(میں یک رنگی پر فدا ہوں، کہ ایک دل اور ایک اقرار لئے ہوتا ہے اور جو دوزبان ہوتا ہے اس کے غم زیادہ ہوتے ہیں)

دَ خوشحال پہ زړۀ کښې یو دے ــــــ شوک تہ شہ لتہوی زړۀ

(خوشحال خان کے دل میں یکرنگی ہے کوئی کس لئے اس کا دل ٹٹول رہا ہے)

مطلب یہ ہے کہ وہ ایک ہی معبود یعنی اللہ تعالیٰ کا پرستار ہے۔ اس نے غیروں کی پرستش سے خود کو پاک کیا ہے وہ دو رنگ نہیں بلکہ یک رنگ ہے وہ اس شخص کو پسند کرتا ہے۔ جس کی گفتار اور کردار ایک جیسا ہو۔ جب کسی شخص کے قول اور فعل میں تضاد نہ ہو تو اس کی بات بھی اثرانگیز ہوتی ہے۔ اور اگر اس کے برعکس ہو تو پھر لوگوں کے دلوں میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی۔ اس لئے اس نے گفتار اور کردار کی موافقت پر زور دیتے ہوئے کہا :۔

چہ گفتار کردار ئے وارۀ موافق سرہ یو رنگ شی
هالہ هر رنگہ خبرہ، اثر کاندِ لہ قائلہ

چہ دَ زړهٔ لاره ئې یوه د خُلې ئې بله
په چاړهٔ ئې شه ځیګر شګاف شګاف

(جب کوئی گفتار اور کردار میں یک رنگ ہو جاتا ہے، تب اس کی بات اثر پذیر ہوتی ہے۔ جس کی زبان اور دل کے راستے الگ الگ ہوں۔ اس کا جگر خنجر سے چھلنی ہو جائے)

خوشحال خان خٹک نے ایک اور رباعی میں اتفاق اور نفاق پر اظہار خیال کرتے ہوئے یک رنگ دوست کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس بات کو ترس رہا ہے کہ کس طرح وہ یک رنگ یعنی مخلص دوست کو حاصل کر سکے گا۔ ؎

دولت د خلقو په اتفاق کښې دے — هغه به خوار شي چه په نفاق کښې دے
زوړ شوم یو یارِ یک رنګ ونه لید — زړهٔ مې تر اوسه په اشتیاق کښې دے

(لوگوں کی دولت اتفاق میں ہے، وہ ذلیل ہوتا ہے جو نفاق میں گرفتار ہو جاتا ہے میں بوڑھا ہوا، لیکن مخلص دوست کو نہ دیکھ سکا۔ ابتک میں اسی اشتیاق میں ہوں)

خوشحال خان بابا جب عوام کو بے اتفاقی اور فتنہ و فساد میں ملوث پاتے، تو یہ اُن کے دل و دماغ پر بڑا گراں گذرتا، وہ اس چیز کو برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آخر عمر میں یہ تک کہدیا کہ ؎

اتفاق په پښتانهٔ کښې پیدا نه شه — ګورستان له به درومه له ارمانه

(پشتونوں میں اتفاق پیدا نہ ہو سکا۔ میں دل میں یہی ارمان لیکر گورستان جاؤں گا)

لیکن وہ ہمت ہارنے والا نہ تھا۔ اور نہ میدان چھوڑ بھاگنے والوں میں سے تھا وہ جواں ہمت اور بلند فکر والا انسان تھا وہ تلوار کا دھنی اور قلم کا امین تھا۔ اس کا پیغام آفاقی بن گیا تھا اور اس نے یہاں تک کہہ دیا ؎

نه دین شته نه آئین شته — شرم لاړه په فرنګونه
مختورن ظالمان ډیر دی — چه اخلی قلنګونه
د عدل توره راواخله — ملک اسلام کړه په جنګونه

(نہ دین رہا نہ آئین، شرم گئی فرنگ دور چلی گئی، روسیاہ ظالم زیادہ ہیں۔ جو ناجائز کو جائز سمجھتے ہیں۔ تم عدل کی تلوار اٹھاؤ اور ملک میں جہاد کے ذریعے اسلام نافذ کرو)

اب اس کی آواز میں ایک حیرت انگیز جذبہ پیدا ہوا تھا۔ وہ برائی کے خلاف جہاد کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اور یہی وہ صدائے بازگشت تھی جس کو سید جمال الدین افغانی کی بے چین روح نے پان اسلامزم کا نام دیا۔ وہ مسلمانان عالم کو یکجا کرنے کے لئے قریہ قریہ، شہر شہر اور ملک ملک کی خاک چھانتا رہا۔ اور یہ وہ گوہر نایاب تھا جس کی خواہش شاعر مشرق نے کی، اور جس کے حصول کے لئے علامہ اقبال نے اپنی تمام شاعرانہ صلاحیتوں کو وقف کر کے رکھ دیا۔ اور اپنے افکار کا خلاصہ اسی ایک شعر میں یوں بیان کیا ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے　　نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

خوشحال خان خٹک نے قلم کو ارزاں نہیں کر دیا تھا۔ اور نہ وہ قلم کی بے حرمتی کا مرتکب ہوا تھا۔ اس نے اعلےٰ مقاصد کی خاطر اپنی شاعری کو وقف کیا تھا۔ جس کے ذریعے وہ انسانیت کو سکھ اور چین، امن اور دوستی سے ہمکنار کرنا چاہتا تھا۔ وہ دنیا سے نفاق کے بیج کو ختم کرنے کا آرزومند تھا۔ خوشحال خان کی شاعری کی مثال تو سمندر سے کسی طرح کم نہیں۔ جس میں قیمتی موتیوں کی کمی نہیں۔ خدا کرے کہ نہ صرف پشتون بلکہ سارا عالم اسلام ان کے افکار سے کما حقہٗ مستفید ہو کیونکہ انہوں نے ہمیں اتفاق کا جو درس دیا تھا وہ قرآنی نظریے کے عین مطابق تھا جس میں فرمایا گیا ہے کہ واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعًا و لا تفرقوا (تم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ اور فرقوں میں نہ بٹ جاؤ) نیز حضور پاکؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ کرہ ارض پر مسلمانوں کی مثال ایک جسد واحد کی مانند ہے۔ اگر جسم میں کسی بھی حصے یا عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو سارا بدن اس تکلیف میں شریک ہوتا ہے۔ اس طرح اگر دنیا میں کہیں بھی مسلمان کو تکلیف ہو، تو سارے مسلمان اس کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ کیا آج ہم اس نظریے کے تحت اپنی زندگیاں گذار رہے ہیں، یا اس اصول سے ہٹ کر دور صحراؤں میں بھٹک رہے ہیں۔



بیگم منوّر رؤف

بیگم منور رؤف

خوشحال بلند اقبال

آج سے تین سو سال قبل صوبہ سرحد کی اس سنگلاخ سرزمین سے ایک ایسا دیو ہیکل قومی پیکر اور جرّی جرنیل اٹھا جس نے اس خطۂ زمین کی تاریخ کا رخ موڑ کر رکھ دیا وہ کون تھا جس نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر مغل شہنشاہوں کو للکارا! افغانوں کی حمیّت کو ابھارا!! اور پٹھانوں کی روایات کو نکھارا!!! اور جو سرحد کا بے تاج بادشاہ بن کر اپنی ساری زندگی سر بکفن تیغ فگن اپنی سرحدوں کی حفاظت اور اپنے قبائل کی صداقت کا ضامن بنا رہا —؟

قبیلہ خٹک کے سردار شہباز خان کے نشیمن میں آنکھ کھولنے والا یہ شاہین — خوشحال بلند اقبال تھا — ! جو اپنی آزادی پسند اور حریت شناس مزاج کی وجہ سے سرداری شان و شوکت سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھا۔ ع

کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ

وہ شاہین کی ان تمام صفات سے متصف تھا جو اسے دیگر تمام پرندوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ سعیٔ پیہم اور جہد مسلسل سے اس کی زندگی عبارت تھی۔ ؎

پلٹنا جھپٹنا جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

بہادری اور جفاکشی اس کی رگ و پے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ذہانت کی چمک اور عزم و استقلال کی دمک اس کی آنکھوں سے مترشح ہوتی تھی۔ حریت شناسی کے نشہ میں مخمور وہ قبائل کو درس حریت دیتا پھرتا تھا۔ ! اس نے صحیح معنوں میں پختونوں کو ہنگامۂ حیات اور میدان کارزار سے آشنا کیا اور خود بھی تاحیات مغل تاجداروں کے خلاف پختونوں کی عظمت و غیرت کا نگہبان بنا رہا۔ خود کہتا ہے،

دا فغان پہ ننگ م او تړلہ توره   ننگیالے د زمانے خوشحال خټک یم

"میں نے پٹھانوں کی عزت اور آبرو بچانے کے لئے تلوار اٹھائی ہے، میں زمانہ بھر کا بہادر اور غیرت مند خوشحال خان خٹک ہوں۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر شمال مغربی سرحد پر اپنا تسلط قائم کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھا، خوشحال بابا اپنے وطن کی سرحدوں کا محافظ بن کر اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت کے ساتھ میدان کارزار میں کود پڑا۔ اسکی رجز خوانی اور شعلہ بیانی نے قوم کے جوانوں کا لہو گرما دیا تھا، وہ سب ایسی بے جگری سے لڑے کہ مغلوں کو بے نیل و مرام واپس لوٹنا پڑا۔

خوشحال بابا آزادی کا وہ دیوتا تھا جسنے اپنے قبائل میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ:۔

پٹھانوں کے لئے سوائے تلوار کے کوئی راہ نجات نہیں ہے۔"

حریت پرست، حریت شناس اور حریت پسند خوشحال کا قول تھا:۔

"میرے نزدیک اس زندگی سے جو غیرت سے نہیں گزرتی موت ہزار درجے بہتر ہے۔"

اور یوں اس نے پختونوں کو ان کی عظمتوں کا نگہبان بھی بنایا اور انہیں غیرت و حمیت کا عرفان بھی بخشا، انہیں پیغام عمل بھی دیا اور درس اتحاد و اتفاق بھی سنایا۔ اس کے اس پیغام کو حکیم امت علامہ اقبال اپنے اشعار میں یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم   کہ ہو نام افغانیوں کا بلند

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے   ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

مغل سے کسی طرح کم تر نہیں   کہستان کا یہ بچہ ارجمند

حقیقت یہ ہے کہ خوشحال بابا جیسے مرد آہن نے مغلوں کی طاقت کا تن تنہا جس بے جگری سے مقابلہ کیا وہ میں سمجھتی ہوں خوشحال بابا کے اس قول پر دلیل ہے۔

"شیر کی مردانگی لشکر کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ تن تنہا اپنی ہمت و قوت کا مظاہرہ کرتا ہے"

اس نے مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے خلاف تلوار بھی اٹھائی اور قلم بھی استعمال کیا اور یہ مسئلہ کہ قلم کی طاقت تلوار سے زیادہ ہے یا تلوار کی قلم سے زیادہ۔ اس حسن و خوبی سے طے کیا کہ بیک وقت صاحب سیف و قلم بن بیٹھا۔

اس کا قلم افغان قبائل کو مغلیہ حکومت کے خلاف ہمیشہ اکساتا رہا اور رزمیہ نظمیں لکھ لکھ کر جوان خون کو بھی جوش دلاتا رہا۔ اور اس پر بس نہیں کی بلکہ جہالت کے اس

تاریک دور میں اس نے اپنے قلم کی بدولت علم و ادب کا بھی خوب چرچا کیا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خوشحال بابا کے کردار میں ہمیں سیف و قلم کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ ایک صاحب قلم، دانشور، ادیب اور شاعر بھی تھے۔ اور ایک جنگجو نڈر اور بیباک مجاہد بھی۔ میں سمجھتی ہوں اس صاحب سیف و قلم کے عالمانہ اور مجاہدانہ کارنامے رہتی دنیا تک یاد کیے جائینگے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اس مرد صاحب کمال و صاحب جلال کی ۷۶ سالہ (۱۶۱۳ تا ۱۶۸۹) زندگی جس جہد مسلسل سے عبارت رہی وہ نہ صرف پختونوں کے لئے بلکہ پاکستان کے تمام مسلمانوں کیلئے ایک درس ہے ـــ !ایک نمونہ ہے ـــ !! قابل تقلید نمونہ ـــ !!!

تیرہ سال کی عمر سے لیکر زندگی کے آخری دور تک خوشحال بابا نے جس جہد مسلسل اور فکر و عمل کا نمونہ پیش کیا اور جن تخلیقی قوتوں کا اظہار اپنے قلم کے ذریعہ سے کیا ہے وہ انہیں تلوار کا دھنی بھی قرار دیتا ہے اور قلم کا بادشاہ بھی ـــ انکی ساری زندگی ہمارے لئے ایک دعوت فکر ہے میدان کارزار میں وہ بیمثال بہادری اور شجاعت کے پیکر تھے جبکہ دنیائے شعر و ادب میں وہ بابائے پشتو کے نام سے ملقب ہوئے۔

فارغ بخاری صاحب خوشحال بابا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"وہ خود ہی اپنے پیغام کا داعی اور خود ہی عامل تھا۔ اس لئے اسے بیک وقت تلوار اور قلم دونوں سنبھالنے پڑے ۔۔۔۔ اس کی ساری زندگی میدان جنگ میں دشمنوں سے نبرد آزمائی میں کٹی۔ لیکن اس نے ساتھ ساتھ قلم بھی سنبھالے رکھا۔ وہ بیک وقت ایک بہادر جرنیل، ایک عظیم شاعر، ایک سحر نگار ادیب اور ایک جادو بیان مقرر تھا۔"

درحقیقت یہ خوشحال شاعر خوش مقال بیک وقت شعلہ اور شبنم کی متضاد خصوصیات سے متصف تھا میدان کارزار میں وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھا اس کی تلوار کی جھنکار کے آگے بڑے بڑے سورما جرنیلوں کے حوصلے پست ہوتے تھے بقول شخصے "وہ اپنی زندگی کے مسرور ترین لمحات وہ سمجھتا ہے جب چمکتی ہوئی تلواروں اور زرہوں کے ٹکراؤ سے بجلی پیدا ہوتی ہے" دوسری جانب دنیائے شعر و ادب میں وہ شبنمی جذبات و احساسات کے ساتھ پشتو جیسی ثقیل زبان میں رعنائی و لطافت کے جواہر گھولتا ہوا اور اس بے برگ و گیاہ خطۂ زمین کو اپنے شاعرانہ

تخیل سے گل وگلزار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ خوشحال بابا نے کم وبیش چالیس ہزار اشعار لکھے ہیں انہوں نے ۲۰ سال کی عمر میں شاعری کی ابتدا کی تھی۔ اور اس عمر کے بعد شعر وادب کا کوئی موضوع ایسا نہ رہا۔ جو اس شاہین کے پرواز تخیل سے بچ سکا ہو۔

بابا خوشحال کی شاعری نیچرل شاعری ہے جس میں اس زمانہ کے ماحول کی عکاسی بھی ملتی ہے اور اس کی واردات قلبی بھی۔ انہوں نے اپنے اردگرد جو کچھ دیکھا اور اسے جس طرح محسوس کیا من وعن بیان کر دیا۔ ایام اسیری میں اپنے وطن کی یاد اور اس کی محبت کے نغمے قلم بند کئے اور ایام آزادی میں قوم اور وطن کی عزت وتحفظ کے لئے رزمیہ نظمیں لکھیں۔ ان اشعار میں دل پر گزری ہوئی کیفیات کا بے تکلف اظہار ہے۔ تکلف تصنع اور آورد کا کہیں کوئی شائبہ محسوس نہیں ہوتا۔

میں سمجھتی ہوں کہ اگر ان کے اشعار کو صحیح طور پر جمع کیا جائے تو ان کی مدد سے نہ صرف ان کی سوانح حیات مرتب ہو سکتی ہے بلکہ اب سے تین سو سال پہلے کے پختونوں کی تاریخ بھی ترتیب پا سکتی ہے۔ ان کے اشعار پڑھتے وقت پختونوں کی زندگی، ان کے کردار، ان کی خوبیاں ان کی خامیاں سب کچھ پردہ سکرین پر ابھرنے والی فلمی تصویروں کی طرح قاری کے ذہن میں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ افغانوں کے کردار کی انہوں نے جس جس طرح نشاندہی کی ہے اسے پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال نے انہیں شاعر افغان شناس قرار دیا ہے۔ اور جب وہ افغانوں پر ان کی کمزوریوں کو آشکارا کرتے ہوئے ان کمزوریوں کے خطرناک نتائج سے قوم کو آگاہ کرتے ہیں تو ایسے موقع پر ہمارے حکیم الامت خوشحال بابا کو حکیم ملت افغانیاں کے معزز لقب سے ملقب کرتے ہیں۔

بابا خوشحال کی شاعری دراصل ایک انقلابی شاعری ہے اس میں قوم کے لئے پیغام ہے۔ غیرت وحمیت کا پیغام۔! اتحاد واتفاق کا پیغام۔!! فرماتے ہیں:۔

"قومیں جب آپس میں متحد ہو جائیں تو شاہوں کو ان کے سامنے جھکنا پڑتا ہے"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

کہ همت او حمیت غیرت په کښې دی ـــــ تو ښښه نه بهتر هغه غلام

وہ غلام بھی اپنے آقا سے بہتر ہے جو ہمت وحمیت اور غیرت رکھتا ہو۔"

ان کے نزدیک غم اور مصیبت انسان کی ہمت و قوت کی کسوٹی ہے۔

اس کے ساتھ ہی وہ تغزل کی چاشنی سے بھی پوری طرح آشنا تھے۔ انہوں نے اپنی عشقیہ شاعری کے ذریعہ پشتو ادب کو جو دلکشی اور رعنائی بخشی ہے اس سے پشتو شاعری بڑی جاندار ہو گئی ہے اور یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ ان کے والہانہ جذبات شوخیٔ مزاج اور رنگینیٔ طبع نے پشتو غزل کو محبت کا بڑا خوبصورت سنہری روپ بخشا ہے۔ اور اس طرح ان کے بلبل خامہ کی رنگین نوائی نے پشتو ادب کو مالا مال کر دیا۔

آخر میں میں کہنا چاہوں گی کہ غالب کی طرح خوشحال بابا کو بھی اپنی عظمت کا پورا پورا احساس تھا۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے ملاحظہ ہو۔

"میں نے نظم میں لعل و گوہر پرو دیئے۔ اور مصنوعی موتی بیچنے والے بنجارے کو میں نے مالا مال کر دیا۔"

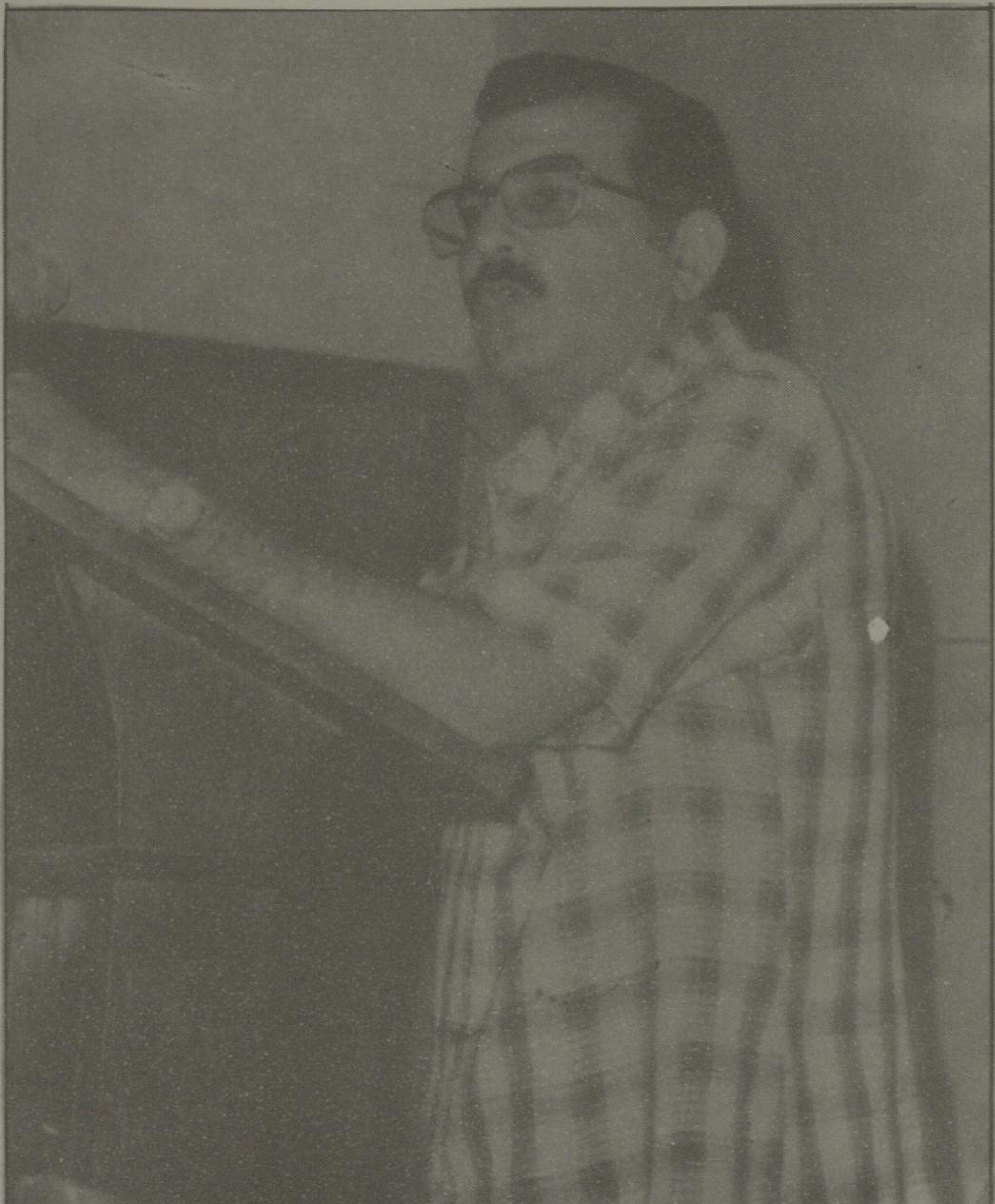
"میں نے جب پشتو شعر کا علم بلند کیا تو ملک سخن کو سمند خامہ کے ذریعہ فتح کیا۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

مدعی دتو رے شپے اردا دی کے و و　　　دسهیل غوندم ځان باندخرګند کړو

میرے مدمقابل کی حیثیت جگنوؤں کی سی تھی میں نے ستارہ سہیل بن کر اپنے آپ کو منوا لیا۔"

یہ ستارۂ سہیل جب خوشحال ہو تو بھلا کیوں نہ بلند اقبال ہو۔!



جمیل صدیقی

جمیل صدیقی

جمہوریت کا علمبردار

دوسری صدی ہجری کے ربع اول میں امیر کروڑ کی پشتو شاعری کے نشانات ہمارا تاریخی اثاثہ ہیں اسی دور کے بزرگ شعراء میں بیٹ نکہ ۔ اسعد سعدی ۔ شیخ متی ۔ بختیار کاکی ۔ اکبر زمینداوری کے نام بھی شامل ہیں جب کہ دوسرے دور میں مرزا خان انصاری ارزانی دولت لوہانی وغیرہ کے نام آتے ہیں پشتو شاعری کا تیسرا دور جس میں اشرف خان ۔ حمید بابا اور کاظم خان کے نام نمایاں ہیں وہی دور ہے جس میں حضرت رحمان بابا اور خوشحال خان خٹک آسمانی شاعری پر آفتاب و مہتاب کی طرح چمکے اسی دور میں پشتو زبان کو پھلنے پھولنے کے مواقع میسر آئے اور اس نے دیگر زبانوں خصوصاً عربی و فارسی سے نیاذ خیرہ الفاظ اپنے دامن میں سمیٹا ۔

جہاں تک اس زبان کا تعلق ہے یہ نہ صرف صوبہ سرحد اور بلوچستان کے ایک بہت بڑے وسیع و عریض علاقے کے حریت پسندوں اور جیالے پٹھانوں کی زبان ہے بلکہ اس کا شمار دنیا کی اُن زبانوں میں بھی ہوتا ہے جن کا دامن مخصوص روایات ثقافت ۔ تہذیب اور طرز زندگی کی عکاسی کرنے والے گیتوں اور پھولوں سے مالا مال ہے اس زبان میں ادب ۔ فلسفہ ۔ تصوف ۔ تاریخ ۔ تہذیب ۔ سیاست سبھی کچھ وافر ہے ۔

چونکہ یہ خطہ مختلف ثقافتوں کا سنگھم رہا ۔ وسط ایشیا میں ترکوں اور یونانیوں کا مرکز بنا اور ایک طویل عرصے تک آریاؤں کا مسکن بھی ۔ یا مغلوں کے لئے اس نے باب خیبر کا بھی کام دیا ۔ ہن ۔ ستھین ۔ پارتھین ۔ کلدانی باختری اور مختلف نسلوں اور تہذیبوں کا مرکز ہونے اور رہنے کی حیثیت سے اس علاقے کی زبانوں خصوصاً پشتو اور ہندکو کو دیگر زبانوں سنسکرت ۔ ہندی ۔ فارسی اور عربی وغیرہ سے نیاذخیرہ الفاظ میسر آیا ۔ اور اس نے جملہ زبانوں سے پھولوں کا ایک حسین گلدستہ بنا کر خوبصورت

امتزاج کی شکل اختیار کریں۔

پشتو شاعری کے اس تیسرے دور میں جسے ہم ایشیا میں مغلیہ دور کے نام سے بھی منسوب کر سکتے ہیں پشتو ادب میں عارفانہ کلام کے ساتھ ساتھ رزمیہ شاعری کی بھی داغ بیل پڑی اور یہی وہ دور ہے جس میں حضرت رحمٰن بابا اور حضرت خوشحال خان خٹک نے جنم لیا۔

خوشحال کی اپنی شاعری کے توسط سے ان کی سن پیدائش تقریباً ۱۰۲۲ھ ہے آپ ۲۸ برس کے تھے کہ آپ کے والد شہباز خان لڑائی کے دوران شہید کر دیئے گئے اور ۱۰۵۰ھ میں آپ کو قبیلے کی سرداری سونپ دی گئی۔ ۱۰۶۷ھ تک آپ اپنے والد کے منصب کے مطابق مغلیہ سلطنت سے وابستہ رہے اور شاہجہان کا ساتھ دیا ۱۰۶۸ھ میں اورنگزیب کی تخت نشینی کے بعد آپ کے اور ان کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے اور آپ نے ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہی وہ دور ہے جہاں سے خوشحال خان نے شہنشاہیت کی حدود و قیود سے آزاد ہو کر ایک آزاد پٹھان کی حیثیت سے پختون قوم کے لئے ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا اور آنے والی نسلوں کے لئے نئے راستوں کا تعین کیا۔ ع

"تو نے انسان کی سرد و بے جان رگوں میں محبت کا تازہ لہو بھر دیا
تو نے پختون کی عظمتوں کو شناسائے مہر مبین کر دیا۔"

خوشحال خان نے اپنی شاعری کے متعلق بعض مقامات پر نشاندہی کی اس سلسلہ میں انہی کے شعر کا ایک ترجمہ ہے "بیس سال کی عمر میں میں نے شعروں کی دیگ چولہے پر چڑھائی جب کہ ساٹھ سال کی عمر میں یہ دیگ پک کر تیار ہو گئی"۔

آج کم و بیش چار سو سال گزر جانے کے باوجود ان کی شاعری۔ کلام اور ادب کی تر و تازگی۔ لطافت و نکھار اور افادیت معنویت اسی طرح برقرار ہے اور پشتو ادب کا طالب علم اس سے برابر استفادہ کر رہا ہے یہ درحقیقت اسی صاحب سیف و قلم کا اعجاز ہے جس کے کلام نے اسے زندہ و تابندہ کر دیا۔ ع

وہ میرا صاحب سیف و قلم کہ جس کا وجود | خلوص دل زدگان کیلئے نظیر بھی ہے
ہے اس سے لہو گرم حریت مآبوں کا | وہ ہر ستائے ہوئے دور کا ضمیر بھی ہے

خوشحال بابا نے اپنی شاعری کی ابتدا، ایک ایسے دور میں کی جب انسانی قدریں دم توڑ رہی تھیں سرمایہ داری اور جاگیرداری کا نظام مسلط ہو چکا تھا۔ ملک میں شہنشاہیت کا دور دورہ تھا۔ غریب و مظلوم عوام ظلم و بربریت کا شکار تھے۔ عدل و انصاف اور جمہوریت و مساوات نام کی کوئی چیز نہ تھی ایسے حالات میں انہوں نے ادبیات کا سہارا لیکر عوام کو شعور ملی اور ذہنی بیداری بخشی اور اپنے محسوسات کی وسعت و تجربات کی روشنی میں فکر و علم کی صحت سے شعر و سخن کے میدان میں ایسا تاریخی کردار ادا کیا جو آج تک پشتو ادب کا لازوال سرمایہ ہے۔ ان کے کلام سے یہ معلوم کرنا چنداں مشکل نہیں کہ انہوں نے اپنے ذوق سلیم۔ طبع رسا اور جودت و فطانت سے شعر و سخن میں ہی نہیں بلکہ عملی زندگی اور حصول آزادی کی جد و جہد میں بھرپور کردار ادا کیا۔ آپ کے کلام میں جہاں زندگی اپنی پوری تابناکی اور بوقلمونی کے ساتھ موجود ہے وہاں آپ کا مطالعہ کائنات، غیر محدود تجربات جرأت و بے باکی اور ایمان کی حرارت کا شدید اظہار بھی ہے۔ آپ نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی جس میں غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعہ کے انداز میں حمد، نعت، منقبت کے علاوہ فقہ، طب، تاریخ، رزم، بزم، عشق غرضیکہ سبھی کچھ محیط کیا۔ آپ ہی کا ایک شعر ہے:۔ ؏

میری رباعی، قطعہ، مثنوی   جڑے ہوں جیسے ہیرے کے لعل موتی سبھی

بابا نے نہ صرف وفاداری، حریت، غیرت، حمیت، بہادری، جفاکشی، مہمان نوازی، اعتبار، اعتماد، جرأت، شجاعت کا درس دیا بلکہ انہوں نے اخلاقی، اجتماعی عشقیہ، رزمیہ، بزمیہ، المیہ، طربیہ، مزاحیہ شاعری میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جس میں سیاست، فلسفہ، حکمت، تصوف، تاریخ، منظرکشی، شکاریات، رموز سلطنت، فنون سپہ گری، سربراہ مملکت کے لئے ضروری ہدایات سبھی عنوانات پر مکمل تبصرہ موجود ہے۔ وہ قوم کو ایک ہی وقت میں وہ سبھی کچھ سکھانا چاہتے تھے جو حصول آزادی کے لئے زندہ قوموں کا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔ بابا نے تنظیم، وحدت امت، حب الوطنی، جہانگیری و جہاں بینی کے درس کے ساتھ ساتھ شہنشاہیت و حاکمیت کے خلاف عوام کو ابھارا اور انہیں خداوند قدوس کی عظیم حاکمیت

کا احساس دلایا۔ بابا نے انسانی حقوق کے تحفظ اور بازیابی کے لئے اپنی جدوجہد کا آغاز پٹھان قوم کو یکجا کرنے۔ غیرت ملی کا شعور بیدا کرنے کے لئے جنگجویانہ قصے اور توپ و تفنگ کے ذکر سے کیا اور اپنی تحریر و تقریر سے جذبہ عسکریت اور فلسفہ جہاد کو اجاگر کیا۔ آپ کے ایک شعر کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

"اسلحے سے محبت نہ کرنے والا شخص بھلا کیسا انسان ہے اُسے تو مہندی اور کاجل لگا کر کسی کی آغوش میں جانا چاہیئے"۔

آپ کا یہ شعر جرأت و بیباکی کا منہ بولتا شاہکار ہے فرماتے ہیں۔

"اس وقت نہایت طمانیت اور خوشی محسوس کرتا ہوں جب میرے چاروں طرف سفید "تلواریں اور چمکتے ہوئے زرہ بکتر" نظر آتے ہیں اور میری آنکھیں اس سے چندھیا جاتی ہیں"۔

اپنے جواں سال بیٹے کی مرگ پر یہ اشعار کہے "کاش تو ایک غیرت مند پٹھان کی طرح میدان جنگ میں داد شجاعت دیتا ہوا مر جاتا کیونکہ جو جوان ملک و ملت کی عزت و ناموس پر کٹ مرتا ہے اس کا باپ فخر سے اپنا سر بلند کر لیتا ہے"۔

خوشحال بابا نہ صرف اپنے دور کا ایک عظیم انقلابی شاعر تھا بلکہ وہ بیک وقت بے مثال ادیب۔ شعلہ نوا خطیب۔ بلند پایہ مفکر۔ بہترین جرنیل۔ ماہر فلکیات۔ اعلیٰ طبیب۔ بہترین شہسوار۔ ماہر شکاریات۔ نباض فطرت۔ اور رموز مملکت پر عبور رکھنے والا انسان تھا۔

ایک تاریخی جائزے کے مطابق بابا نے چار سو کے لگ بھگ کتب لکھیں جس میں چھوٹے کتابچے اور مفید و معلوماتی مضامین بھی شامل تھے۔ لیکن اس کے برعکس پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے والی خاتون (محترمہ خدیجہ فیروز الدین) نے بابا کے کتابوں کی تعداد تین سو پچاس بتائی ہے۔ جب کہ ایک دوسرے محقق میجر راورٹی نے ان کی تصانیف دو سو پچاس لکھی ہے۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ بابا نے کلیات خوشحال مرتب کر کے فارسی ادب کی بالا دستی کو ختم کر دیا۔ علاوہ ازیں بابا کی مشہور تاریخی کتابوں میں باز نامہ۔ فضل نامہ۔ دستار نامہ۔ سوات نامہ۔ فراق نامہ۔ فرخ نامہ۔ صحت البدن

ہدایہ ۔ زنجیری ۔ آئینہ وغیرہ معروف ہیں

بابا کے صرف ایک دیوان کو جسے ہم فارسی کے فردوسی کے شاہ نامہ سے تشبیہ دیتے ہیں جس میں ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل طویل و وسیع نظم جس میں سینکڑوں داستانیں بیسوں عنوانات اور گوناگوں حالات و واقعات بلکہ رزمیہ قصے ، عشقیہ داستانیں موجود ہیں اسی طرح کلیات خوشحال جو کم و بیش چالیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے اس کا ایک ایک شعر ہمہ گیر وسعت لئے انقلاب آفریں شاہکار ہے ۔

بابا کی دیگر مشہور کتابوں میں " دستار نامہ " وہ نثری کتاب ہے جس میں امور مملکت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ فنون سپہ گری اور فنون لطیفہ پر بھرپور بحث ہے امیر سلطنت کے لئے بہترین ہدایات ہیں ۔

اسی طرح " باز نامہ " میں شکاریات کے اصول وضع کرنے کے ساتھ ساتھ شکار کی افادیت اور طریقہ کار پر دلچسپ انداز میں تبصرہ ہے ۔ ان کی کتاب " سوات نامہ " خطہ سرحد کی خوبصورت وادی کی تعریف میں کم و بیش چار سو اشعار پر مشتمل ایک ایسی مثنوی کی صورت میں لکھی گئی ہے جس میں وادی کے حسن کی تعریف کے علاوہ جغرافیائی محل وقوع اور وہاں کے باشندوں کے رہن سہن پر روشنی ڈالی گئی ہے خوشحال بابا کا " باز نامہ " بھی شکاریات سے ہی متعلق ہے ۔ جبکہ ان کی کتاب " فضل نامہ " طب اور روحانی مسائل سے عبارت ہے ۔

کتابوں سے ہٹ کر بابا کی نجی زندگی ایک متحرک انقلاب انگیز اور تلاطم خیز زندگی سے عبارت ہے جس میں توپ و تفنگ ، عشق و محبت اور رزم و بزم کا عنصر نمایاں ہے ۔ وہ ایک زبردست قسم کے محب الوطن ہیں جو جمہوریت کے علم کو بلند کئے ظلم و ستم کے بتوں کو پاش پاش کرنا چاہتا ہے ۔ بابا کی ایک رباعی کا ترجمہ پیش خدمت ہے ۔ ع

میں وہ ایک پھول ہوں صحراؤں کا — باغباں کا جسے خدشہ ہے نہ صیاد کا

لہلہاتا ہے جو اک شان دلآویزی سے — لہلہاتا ہی رہے گا جو ابد تک یونہی

بابا کی زندگی اسلامی تعلیمات سے عبارت ہے ۔ وہ متحرک زندگی کے قائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے قدم ایک جگہ نہیں رکتے اگر وہ خود پشاور میں ہیں

توان کی نگاہیں وادی سوات پر مرکوز ہیں اگر وہ کابل کے پہاڑوں میں نظر آتے ہیں تو ان کے گھوڑوں کی گرد ملک کی سرحدات پر اڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ شکار میں مصروف ہیں لیکن اُن کے دل و دماغ پر پختون قوم کی اصلاح و آزادی کی فکر ہے اور وہ خود بڑے سے بڑے مصائب میں بھی کبھی گھبرائے ہوئے یا پریشان دکھائی نہیں دیتے ع

دریا کئی سینے کے سمندر میں بہم تھے　　آنکھوں سے مصائب میں بھی ایک بوند نہ ٹپکی

آج بھی بابا کا مرتبہ اور رتبہ اپنی قوم میں اسی طرح ہے جیسا :۔

ایران میں حافظ ، سعدی ۔ انوری اور ظہیر فارابی

عرب میں، امرالقیس ۔ لبید اور خنساء

جرمنی میں گوئٹے ۔ نطشے اور کارل مارکس

فرانس میں، والٹر۔ وکٹر ہیوگو۔ روسیو اور اناطول

اندلس میں، ابن رشد ۔ابن جلجل اور ابن خلدون

انگلستان میں، ملٹن ۔ بائرن ۔ ورڈز ورتھ اور شیلے

چین میں، لام زول ۔ نان شی چنگ۔ اور خان ای

برازیل میں، زولولی ۔ اور ولیم ہیکز

روس میں، ٹالسٹائے اور مائیکل شولوخوف

برصغیر میں، کالیداس ۔ غالب اور ٹیگور کا ہے ۔

ویسے تو بابا کو ہر دور میں اور ہر نسل نے خراج تحسین پیش کیا لیکن خوشحال شناسی میں جو عظیم اور تاریخ ساز کردار حضرت علامہ اقبالؒ نے ادا کیا وہ منفرد ہے حضرت علامہ اقبال نے یوں اُن کو خراج عقیدت پیش کیا ع

خوش سرود آں شاعر افغاں شناس　　ہر چہ بیند باز گوید بے ہراس

آں حکیم ملت افغانیاں　　آں طبیب علت افغانیاں

ایک دوسرے مقام پر یوں فرماتے ہیں ع

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم　　کہ ہو نام افغانیوں کا بلند

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے　　ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

حضرت علامہ اقبال نے خوشحال خان کو مردِ حری، مردِ آہن اور مردِ حریکار کہہ کر اُن کو نئی نسل سے متعارف کروایا لیکن افسوس کہ قوم آج بھی حقیقی معنوں میں بابا کی تعلیمات کو نہ سمجھ سکی، اس موقع پر بابا کی اس وصیت کا ذکر کرنے یقیناً نامناسب نہ ہوگا جس میں وہ فرماتے ہیں۔

"کہ میری قبر ایسے مقام پر بنائی جائے جہاں مغل تاجداروں کا سایہ بھی
مجھ تک نہ پہنچ سکے اور نہ ہی ان کے شہسواروں کے گھوڑوں کی
گرد میری مرقد کو چھو سکیں۔"

درحقیقت خوشحال بابا نے شہنشاہیت اور آمریت کے ایک ایسے دور میں تحریک آزادی کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ جس میں انسانی اقدار دم توڑ چکی تھیں۔ اور حاکمیت اور جبر کے بتوں نے انسانیت و شرافت کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا تھا ایسے حالات میں انقلابی و فکری شاعری کے ساتھ ساتھ عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کا ترجمان بن کر ابھرنا وہ تاریخ ساز کارنامہ تھا جسے آنے والی نسلیں فراموش نہیں کر سکتیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے تاریخ کے صفحات پر وہ آج بھی شہنشاہ جمہوریت اور بطلِ حریت کے ناموں سے پکارا جاتا ہے بابائے قوم کو طاقت کا بیل رواں بنا کر شہنشاہیت کے بتوں کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا تھا اور اس کا دبدبہ ایک طویل عرصے تک قائم رہا انہی کے اشعار کا ایک منظوم ترجمہ پیشِ خدمت ہے ع

میری تلوار کی جھنکار سنی ہے جسنے	اب بھی بستر سے لرزتا ہوا گر پڑتا ہے
میں ہی وہ سرکش و خوددار جواں ہمت ہوں	جس نے اورنگ کو معذور بنا رکھا ہے
ایک خیبر ہی پہ موقوف نہیں ہے اب تو	جس طرف دیکھئے مغلوں کیلئے خیبر ہے
انکی قسمت میں ہزیمت ہی ہر اک میداں میں	ہو کے مجبور پٹھانوں کو وہ دیتے ہیں خراج
دل میں کتنے ہی عزائم ہی لئے بیٹھا ہوں	لیکن افسوس کہ پٹھانوں میں حمیت ہی نہیں

خوشحال خان خٹک کی شاعری سے قطع نظر ان کی نثر میں وہ جاذبیت اور کشش ہے جو بڑے بڑے لکھنے والوں کو بھی ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ بابا نے پشتو شاعری اور نثر دونوں میں نئے تجربات کئے اور ادب عالیہ میں جدید راہیں متعین کیں مثلاً آپ کا یہ شعر ع

نظم ہو یا کہ نثر پشتو کی — اس پہ احساں ہے بے حساب مرا
اس میں املا تھی اور نہ کوئی کتاب — گنج تحریر اس کو میں نے دیا

اس حقیقت کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا کہ بابا کی شاعری پشتو کے ادب عالیہ کا ایک زبردست گنج ہائے گراں مایہ ہے جس کے ایک ایک شعر میں معنویت کے سمندر موجزن ہیں۔

خوشحال خان کی تمام زندگی اُن کی پیدائش، ان کے والد کا جنگ میں شہید ہونا جوانی میں قوم کی سرداری سلطنت مغلیہ سے وابستگی منصب داری کے عہدے پر متمکن رہنا۔ شاہجہان کی اسیری اورنگزیب کی تخت نشینی مغلوں کے متعلق حقیقت شناسی قلعہ رنتھنبور کی اسیری اور قید تنہائی۔ حاکم وقت کی قید سے رہائی اور اپنے ملک واپسی۔ یوسف زئی قبیلے کی پناہ اور پھر حکومت کی جانب سے اپنے دفاع کے لئے تعیر کئے جانے والے قلعہ کی سازش اور خان بابا کو خریدنے کی سعی۔ مغل حکمرانوں کی جانب سے پشتون برادری میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش اور خان بابا کی اولاد کی جانب سے حکومت کی طرفداری پھر اس سب سے قطع نظر بابا کی نظریاتی شاعری اور دل میں وطن کی آزادی کی جدوجہد کی تڑپ یہ سبھی ایک طویل داستان ہے بجائے تاریخ کے اس دقیق باب کو واہ کرنے کے میں خان بابا کی شاعری سے متعلق مختلف افکار کا اختصار کے ساتھ ترجمہ پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

جیل سے اپنے بیٹے کے نام ایک پیغام میں فرماتے ہیں۔

"جس شخص کو موت کی پرواہ نہ ہو اسے بھلا قید کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے میرا حوصلہ آج بھی بلند ہے اور میں کسی کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور ہمت ہارنے والا نہیں ہوں "

پھر کہتے ہیں۔

" میری گردن کٹ سکتی ہے مگر شہنشاہوں کے دربار میں یہ جھک نہیں سکتی"۔ ایک مقام پر مغل بادشاہوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

" میں نے مغلوں کے خلاف تلوار اٹھا کر افغان (پٹھان) کی شان کو بلند کیا اے کاش کہ ان میں اتفاق واتحاد برقرار رہتا اور میں مغلوں کے

گریبانوں کو تار تار کر دیتا "۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ آپ فرماتے ہیں۔

غیرتمند شخص کے لئے دنیا میں صرف دو راستے ہیں یا وہ تخت کو قبول کریگا یا تختہ۔ بے شک آزادی بادشاہی سے ہزار درجے بہتر ہے کیونکہ کسی کی تابعداری ہی اصل میں جیل خانہ ہے۔

جیسا میں عرض کر چکا ہوں بابا کی شاعری زندگی کے مختلف پہلوؤں کو محیط کئے ہوئے ہے اس کی تفصیل مشکل کام ہے۔ طوالت کے ڈر سے بچنے کے لیئے ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل نہایت مختصر اشعار کا ترجمہ پیش خدمت ہے تاکہ عام قاری استفادہ کر سکے۔ فرماتے ہیں۔

" میں نے ہر موضوع پر ——— قصیدے بھی لکھے اور حکمت و پند و نصائح سے بھرپور واقعات بھی قلم بند کئے۔ دلبروں کی شان میں غزلیں بھی لکھیں اور آنکھوں و ابروں کو زلفوں کا اسیر بھی کیا۔ رباعی۔ قطعہ۔ مثنوی میں ہیرے۔ لعل۔ موتی۔ جواہر بھی جڑے اگر فارسی میں کوئی شخص مجھ سے بہتر ہے تو پشتو ادب میں میں بے مثال ہوں "۔

بابا نے شاعری میں ایسے نکات بھی وضع کئے جس کا تعلق ہماری روزمرہ زندگی سے ہے مثلاً آپ فرماتے ہیں۔

" جو شخص ناپاک ہاتھوں سے کام کرے۔ گھر میں مکڑی کے جالے چھوڑے رات کو ننگا سوئے۔ چاقو چھری سے ناخن کاٹے۔ ہمیشہ تنہا ہو کر کھانا کھاتے۔ ماں باپ کا نام لیکر پکارے۔ استاد کا ادب نہ کرے۔ ٹوٹے برتنوں میں کھانا کھائے گھر کے انگن میں کوڑا کرکٹ جمع کرے۔ دانتوں سے ناخن کاٹے۔ ٹوٹی کنگھی سے داڑھی یا سر صاف کرے۔ کھڑے ہو کر کنگھی کرے۔ رات کو گھر میں جھاڑو دے لیٹے لیٹے یا کھڑے کھڑے یا جوتی پہن کر کھانا کھائے۔ یہ سبھی نحوست کی علامتیں ہیں۔ میری سب کو یہ نصیحت ہے کہ ان افعال سے پرہیز کرو۔

فرماتے ہیں۔

پھلدار درخت پر جتنے بھی پتھر برسائیں اس کے جواب میں میوہ ملتا ہے انسان کو غصے کی حالت میں موت کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ اور دل سے بغض۔ حسد۔

کینہ ختم کر دینا چاہیئے۔

پھر فرماتے ہیں۔

جو شخص خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔ دنیا اس کی لونڈی بن جاتی ہے۔ درویش اگر پہاڑوں کی طرف اشارہ کریں۔ تو وہ بھی سونے کے بن جاتے ہیں۔ یہ دنیا اولیاء کرام کے دم سے آباد ہے۔ جو شخص بھی تخت پر بیٹھے اسے مغرور نہیں ہونا چاہیئے۔

ایک شعر ہے۔

عقل مند شخص دنیا دار نہیں ہوتا۔ مال حاصل کر لیکن اس سے دل نہ لگا حضرت سلیمانؑ کی طرح بنو۔ قارون کی طرح مت بنو۔ چار یاروں کی طرح زندگی بسر کر۔ حضرت محمدؐ کے تمام صحابی غنی تھے۔ لیکن دنیا سے لگاؤ نہ تھا۔ مومنوں کو اصحاب کرام کی پیروی لازم ہے۔

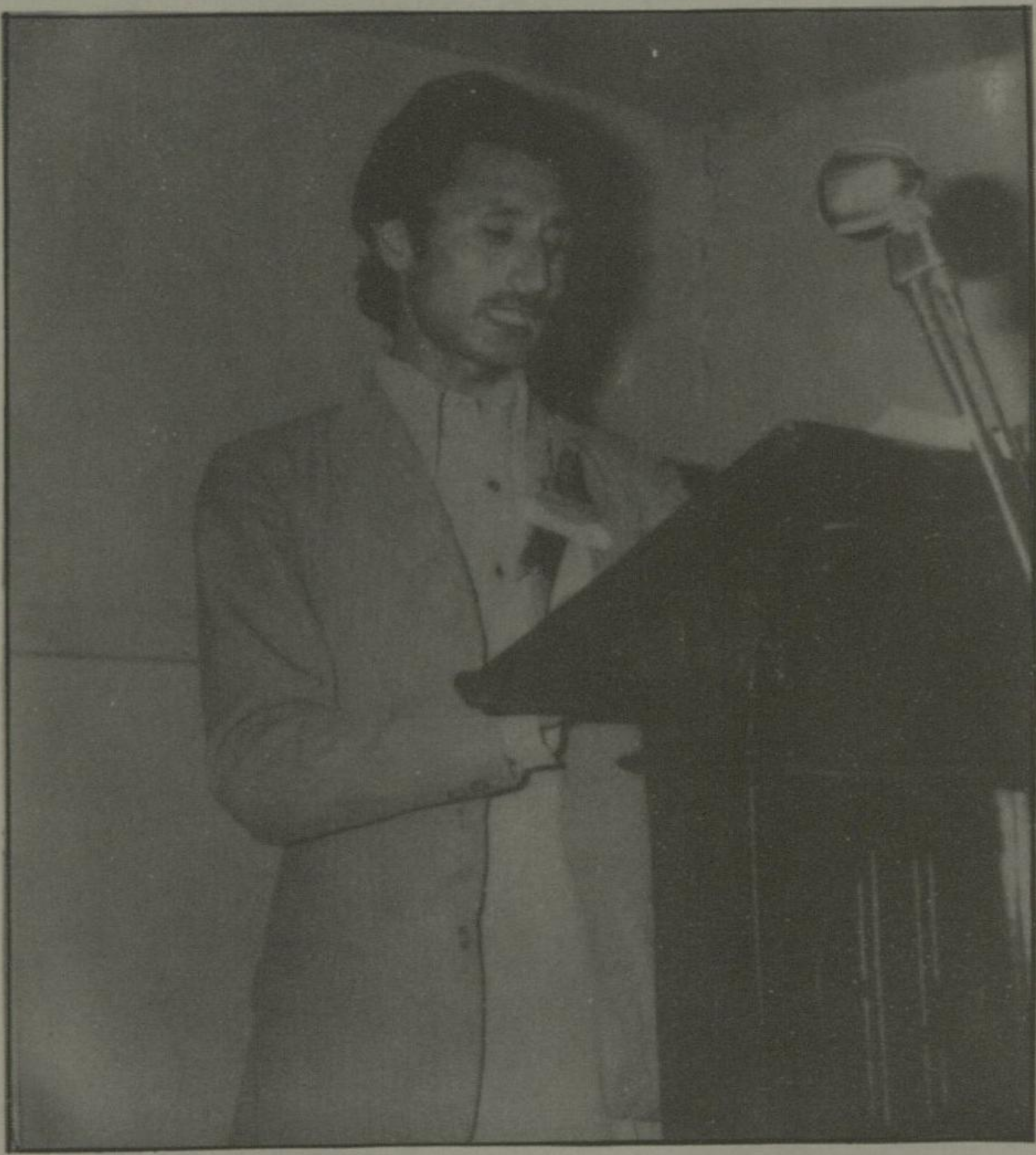
حاکم و سردار کے اوصاف کے بارے میں فرماتے ہیں۔

اچھے سردار کے لئے اس کے نام اور شہرت کا خزانہ کافی ہے۔ جسے سرداری سونپی جائے۔ اس کے لئے بخشش اور بہادری کا جذبہ لازم ہے۔ بھروسہ خدا کا چاہیئے یا تلوار کا۔ عوام میں نظم و ضبط پیدا کرنے کے لئے تلوار کا استعمال ناگزیر ہے۔ رعیت سے رعائیت اچھا اقدام ہے لیکن شریعت سے تجاوز ناقابل قبول ہے۔

میں حیران ہوں کہ بابا کے کون کون سے اشعار کا ترجمہ پیش کروں کیوں کہ حقیقتاً بابا کا ایک ایک شعر لعل و گوہر سے بھرا ہوا خزانہ ہے۔ اے کاش کہ ہم اس کو پڑھ سکیں اور پھر اس پر عمل کریں۔

آخر میں میری یہی عرض ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را



محمد نواز سرحدی (اسلام آباد)

محمد نواز سرحدی/ ترجمہ: محمد اسحاق

بابائے انسانیت

اس مختصر وقت میں میرے لئے یہ بات ناممکن ہے کہ خوشحال خان کی ہمہ گیر شخصیت کا احاطہ کرسکوں پھر بھی میری یہ کوشش ہوگی کہ علم و ادب کے اس روشن سورج کی چند شعاعیں آپ تک پہنچا سکوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خان علیین مکان نے زندگی کے ہر پہلو پر طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے مشکل سے مشکل مضمون کو ایسے آسان اور سادہ پیرائے میں بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔

دیگر موضوعات کے علاوہ انہوں نے انسان اور انسانیت کی تحقیق کچھ ایسی کی ہے کہ دیگر محققین کی تحقیقی کاوشیں مدھم پڑ جاتی ہیں۔ آپ انسان کو مجموعہ اضداد سمجھتے ہیں۔ اور انسانی فطرت کو خیر و شر، ملوکیت و حیوانیت، سختی اور نرمی، ظلم اور انصاف، تکبر اور انکسار جیسی متضاد چیزوں کا امتزاج سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں جب انسان کے یہ اندرونی تضادات آپس میں برسر پیکار ہو جاتے ہیں تو نتیجتاً انسان کو نہ صرف تباہی تک پہنچاتے ہیں بلکہ وہ اس جنگ کو زندگی کے لئے لازمی سمجھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کمزور انسان اپنی ناسمجھی کی وجہ سے اس مجادلے میں ناکام رہ جاتا ہے اور صاحب بصیرت اور ذی فہم کامرانی تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ پوری کائنات میں انسان کو باقی تمام جانداروں سے زیادہ صاحب بصیرت سمجھتا ہے اور اس کے مقابلے میں تمام مخلوق کو ادنیٰ سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر انسان اپنے اعلیٰ اوصاف کی بدولت انسانیت کی معراج کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ پاک کا نائب بن جاتا ہے اسی لئے تو فرماتے ہیں۔

ترجمہ:۔" اس کی ماہیت تک پہنچنا مشکل ہے، یہ انسان آخر ہے کیا چیز۔ ایک طرف نیکی اور بدی کا پتلا ہے تو دوسری طرف خیر و شر کا معجون۔ وہ فرشتہ صفت بھی ہے اور حیوان خو بھی، مؤمن بھی ہے اور کافر بھی، کبھی تو محض ہوا سے پھول جاتا ہے اور کبھی بغیر

کسی وجہ سے کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس دنیا میں اس جیسا دیدہ دلیر اور کوئی نہیں ہو گا۔ وہ درجے میں خدا کی برابری تو نہیں کر سکتا لیکن تھوڑا سا کمتر ہے۔

اسی طرح ان کے ذہن میں انسانیت کا درجہ اتنا اونچا ہے کہ آپ اس شخص کو بادشاہ تصور کرتے ہیں۔ جس کے دل میں دوسروں کی ہمدردی کا جذبہ ہو۔ اور ایسے شخص کو ان الفاظ میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ترجمہ: "جب تمہارے دل میں لوگوں کی نیک خواہی ہے تو مبارک ہو تمہارے دل میں بادشاہی موجود ہے۔"

وہ دوسروں کی مرضی کا بیحد خیال رکھتا ہے اور فرماتے ہیں کہ کسی کا جو بھی جی چاہے کرے لیکن ایک بات کا خیال رکھے کہ وہ کام ہرگز نہ کرے جس سے دوسرے کی دلآزاری ہو۔ ان کے نزدیک مخلوق خدا کی دلآزاری ایک بہت ہی مکروہ اور قابل نفرت فعل ہے ان کے نزدیک کسی کو دکھ پہنچانا اس کے حقوق کی پائمالی کے مترادف ہے۔ اور خان بابا ایسے کام کو نہایت بری نظر سے دیکھتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"تمہارے دل میں جو آئے اپنی خواہش کے مطابق وہ کام کرو لیکن ایسا کام ہرگز نہ کرنا جس سے کسی کی دلآزاری ہو۔"

یہ عظیم انسان اس شخص کا فدا نظر آتا ہے جو دوسروں کے غم میں شریک ہوتا ہے کسی کی خوشی میں شامل ہونا نہایت ہی آسان کام ہے۔ مگر کسی کے دکھوں کا بوجھ اٹھانا بلاشک وشبہ ایک مشکل کام ہے۔ اسی لئے خوشحال خان دنیا کے تمام لوگوں کو اس کام کی ترغیب دیتا ہے۔ اور جو اس کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے تو خان بابا اس پر فدا نظر آتا ہے ان کا یہ بے لوث جذبہ واقعی انسانیت کا عظیم احترام ہے۔

"میں اس شخص کا نہ صرف قدر دان ہوں بلکہ میری جان اس پر فدا ہو۔ جو مصیبتوں میں کسی بیچارے کا چارہ گر بن جاتا ہے۔"

خان موصوف حسن سلوک کا بھی ازحد قدر دان ہے۔ وہ ہر حال میں انسان کو حسن سلوک کی تلقین کرتا ہے اس ضمن میں یہاں تک آگے جاتا ہے، کہ دوست اور دشمن کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ وہ ایسی زندگی کو اچھا سمجھتا ہے جو انہی اوصاف سے متصف ہو۔ وہ ہر کسی سے یہ توقع رکھتا ہے، کہ اس کیمیا کی حکمت

کو جان جائے۔

"جو شخص دوست اور دشمن دونوں سے اچھا سلوک کرے۔ان لوگوں کی کیا اچھی زندگی ہے۔"

دکھ اور یاس انسانی زندگی کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ہر کوئی اس سے امان چاہتا ہے۔اور مقابلے سے لرزاں نظر آتا ہے لیکن خوشحال اس بلا کو بھی خالی از حکمت نہیں سمجھتے۔بلکہ اسے مرد اور نامرد کے درمیان ایک امتحان یا آزمائش گردانتے ہیں۔بقول ان کے جو شخص کسی مصیبت کو خوش آمدید کہتا ہے وہ مرد ہے اور جو اس بلا سے گریزاں ہو وہ نامرد ہے۔ان کے ہاں سختیوں اور مصیبتوں سے ٹکرانا زندگی کا دوسرا نام ہے۔اور اس ٹکر کے لئے مضبوط ارادے کی تلقین کرتے ہیں اور اس حکمت کے راز کو جاننے کا دوسرا نام دانائی سمجھتے ہیں۔فرماتے ہیں۔

"اللہ پاک نے غم کو بغیر کسی حکمت کے پیدا نہیں کیا ہے۔مرد اور نامرد کی پہچان ہی اس سے ہوتی ہے۔"

وہ کامیاب زندگی کے لئے جوہر خود اعتمادی کو لازمی سمجھتے ہیں اور اچھی زندگی اسے کہتے ہیں جو خود اعتمادی کے جذبے کے تحت گذرتی ہو۔اگر کوئی مصیبتوں اور آلائشوں میں دوسرے لوگوں سے آس رکھتے ہوں۔تو اسے وہ خام خیالی گردانتے ہیں اسی لئے تو یوں فرماتے ہیں۔

"شیروں کی بہادری لشکر پر منحصر نہیں۔وہ اکیلے ہی اپنی بہادری کا اظہار کرتے ہیں۔"

مضبوط اور آہنی ارادہ خان بابا کے ہاں ایک بڑی صفت ہے اور اس ضمن میں ان کے تاثرات بڑے انفرادی اور گہرائی اور گیرائی کے حامل ہیں۔بقول ان کے اگر کوئی اپنی منزل کو پانا چاہتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ راستے کی سنگلاخی اور رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لائے بلکہ سختیوں اور مصیبتوں کو خوش آمدید کہے۔ راستہ شروع سے آخر تک خاردار کیوں نہ ہو مگر وہ آگے بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن ایسا کرنے کے لئے عزم صمیم کی ضرورت ہوتی ہے۔وہ فرماتے ہیں۔

"مطلوبہ مقام تک پہنچنا شرط ہے خواہ اس سفر میں تمام راستہ خون آلود ہی کیوں

نہ ہو جائے۔"

خان محترم ہمت کے بہت زیادہ قائل ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک انسان کے دم میں دم ہے اس وقت تک ہمت سے کام لینا چاہیئے۔ وہ ہر مصیبت کی گھڑی میں ہمت کی تلقین کرتے ہیں اور پست ہمتی اور حوصلہ ہارنے کو انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، فرماتے ہیں۔

"اگر آسمان تمہیں شیر کے منہ میں دیدے تو بھی ہمت مت ہارو!"

خان کے جو افکار بیان کئے گئے ان کے علاوہ میں ایک ایسے مضمون کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کے اظہار کا شرف صرف خان علیین مکان کو حاصل ہے بات یہ ہے کہ عموماً شعراء اور ادیب سائنس کے خشک کلیوں کو اپنے کلام میں جگہ نہیں دیتے بلکہ ان کے ہاں ایسا کرنا رنگ میں بھنگ ڈالنے کے مترادف ہے۔ خصوصاً شاعری کے نازک تخیل میں سائنس کے خشک کلیئے سمونا گویا کرنے کی بات ہی نہیں ہے۔ لیکن خوشحال خان کے تخیلات کے گلستان کا دروازہ ہر ایک خیال کے لئے ہر دم وا نظر آتا ہے ان کا گلستان تخیل اگر ایک طرف ملی، روحانی اور اخلاقی پھولوں سے مزیّن ہے۔ تو دوسری طرف سائنس کے پھولوں کے کلیاں بھی چٹکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ آپ سائنسی اور تخلیقی قوت کا اظہار اس خوبی سے کرتے ہیں،

"محبوب کے چہرے کے بغیر میں کسی چیز کو اپنی پتلی سے نہیں دیکھتا آنکھ کی دونوں پتلیاں سورج کی روشنی سے ملک کا نظارہ کرتی ہیں۔"

تین سو سال پہلے ایسے باریک سائنسی نقطے سے آگاہی خان بابا کے فہم و ادراک پر دلالت کرتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک نابغہ انسان تھا۔ اگر کوئی اسی شعر کو باریکی سے دیکھے تو پتہ چلے گا کہ انہوں نے کس خوبصورتی کے ساتھ دو متضاد خیالات یعنی رومان اور سائنس کو ایسے یکجا کیا ہے کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے آپ محبوب کے چہرے کو سورج سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ یہ تو ظاہر بات ہے کہ دیکھنے کی طاقت سورج کی روشنی کی محتاج ہے اگر سورج نہ ہو تو دید کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے اسی طرح جب وہ اپنے محبوب کو نہیں دیکھ پاتا تو اس کی نظر ہی نہیں لگتی۔ یعنی اگر اُسے کچھ دکھائی دیتا ہے تو وہ چہرۂ یار ہے۔ یہی خیال اگر ایک طرف عظیم رومانی کیفیت رکھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی سائنسی نظریئے کا

ایک تصور بھی سامنے آجاتا ہے اور وہ یوں کہ بقول اُن کے یہ آنکھ کی پتلی کا کمال ہے کہ پہلے سورج کی شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے اور پھر واپس منعکس کر لیتی ہے۔ یہ روشنی جس چیز پر پڑے وہ نظر آجائے۔ موجودہ طبعی سائنس کا نظریۂ انعکاس نور ہو بہو خوشحال بابا کے اوپر بیان شدہ شعر کی ترجمانی کرتی ہے۔

آخر میں میں یہ کہوں گا۔

"مائیں بہت ساری اولاد اور بیٹے جن لیتی ہیں جن میں ایک یا دو افلاطون اور سکندر بن جاتے ہیں۔ تناسل کے اس کارخانے میں کبھی کبھی اس روئے زمین پر خوشحال جیسا انسان بھی پیدا ہو جاتا ہے۔"



خاطر غزنوی

خاطر غزنوی

جدید پشتو نثر کا بانی

خوشحال خان خٹک اپنے عصر ہی کا نہیں ہر زمانے کا ایک عظیم صاحب قلم اور بے بدل دانشور تھا۔ اپنے سپاہیانہ کارناموں کی وجہ سے زیادہ اور خلاقانہ صلاحیتوں کی وجہ سے کم تر پہچانا جاتا تھا۔ سب سے پہلے مغربی مستشرقین کے تراجم کی وجہ سے وہ بحیثیت ایک شاعر متعارف ہوا۔ پھر ان کی صلاحیتوں اور نظریات سے علامہ اقبال واقف ہوئے تو انھوں نے خوشحال خان پر ایک مضمون بھی لکھا۔ لیکن دراصل علامہ کی مشہور نظم "خوشحال خان کی وصیت" نے اردو دان طبقے سے خوشحال خان کو متعارف کرایا۔ قیام پاکستان کے بعد خوشحال خان خٹک کی سائنٹفک طریقے پر دریافت ہوئی اس سلسلے میں دوست محمد خان کامل پہلے دانشور ہیں جنہوں نے خوشحال خان خٹک کی شخصیت کے صحیح خدوخال واضح کیے اور ان کے قلمی کارناموں کا گہرا جائزہ پیش کیا۔ عبدالخالق خلیق خوشحال بابا کا مزار دریافت کرنے والوں میں سے تھے انہوں نے "د توری او قلم خاوند" کے نام سے صاحب سیف و قلم نے خوشحال خان خٹک کو مختلف لکھنے والوں کا نثری اور منظوم نذرانہ پیش کیا۔

پشتو کے دانشوروں کے سامنے جب جناب دوست محمد خان کامل کی خوشحال بابا کے کارناموں کے بارے میں تحقیق اور اس کی شاعری اور زندگی کے گہرے رشتے کی تفصیل آئی تو انہوں نے پوری توجہ سے اس عظیم شخصیت پر کام شروع کیا۔ خوشحال بابا کا دیوان بعض تاجروں کی نجی کوششوں سے چھپ چکا تھا۔ لیکن باقی کتب مسودوں کی صورت میں بکھری پڑی تھیں چنانچہ سب سے پہلے ایم اے شکور سابق ناظم عجائب گھر پشاور نے بابا کی ایک عظیم نثری کتاب دستار نامہ شائع کر دی۔ بعد میں کلیات، دیوان منتخب دیوان کا نثری اردو ترجمہ بھی سامنے آیا۔ میر عبدالصمد خان نے اقبال کی خوشحال بابا سے عقیدت کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ شاعر مشرق خوشحال بابا سے بہت متاثر بھی تھے

اور انہوں نے ان کے بہت سے نظریات کو سنجیدگی سے اپنایا بھی تھا ان کی کتاب خوشحال اور اقبال خوشحالیات کے حوالے سے ایک بڑی وقیع کوشش ہے۔

جوں جوں زمانہ گذرتا جا رہا ہے خوشحال خان خٹک کی ذہنی عظمت اور فکری وسعت اور اس کے کارناموں کی اہمیت واضح سے واضح تر ہوتی جا رہی ہے۔ خوشحال بابا کے بارے میں ایک طبقے نے جو غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں ان کی دھند بھی چھٹتی جا رہی ہے خوشحال خان خٹک کے تین سو سالہ جشن میں جو منذاکرے منعقد کئے گئے اور جس طرح خوشحال بابا کو خلوص دل سے اپنانے کی کوشش شروع ہوئیں تو اہل علم کے ساتھ ساتھ عوام نے بھی اپنی بے لوث توجہ اس عظیم ہستی کی طرف منعطف کی اور یوں خوشحال بابا کے بارے میں نہ صرف یہ بات تسلیم کی گئی کہ وہ خاندان مغلیہ کا دشمن نہ تھا اپنے جرم بے گناہی کے زنگ کو اتارنے کے لئے اس نے تلوار اٹھائی لیکن محض شمشیر زنی خیالات کی زبان نہیں بنتی۔ خوشحال بابا نے ایک ہاتھ میں قلم بھی لیا اور اس کے قلم نے وہ سب کچھ تحریر کر دیا جو دنیا میں کمتر شعرا اور اہل علم نے کیا، اس کے قلم نے شعر کی زبان میں حقائق کو قرطاس پر مرتسم کیا۔ جنگ آزمائی کا اصل سبب بیان کیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے آباؤ اجداد کی تعریف کی۔ کابل سے پنجاب تک سارے علاقوں کو سراہا۔ پنجاب اور لاہور سے محبت کے ترانے گا کر ثابت کیا کہ وہ علیحدگی پسند نہیں بلکہ اچھے لوگوں کو اچھا کہنے میں بخل سے کام نہیں لیتا البتہ وہ صرف غنیم کا ذکر اس کے عمل کی روشنی میں حقارت سے کرتا ہے۔ خوشحال خان خٹک نے شاعری میں اپنا لوہا منوایا فکر اور صنعت دونوں میں اعلیٰ ترین معیار پیش کیا تمام اصناف سخن کا احاطہ کیا اور شاعری کو حقیقت پسندی اور اپنے دور کی سچی عکاسی کا ذریعہ بنایا اپنے کارناموں کے سبب سب نے متفقہ طور پر اسے بابائے پشتو کہا۔

"بابائے پشتو" کا اعزاز معمولی بات نہیں۔ خوشحال اس کا اہل ہے۔

خوشحال خان خٹک کے دور تک پشتو ادب میں نثر کا فقدان نظر آتا ہے، پشتو کے ایک محقق عبدالحئی حبیبی کا خیال ہے کہ "پشتو نثر کا ایک اہم نمونہ جو اب تک ہمارے سامنے آیا ہے وہ قندھار کے سلیمان ماکو کی کتاب تذکرۃ الاولیاء کے صرف چند صفحات تک محدود ہے اس کا سال تالیف ۶۱۲ ہجری ہے سلیمان ماکو نے ایسی رواں اور روشن اور بے تکلف

پشتو لکھی ہے کہ اس میں عربی یا دری زبان کی فنی اور مسجع نثر کی جھلک کمتر نظر آتی ہے اور اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ پشتو نثر مغلوں کے دور تک فارسی زبان کی بلعمی، بیہقی اور منہاج سراج جوزجانی اور گردیزی کی نثر کی طرح سادہ اور رواں دواں ہے اور بے محل تکلف اور تصنع اس میں نظر نہیں آتا ہے[1]

پشتو کا اولین نثر نگار ابو محمد ہاشم (۲۲۳ھ تا ۲۹۷ھ) کو قرار دیا جاتا ہے جس نے "د سالو وږمے" (نسیم صحرا) کے نام سے ایک نثری کتاب لکھی جس میں عربی اشعار اور فصاحت و بلاغت پر اظہار خیال کیا گیا لیکن یہ کتاب نایاب ہے[2]

صدیق اللہ رشتین کہتے ہیں[3] سلمان ماکو ایک پشتون عالم اور ادیب ۶۱۲ ہجری کے لگ بھگ زندہ تھا اس کے والد کا نام بارک خان تھا وہ قوم کا سابزی تھا اور قندھار میں ارغسان کے مقام پر رہتا تھا شعر کا علم نہ جانتا تھا لیکن نثر میں ایک بہت قیمتی کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام تذکرۃ الاولیاء ہے جو ۶۱۲ھ میں لکھی گئی۔ یہ پشتو کے اولیا اور شعرا کی تاریخ ہے۔ بدقسمتی سے یہ مکمل کتاب دستیاب نہیں۔۔۔ فعلاً یہ کتاب پشتو زبان کی پہلی نثری کتاب ہے۔ رشتین نے محمد بن علی بستی۔ احمد بن سعید لودی، شیخ کٹہ یوسف زئی کا ذکر بھی پشتو نثر نگاروں میں کیا ہے لیکن ان کی تصنیفات کے صرف حوالے موجود ہیں اصل مسودے دستیاب نہیں۔ شیخ ملی یوسف زئیوں کے ایک سردار ملک احمد دور کی مشہور و معروف شخصیت ہے جس نے زمین کے بندوبست کا نظام رائج کیا جو آج تک رائج ہے مشہور مستشرق میجر راورٹی کہتا ہے کہ "دفتر شیخ ملی" ۸۲۰ھ / ۱۴۱۷ء میں لکھی گئی یہ کتاب میں نے ڈھونڈ نکالی ہے[4]

راورٹی نے بجو خان رانی زئی[5] کے ذکر میں بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کی تصنیف کردہ تاریخ اسے دستیاب ہوئی ہے۔ شیخ ملی کے بعد بجو خان رانی زئی سوات کا ایک اہم ادیب اور مؤرخ ہے۔ اس نے بھی پشتونوں کے حالات کا احاطہ اس کتاب میں کیا جو ۹۰۰ ہجری / ۱۴۹۴ء

۱۔ خوشحال خان خٹک دجہانداری نظریہ عبدالحئی حبیبی، ننگیالی پشتون پشتو ٹولنہ ۱۳۴۵ ص ۲۰

۲۔ پٹہ خزانہ

۳۔ د پشتو ادب تاریخ صدیق اللہ رشتین پشتو ٹولنہ کابل ۱۳۲۵ ش

۴۔ New Indian Antiquery Nov: 1939.

۵۔ بجو خان کا اصل نام خان احمد خان تھا د پشتو نثر کی تاریخ حصہ اول۔ افضل رضا (پشتو) ۱۱۸

میں لکھی گئی شاید یہ کتاب لندن میوزیم میں محفوظ ہو۔

بحو خان کے بعد ہمیں ایک ہی دور میں دو نثری کتابیں ملتی ہیں اور یہی دو کتابیں پشتو نثر کے معیار کا دستیاب اور ٹھوس ثبوت ہیں یہ کتابیں بایزید انصاری کی خیر البیان اور اخون درویزہ کی مخزن ہیں۔ بایزید انصاری ۹۳۱ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۹۹۳ میں وفات پائی بایزید انصاری کی کتاب خیر البیان کا سن تصنیف ۹۸۰ھ اور سن تحریر ۱۰۶۱ ہجری ہے[۱]۔ اور مولانا عبدالقدوس قاسمی اسی کتاب کے دیباچے میں ان الفاظ میں اس کتاب کو اولیت کا درجہ دیتے ہیں۔

"راورٹی لکھتے ہیں کہ میرے پاس پشتو کی پرانی کتب موجود ہیں جو شہنشاہ اکبر سے پیشتر یا اس کے دور حکومت میں لکھی گئیں۔ لیکن راورٹی نے نہ تو ان کتب کے نام لکھے ہیں اور نہ ہی اپنے انتخاب میں ان میں سے کسی کا اقتباس دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راورٹی نے بھی خیر البیان نہیں دیکھی تھی اور اس لحاظ سے خیر البیان سب سے پہلی پشتو کتاب ہے جو علمی دنیا کے سامنے آئی[۲]۔"

خیر البیان موضوع کے لحاظ سے مذہبی کتاب ہے بایزید انصاری کے عقائد سے ایک اور مشہور عالم اخون درویزہ اختلاف رکھتے تھے اور ان ہی اختلافات کے سبب بایزید انصاری کی تحریک کو جسے روشنیہ کہا ہے گیا۔ انہوں نے تاریکی کہا اور بایزید انصاری یا پیر روشان اور اس کے عقائد کی مخالفت میں ایک کتاب "مخزن اسلام" لکھی۔ حضرت اخون درویزہ ۹۴۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء ان کی تاریخ وفات بتائی گئی ہے گویا انہوں نے ۱۰۸ سال عمر پائی۔ مخزن کا سال تصنیف ۱۰۱۵/۱۰۱۷ ہجری کے لگ بھگ ہے۔

خیر البیان اور مخزن دونوں کتابوں کی نثر مسجع اور مقفیٰ ہے۔ مذہبی مباحث کے ساتھ ہی زبان اور پشتو رسم الخط کے بارے میں دونوں کتابوں میں اپنے عقائد کے مطابق باتیں ہیں اخون درویزہ نے مخزن میں چار کتابوں کو یکجا کر دیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ پشتون اسلامی علوم اور قدیم علماء سے آشنا ہو سکیں۔ مذہبی باتوں سے قطع نظر اخون درویزہ کی کتاب میں رسالہ قرأت بھی شامل ہے جو انہوں نے خود ہی مرتب کیا تھا اس میں پشتو حروف کے مخارج بیان کئے ہیں اور ادائیگی کا طریقہ بتایا ہے ان کی یہ کوشش ادبی لحاظ سے قابل قدر اور پشتو کے ابتدائی دور میں اہمیت کی حامل ہے

۱۔ دیباچہ خیر البیان مولانا عبدالقدوس قاسمی ص ۵۷۔ مطبوعہ پشتو اکیڈیمی۔

۲۔ ایضاً

یہی بات بایزید انصاری کے بارے میں کہی جاتی ہے اور یہ بھی کہ بایزید انصاری نے پشتو کا مخصوص رسم الخط ایجاد کیا۔ یہ دعویٰ بایزید کے بارے میں اس کے مریدوں نے کیا۔ چنانچہ دولت (بایزید کا بیٹا) کہتا ہے۔

افغانی لفظ مشکل وو لوست ئے نہ شو   ورتہ وشو اکنند ۱۳ دیارلس حرفونہ

(پشتو لفظ میں اشکال تھا، پڑھے نہ جا سکتے تھے۔ اس میں تیرہ حروف کا اضافہ کیا گیا)

یہی دعویٰ خوشحال خان خٹک نے بھی کیا تھا۔

خیر البیان اور مخزن کے بعد جو نثری کتاب ہمارے سامنے آتی ہے وہ خوشحال خان خٹک کی "دستار نامہ" ہے خیر البیان اور مخزن کی نثر خوشحال بابا کی دستار نامہ سے یقیناً مختلف ہے کہ خوشحال بابا نے شاعر ہونے کے باوجود اپنی نثر کو مسجع اور مقفیٰ بنانے سے گریز کیا اور حقیقی معنوں میں اپنی اس نثری کتاب کو سادہ نثر کی صورت دی۔

یوں اس کتاب کو پشتو نثر کے نئے دور کا حرف آغاز کہا جا سکتا ہے۔

دستار نامہ کا موضوع خوشحال بابا ہی کے ایک شعر کا احاطہ کرتا ہے۔

چہ دستار تړی هزار دی   د دستار سړی پہ شمار دی

دستار ہزاروں لوگ باندھتے ہیں لیکن حقیقت میں صاحب دستار انگلیوں پہ گنے جا سکتے ہیں۔

دستار یا پگڑی فضیلت کی علامت ہے۔ ہمارے ہاں "پگڑی اچھالنا" جیسے محاورے اس حقیقت کی تصویر پیش کرتے ہیں کہ پگڑی عزت ہے اور پگڑی اچھالنا بے عزتی کرنے اور اعلیٰ مقام سے گرانے کی کوشش ہے۔

دستار بندی کی رسم سے ہمارا معاشرہ قدیم دور سے آشنا ہے، دستار بندی، سرداری حاصل کرنے کی سند کی رسم ہے۔ اسی مفہوم میں دستار نامہ سرداروں اور بادشاہوں کے لئے بعض اہم ہنروں کی تحصیل اور بعض خصائل کی پابندی کا ہدایت نامہ ہے۔ خوشحال بابا اس کتاب کا آغاز ان الفاظ کرتے ہیں

"معلوم ہونا چاہیئے کہ سر پہ دستار باندھنے کا مطلب نمود و نمائش نہیں، دستار آدمی کی حیا اور عزت کا نشان ہے، مرد کی حیا تمامتر دستار میں ہے۔"

آگے چل کر دستار کی اہلیت کی تفصیل ان الفاظ میں پیش کی گئی ہے۔

دستار کی اہلیت ان خصائل اور فنون پر موقوف ہے جن کے عدم حصول

کی صورت میں سراسر نقصان ہے۔ ہنر، پیشے فنون صنعت و حرفت عادات و خصائل بے حد و بے شمار ہیں۔ ان کا احاطہ کرنے کے لئے عمر نوح درکار ہے ان کا حصول تصور سے بعید لیکن پھر بھی جس قدر ان کی تحصیل سے انسان اہل کہلا سکے ان کا حصول لازمی ہے اگر اتنا بھی نہ ہو سکے تو ایسے شخص کو نااہل قرار دیا جائے گا وہ لائق دستار نہیں گردانا جائے گا۔ خوشحال بابا نے اس نقطہ پر پوری توجہ دی ہے اور دو ابواب میں سرداری کی صفات کی نشاندہی کی ہے"

پہلے باب میں ان بیس ہنروں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور ان کو سردار یا بادشاہ کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔

خود شناسی، علم، خطاطی، شاعری، تیر اندازی، پیراکی، گھڑ سواری، شکار، شجاعت، سخاوت معاشرت، تربیت اولاد و ملازموں کی تنظیم و تادیب، اسباب معیشت زراعت، تجارت، تحقیق نسب علم موسیقی، نرد اور شطرنج، نقاشی و مصوری دوسرے باب میں ان بیس خصائل پر بحث کی گئی ہے۔

شورہ، عزم، خاموشی، سچائی، شرم و حیا، خوش خلقی، مروت، عفو و کرم، تمیز و شعور عدل و انصاف، توکل، تربیت اور اپنی نوازش کی وقعت، بیم و رجا، انتظام مملکت، ہمت، حلم، غیرت حزم واحتیاط، ورع و طاعت و عبادت، استغفار۔

خوشحال بابا نے حکومت اور اقتدار کی شرائط پیش نہیں کیں، بلکہ بزرگی کی صفات پیش کی ہیں یہ ضروری نہیں کہ وہ بزرگ بہر صورت صاحب اقتدار اور حکومت کا سربراہ ہو۔ پشتونوں میں آج بھی بہت سے بزرگ اور سفید ریش موجود ہیں جنہیں قوم اور قبیلے بزرگ سمجھتے ہیں اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن وہ حکومت اور اقتدار کے مالک نہیں۔ خود خوشحال خان خٹک بھی ایک ایسا ہی سردار اور بزرگ تھا۔[۱]

یوں تو دنیا کی مختلف زبانوں میں ایسی کئی کتابیں ملتی ہیں جن میں اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے یہ اخلاقی تعلیم عام لوگوں کے لئے بھی ہے اور بعض اعلیٰ طبقوں کے آزاد یا بادشاہوں اور شہزادوں کے لئے بھی مثال کے طور پر افلاطون کی جمہوریہ، میکاولی کی "شہزادہ" اور امیر کیکاؤس بن سکندر بن قابوس کی قابوس نامہ قابل ذکر ہیں۔

۱۔ ننگیالی پښتون، پشتو ٹولنہ کابل ۱۳۴۵ صدیق اللہ رشتین ص ۲۷۱

افلاطون کی جمہوریہ ایک ایسی تصوراتی اور فلسفیانہ تحریر ہے جو اپنے دور کے مسائل کی پیداوار ہے۔ اس زمانے میں جمہوریت کا دور دورہ تھا! شراف امراء محض بے بس تھے یہ نوجوان دیکھتا تھا کہ جماعتی زندگی کا یہ سب سے دشوار اور سب سے اہم کام حکومت کرنے کے لئے ہر کس و ناکس، ہر چھوٹا بڑا۔ ہر اچھا برا۔ آمادہ بلکہ کوشاں ہے یہ سمجھتا تھا کہ یہ جمہوری ریاست ایک بے ملاح کی ناؤ ہے۔ کہاں دیکھئے ٹھہرے۔ پھر صرف جمہوریت کا یہ سیاسی طوفان بے تمیزی ہی اس شریف زادہ کے لئے سوہان روح نہ تھا بلکہ یہ نیک دل، منصف مزاج نوجوان جمہوریت کی مادی ترقیوں سے بھی اثر لے رہا تھا۔ یہ دیکھتا تھا کہ عام زندگی میں سکون اور سادگی کی جگہ مسابقت اور تعیش نے لے لی ہے۔[۱]

افلاطون عملی سیاست میں حصہ لے کر ناکام ہو چکا تھا اس لئے اس نے تجربے اور مشاہدے کے بعد ریاست اور فرد کا ایک تصور ڈھالا۔ اس کتاب میں اس حوالے سے انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے البتہ زیادہ توجہ انسانی زندگی کے عملی پہلو پر ہے اس لئے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پُر معلوم ہوتا ہے لیکن یہ نہیں کہ فکر و خیال کی دنیا کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ فلسفہ کی بلندیاں بھی اس میں موجود ہیں۔ اخلاقیات کا درس بھی ہے روح انسانی کے محاسن کی گہری اور لطیف تحقیق بھی موجود ہے۔ تعلیم کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کا مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ "آدمی اچھا آدمی کیسے بنے؟" اس سوال کا جواب دینے کے لئے اجتماعیات کے اس مرکزی مسئلہ کا حل ضروری ہے کہ فرد اور جماعت میں تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ افلاطون کے نزدیک انسان محض انفرادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اپنی تمام صلاحیتوں کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لئے کسی جماعت، کسی ریاست کی رکنیت کا محتاج ہوتا ہے اچھا آدمی اچھی ریاست ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اپنے اصل سوال کے جواب کی خاطر افلاطون کو اچھی ریاست کا خاکہ بنانا پڑا اور فلسفہ اخلاق کا مسئلہ سیاست کا مسئلہ بن گیا[۲] اس کتاب کے اہم مباحث یہ ہیں (۱) ماہیت عدل۔ (۲) نظام تعلیم (۳) نظام معیشت۔

خوشحال خان خٹک کی دستار نامہ اس لحاظ سے افلاطون کی جمہوریہ سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے کہ ریاست میں جو نظام تعلیم بہ تفصیل پیش کیا گیا ہے وہ جنگ آزماؤں اور حکمرانوں

۱۔ ریاست از افلاطون۔ ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۲ء ص ۳

۲۔ ایضاً ۱۱-۱۲

کے لئے ہے حکمرانوں کی تعلیم کا مقصد ان میں سے چند کو کامل محافظت یا حکمرانی کا اہل بنانا ہے جب کہ اس پہلے حصے کی تعلیم کا مقصد شہریوں کو ریاست کے تحفظ کے لئے بطور سپاہی کے تیار کرنا ہے۔ اس حصے میں جذبات کی تہذیب، سیرت کی تربیت پیش نظر ہے۔ دوسرے میں فلسفہ و حکمت کی معرفت، عقل و خرد کی تعلیم ہے، پہلے حصے میں تمامتر اجتماعی اغراض پیش نظر ہیں دوسرے میں بالکل نہ سہی پھر بھی بہت کچھ انفرادی تکمیل[۱]

افلاطون ایک فرد میں یہ خصوصیات ایک اچھی ریاست کے حوالے سے دیکھنا چاہتا تھا۔ جب کہ خوشحال ایک سردار میں یہ خوبیاں ایک اعلیٰ شخصیت کی تکمیل کے طور پر چاہتا ہے۔ گلستان سعدی میں بھی نوجوانوں کی شخصیت کی تعمیر سبق آموز حکایت کے ذریعے کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن دستار نامہ گلستان سے زیادہ قابوس نامہ سے قریب ہے۔ یہ کتاب شاہی خاندان کے ایک فرد امیر کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس وشمگیر نے ۴۷۵ ہجری میں تصنیف کی۔ یہ امیر آل زیاد کا چشم و چراغ تھا جس نے سو سال سے زیادہ ایران اور افغانستان کے بعض علاقوں پر حکومت کی یہ دور علم و ادب کی ترقی کے لئے شہرت رکھتا ہے کیکاؤس نے اپنی تصنیف کا نام اپنے داد کے نام پر رکھا اور اپنی تصنیف میں تحریر کیا کہ "کتاب لکھنے کا سبب اپنے بیٹے گیلان شاہ کو کامیاب عملی زندگی گذارنے کا طریقہ بتانا تھا" وہ پیش لفظ میں لکھتا ہے۔

"اس کتاب کا مصنف امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس بن وشمگیر بن زیاد، امیر المومنین کا غلام، اپنے فرزند گیلان شاہ سے یوں کہتا ہے۔ اے بیٹے جان لے کہ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں اور میرا بڑھاپا اور ضعیفی مجھ پر غالب آ گئے ہیں اور میں زندگی کے انحطاط کی واضح علامت اپنے چہرے کے سفید بالوں کی صورت میں دیکھ رہا ہوں، اس علامت اور نشانی کو میری کوئی تدبیر رفع نہیں کرسکتی، پس اے فرزند چونکہ میں اب اپنا نام جلد ہی چلے جانے والوں کی فہرست میں دیکھ رہا ہوں، قرین مصلحت یہ جانتا ہوں کہ قبل اس کے کہ مجھے اس جہان سے رخصت ہونے کا پروانہ پہنچے زمانے کے سرد و گرم اور کام کاج میں نیک نامی اور کامیابی کے حصول پر تذکرہ کروں۔۔۔۔ پس اے فرزند جان لے یہ نصیحت نامہ اور یہ مبارک تصنیف میں نے چوالیس الابواب پر مشتمل لکھی ہے امیدوار ہوں کہ یہ کتاب لکھنے والے، پڑھنے والے، نقل کرنے والے اور سننے والے ہر ایک کے لئے مبارک و مسعود ثابت ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ[۲]

۱۔ ریاست۔ افلاطون مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین ص ۱۹

۲۔ قابوس نامہ۔ ترجمہ میاں محمد افضل مکتبہ شاہکار لاہور ۱۹۷۶

قابوس نامہ میں جو چوالیس الواب ترتیب دیئے گئے ہیں ان کے عنوانات یہ ہیں ،
(۱) حق شناسی اور پرہیز گاری (۲) پیغمبروں کی پیدائش کی حکمت (۳) خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کرنے میں (۴) ذاتی استطاعت پر مبنی عبادات (۵) والدین کے حقوق کی شناخت (۶) انکساری اور ہنر مندی (۷) تحریر و تقریر میں نکتہ آفرینی اور صلاحیت (۸) نوشیروان عادل کے اقوال (۹) جوانی اور بڑھاپے کا عمل (۱۰) بہبودی ذات اور آداب دسترخوان (۱۱) شراب نوشی کے آداب اور تکلفات (۱۲) مہمانی اور میزبانی (۱۳) مزاح اور چوسر و شطرنج کھیلنے کے آداب (۱۴) عشق و عاشقی اور راہ و رسم الفت (۱۵) حدود و اختلاط و تمتع (۱۶) حمام اور غسل کرنے کے آداب (۱۷) سونے اور آداب استراحت کا بیان (۱۸) شکار اور رسوم شکار (۱۹) چوگان کھیلنے کے آداب (۲۰) جنگ و حرب کے آداب (۲۱) مال جمع کرنے کے بیان میں (۲۲) امانت داری (۲۳) غلام اور خریداری غلام (۲۴) گھر و جاگیر خریدنے کے بیان میں (۲۶) شادی بیاہ (۲۷) پرورش اولاد (۲۸) دوست اور دوستی کے آداب (۲۹) اندیشۂ دشمن کے بیان میں (۳۰) سزا دینے اور معاف کرنے کے بیان میں (۳۱) طالب علمی، فقیہی و مدرسی (۳۲) تجارت (۳۳) علم طب (۳۴) علم نجوم و علم ہندسہ (۳۵) شاعری اور اس کے آداب و اسلوب (۳۶) نغمہ و نغمہ گوئی (۳۷) بادشاہوں کی خدمت کے آداب (۳۸) آداب ندیمی (۳۹) کاتب اور کتابت (۴۰) وزارت کے آداب و شرائط (۴۱) سپہ سالاری کا طریقہ (۴۲) بادشاہی و جہاں بانی کا آئین (۴۳) پیشہ زراعت اور دیگر عام پیشوں کے آداب (۴۴) آئین جواں مرداں ۔

ان عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دستار نامہ اور قابوس نامہ میں بعض مشترک الواب ہیں مثال کے طور پر چوسر و شطرنج (نرد و شطرنج خوشحال) حدود و اختلاط و تمتع (معاشرت) شکار اور رسوم شکار (شکار) چوگان و گھوڑا خریدنے کا بیان (گھڑ سواری) جنگ و حرب، آئین جواں مرداں و اندیشۂ دشمن کا بیان (تیر اندازی اور شجاعت) شادی بیاہ و پرورش اولاد (معاشرت و تربیت اولاد) طالب علمی، فقیہی و مدرسی (علم)، تجارت (تجارت) علم نجوم (شجاعت کے باب میں علم نجوم پر بھی بحث کی گئی ہے) مہمانی اور میزبانی و آداب دسترخوان (سخاوت کے باب میں اس موضوع پر بھی بحث ہے۔ غلام اور خریداری غلام (ملازموں کی تنظیم و تادیب میں غلاموں پر بھی بحث کی گئی ہے) شاعری (شاعری) گھر و جاگیر خریدنے کا بیان، بہبودی ذات اور آداب دسترخوان (اسباب معیشت کے باب میں یہ تینوں موضوعات موجود ہیں)، پیشہ زراعت (زراعت)

نغمہ و نغمہ گوئی (علم موسیقی) کاتب و کتابت (خطاطی) نوشیروان عادل کے اقوال (عدل و انصاف) بادشاہی و جہاں بانی کا آئین (انتظام مملکت) خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کرنے میں (ورع طاعت اور عبادت)

بیشتر عنوانات و موضوعات میں یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے لیکن متن کے لحاظ سے دونوں کا اپنا اپنا الگ اور منفرد انداز ہے۔ قابوس نامہ میں زیادہ تر حکایات کا سہارا لیا گیا ہے جب کہ دستار نامہ سنجیدگی کا حامل ہے۔ قابوس نامہ میں بعض حکایات موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کرتیں مثلاً گھوڑا خریدنے کے بیان کی حکایت وغیرہ۔ یہ کتاب صرف ایک شخص یعنی گیلان شاہ کے لئے لکھی گئی ہے اور اس نصیحت نامے میں بوڑھے کیکاؤس کا یہ خوف بھی نمایاں تر نظر آرہا ہے کہ اس کا بیٹا مرور زمانہ کا شکار ہو سکتا ہے اور امارت کی ریشمی بلندیوں سے گر کر غربت کے خاردار راستوں کا مسافر بن سکتا ہے اس لئے اسے وقت مبادا کے لئے طالب علمی، تجارت، علم نجوم و ہندسہ، شاعری یا نغمہ گری کتابت و ندیمی یا زراعت کا پیشہ اپنانے میں عار نہ ہو اور اسے اگر بادشاہوں کی ملازمت اختیار کرنی پڑے تو آداب سے واقف ہو مثال کے طور پر طالب علمی، فقیہی اور مدرسی کے باب میں صاحب قابوس نامہ کے یہ الفاظ اس دعوے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

(ا) اگر ان پیشوں میں سے جو اوپر مذکور ہوئے تو طالب علمی کا پیشہ اپنائے تو تجھے چاہیئے کہ پرہیز گار، قانع، علم دوست دنیا کا دشمن، بردبار، سبک روح، دیر سے سونے والا اور جلد جاگنے والا، لکھنے میں حریص، منکسر المزاج، کام سے نہ تھکنے والا۔

(ب) اگر تو مفتی اور عالم فاضل ہے تو دیانتدار بن۔

(ج) پس اے فرزند اگر واعظ بننا ہے تو حافظ قرآن بن۔

علم طب کے بیان میں یہ الفاظ قابل غور ہیں۔ فرزند اگر طبیب بننے کا اتفاق ہو تو پہلے علم طب کے بنیادی اصول سیکھ۔

علم نجوم۔ اے فرزند اگر منجم کا پیشہ اختیار کرے تو کوشش کر کہ علم ریاضی پر عبور حاصل ہو جائے۔

نغمہ اور نغمہ گوئی۔ فرزند اگر گلوکار بننے کا اتفاق ہو تو خوش اطوار اور سبک روح بن۔ حسب توفیق اپنے لباس اور جسم کو پاک وصاف اور معطر رکھ، خوش بیان بن۔ جب تو محل میں گانے کے

لتے جائے تو ترش روئی اور افسردگی کا اظہار نہ کر۔

بادشاہوں کی خدمت کے آداب: فرزند اگر تجھے بادشاہوں کے حاشیہ برداروں میں شرکت اور خدمت سلطانی میں رہنے کا اتفاق ہو تو۔۔۔۔

کاتب اور کتابت: اگر دربار میں منشی اور کاتب کی خدمت تیرے سپرد ہو تو تجھے چاہیئے کہ۔۔۔ وغیرہ۔

شراب نوشی کے معاملے میں صاحب قابوس نامہ کا عجیب رویہ ہے وہ شراب نوشی کے آداب اور تکلفات کے باب میں کہتا ہے۔

"تمہیں نہ تو شراب پینے کو کہتا ہوں اور نہ اس سے منع کرتا ہوں کسی نے خوب کہا ہے کہ جوانی کی حرکتیں ہر نوجوان ایک دفعہ ضرور کرتا ہے، مجھے یاد ہے کہ خود مجھے بھی بزرگوں نے بہت منع کیا تھا لیکن میں ان سے باز نہ رہ سکا۔"

خوشحال خان خٹک کی تصنیف دستار نامہ موضوعات کی یکسانیت کے باوجود ایک الگ رجحان اور مختلف نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔ خوشحال بابا کے سامنے صرف ایک شخص نہیں جملہ بادشاہ اور سردار تھے اس نے ایک مکمل مسلمان کی حیثیت سے جو خدا، قرآن اور رسول ؐ کے احکامات پر پوری طرح پابند تھا قرآن اور حدیث سے حوالوں سے بات کی اور حدود سے تجاوز نہیں کیا اس کے پیش نظر پشتون معاشرہ اور اس کی روایات اور خصوصیات تھیں اس نے زندگی کے مختلف شعبوں اور فنون کے ضمن میں ایک تجربہ کار کی حیثیت سے اظہار خیال کیا ہے جن اشغال اور فنون میں وہ ماہر تھا ان کے بارے میں زیادہ تفصیلات مہیا کی ہیں۔ خوشحال خان خٹک سپاہی، تیرانداز، شہسوار، تیراک، شکاری، شجیع، سخی، شاعر، خطاط شاطر اور صاحب اولاد سردار تھا اس لئے ان خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اس کا قلم روانی سے چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور وسعتوں کو سمیٹتا ہے۔

لیکن ایک اور بات جس سے خوشحال بابا کے دستار نامے کو قابوس نامے پر فضیلت حاصل ہوتی ہے دستار نامے کا دوسرا باب ہے۔ قابوس نامہ کے مصنف نے اپنی اولاد کو ان تمام خصائل کے حصول کی تلقین نہیں کی۔ خوشحال بابا نے ان بیس خصلتوں کو تفصیل و تکمیل سے بیان کر کے بادشاہوں اور سرداروں کو اخلاقی بلندیوں کا راستہ بھی دکھایا۔

کہنے کو پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں نکولو میکیاولی نے شہزادہ THE PRINCE

کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اسی طرح شہزادوں کو شہزادگی کی لذت سے بہرہ یاب ہونے کے گر بتائے لیکن میکیاولی کی تصنیف کا رخ اخلاقی لحاظ سے منفی تھا، اس کے پیش نظر زندگی کا رس نچوڑنے اور لذت آفرینی کا رجحان تھا، خوشحال اپنے مخاطب کی شخصیت کو نکھارنے اور اس کے ذہنی افق اور زندگی کے عملی پہلو کو وسعتیں بخشنے کا عزم لئے ہوئے تھا اس لحاظ سے نظامی عروضی کا چہار مقالہ کسی حد تک دستار نامے سے یکسانیت لئے ہوئے ہے ان دونوں تصانیف میں فرق یہ ہے کہ نظامی عروضی ایک بادشاہ کے لئے دبیر، شاعر منجم اور طبیب کا وجود لازمی گردانتا ہے جب کہ خوشحال خان خٹک سردار اور بادشاہ میں ان خوبیوں کی موجودگی کو ضروری سمجھتا ہے۔

اپنے موضوع کی رفعت و وسعت اور آفاقیت کے ساتھ دستار نامہ پشتو نثر کا ایک نادر اولین نمونہ ہے اس کی نثر سادہ اور رواں دواں ہے جبکہ اس سے پیشتر بایزید انصاری اور اخون درویزہ کی تصنیفات مسجع مقفیٰ اور گنجلک عبارات کی حامل رہیں۔

یوں ہم دستار نامہ کو پشتو کی جدید نثر کا اولین حسین نقش کہہ سکتے ہیں۔ اس انداز نے آئندہ پشتو نثر پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور پشتو ادب کے دامن کو ایسے جواہر پاروں سے نوازا

کتابیات

۱۔ خوشحال خان خٹک کی شاعری۔ (مترجم خاطر غزنوی پشاور ۱۹۸۰ء)

۲۔ سنگ میل پشاور۔ ۱۹۴۸ء۔

۳۔ ننگیالی پشتون۔ پشتو ٹولنہ کابل ۱۳۴۵ش (خوشحال خان خٹک او جہانداری کا نظریہ۔ عبدالحئی حبیبی)

۴۔ پٹہ خزانہ۔ محمد ہوتک (ترتیب عبدالحئی حبیبی) پشتو ٹولنہ کابل۔

۵۔ پشتو نثر کی تاریخ۔ افضل رضا (پشتو) پشاور۔

۶۔ خیر البیان۔ بایزید انصاری (مقدمہ از مولانا عبدالقدوس قاسمی) پشتو اکیڈیمی پشاور۔

۷۔ دستار نامہ۔ ترجمہ از خاطر غزنوی۔ پشتو اکیڈیمی ۱۹۸۰ء۔

۸۔ د پشتو ادبیاتو تاریخ۔ صدیق اللہ رشتین۔ پشتو ٹولنہ کابل ۱۳۲۵ ش۔

۹۔ ریاست از افلاطون۔ ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ ۱۹۳۲ء

۱۰۔ قابوس نامہ۔ مترجمہ میاں محمد افضل مکتبۂ شاہکار لاہور۔ ۱۹۷۶ء

۱۱۔ قابوس نامہ۔ فارسی مطبوعہ بمبئی (ذخیرہ میر ولی اللہ پشاور یونیورسٹی۔)

۱۲۔ شہزادہ میکیاولی۔ مکتبۂ شاہکار لاہور۔

۱۳۔ ادبیات ایران۔

۱۴۔ چہار مقالہ۔ مرتبہ خاطر غزنوی یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور۔

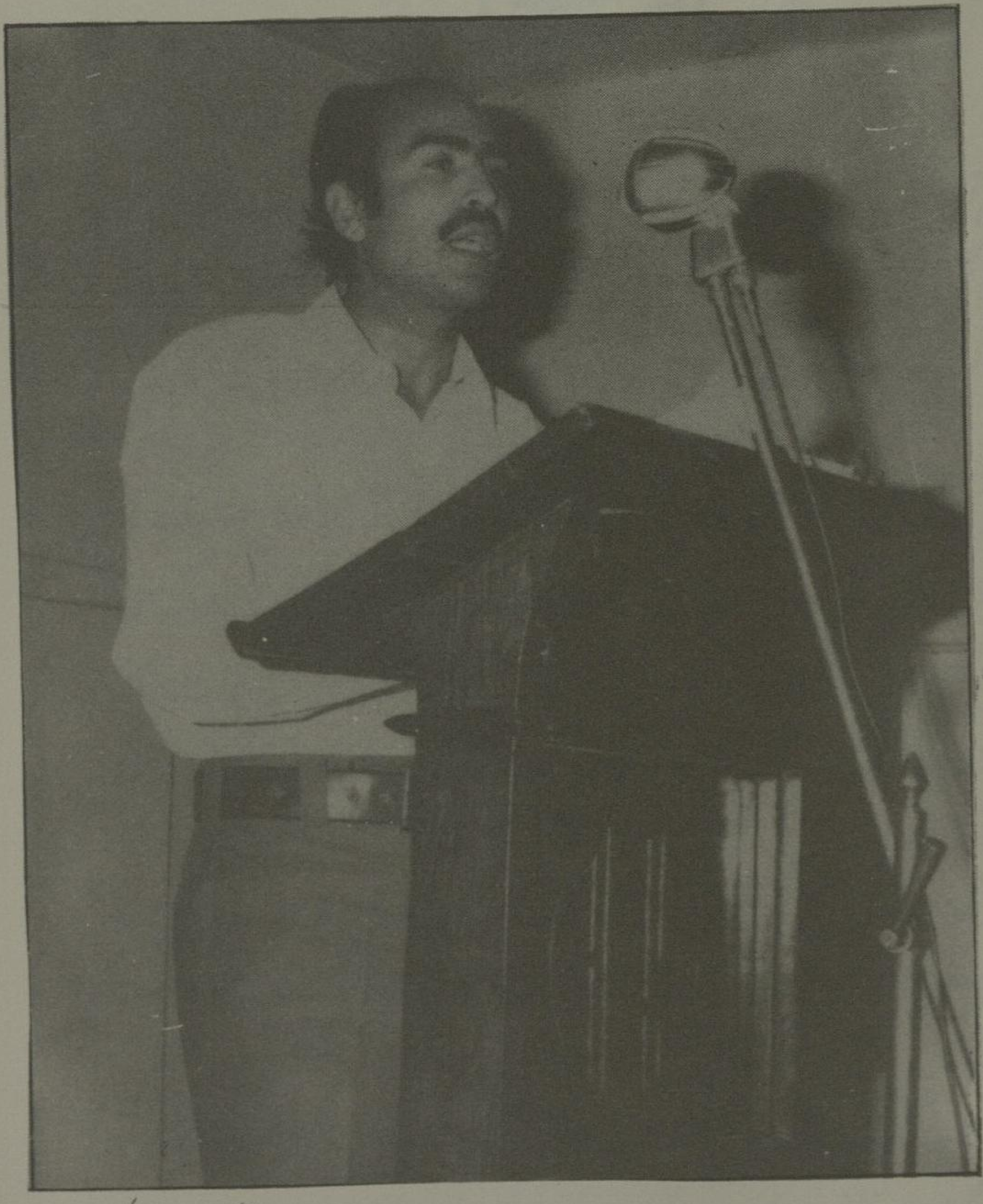
Good Reading – J. Sherwood Weber — Mentor, 1956. ۱۵

Brief Biographies -- W. Stuart Sewell — Perma Books — 1949. ۱۶

New Indian Antiquery Nov: 1939. ۱۷

History of Persia -- Brown. ۱۸

خوشحالیات



ڈاکٹر خالد خٹک

ڈاکٹر خالد خٹک

خوشحالیات

خوشحال کی تصانیف کے سلسلے میں ہمیشہ مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا رہا ہے اور یہ تعداد سینکڑوں تک بنائی گئی ہے ممکن ہے اُن کی چند ایک تصانیف ضائع ہو گئی ہوں مگر یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اُن میں سے اکثر ہم تک پہنچی ہیں اور زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں جن کی تفصیل یوں ہے۔

دیوانِ خوشحال خان خٹک:۔ خوشحال خان کی سب سے ضخیم منظوم تصنیف ہے اور یہی کتاب انہیں اپنے مکمل خد و خال کے ساتھ ہم سے متعارف کراتی ہے۔ اس میں اُن کی غزلیں، نظمیں اور رباعیاں شامل ہیں۔ اس کتاب میں اُن کی سوانح حیات، اُن کے افکار و نظریات اور جنگی مہمات کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ یہ دیوان اُن کے فن اور فلسفے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

دیوان خوشحال پہلی بار بیلیو کی نگرانی میں ۱۸۶۹ء میں جیل پریس پشاور میں چھپا اسی ایڈیشن کی مکمل نقل ۱۹۲۹ء میں ہوتی مردان سے شائع ہوئی جس کا مقدمہ عبدالمجید افغانی نے لکھا تھا۔

دیوان کھڑک سنگھ کتب فروش پشاور نے دیوان کے چند نامکمل ایڈیشن سستے کاغذ پر شائع کئے تھے، مگر اب یہ نایاب ہیں۔

۱۹۳۸ء میں عبدالحئی حبیبی نے قندھار سے "د خوشحال ملغلرے" کے نام سے اُن کا مکمل دیوان دو جلدوں میں شائع کیا۔

آزادی کے بعد جناب دوست محمد خان کامل کے مقدمے اور حواشی کے ساتھ "کلیاتِ خوشحال" مرحوم عبدالخالق خلیق کے ادارہ اشاعت سرحد پشاور سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا نقش ۱۹۶۰ء میں سامنے آیا۔

فضل نامہ:۔ خوشحال خان کی منظوم تصنیف ہے جس میں اسلامی فقہ آسان انداز میں بیان کیا گیا ہے یہ کتاب ادارہ اشاعت سرحد پشاور سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔

طب نامہ:۔ علم طب سے متعلق مختصر منظوم رسالہ پشتو اکیڈیمی کابل سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔

باز نامہ:۔ شاہین کی اقسام، عادات و اطوار، شکار، بیماریوں اور علاج سے متعلق یہ گراں قدر منظوم تصنیف ۱۹۵۳ء میں پشتو اکیڈیمی کابل سے شائع ہوئی۔

ان مکمل تصانیف کے علاوہ کلام خوشحال کے چند منتخبات بھی شائع ہوئے۔ گلشن روہ ۱۸۵۹ء اور کلید افغانی ۱۸۷۲ء میں خوشحال کا منتخب کلام شامل ہے۔ پشتو اکیڈیمی پشاور نے "منتخبات خوشحال" کے نام سے اردو ترجمے کے ساتھ منتخب کلام ۱۹۵۶ء میں شائع کیا۔

"خوشحال او پسرلے" کے نام سے ایک مختصر انتخاب عبدالرؤف بے نوا نے ریڈیو افغانستان کابل کی طرف سے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا جس میں موسم بہار سے متعلق خوشحال کے اشعار کا انتخاب شامل ہے۔

جناب سیّد رسول رسا نے خوشحال کی بیشتر منظوم تصانیف کو یکجا ایک ضخیم کتاب کی صورت میں "ارمغان خوشحال" کے نام سے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا جس کے ساتھ ۱۴۴ صفحے کا ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے۔

خوشحال خان خٹک نے نثر میں دو تصانیف لکھیں۔ ایک ان کی بیاض یا روزنامچہ ہے جس کا کچھ حصہ افضل خان خٹک نے تاریخ مرصع میں شامل کیا ہے۔ مگر باقی اب دستیاب نہیں۔ دوسری تصنیف "دستار نامہ" ہے جس میں خوشحال خان نے یہ بتایا ہے کہ ایک قومی رہنما کو کن صفات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ دستار نامہ ۱۹۵۲ء میں پشاور سے اور ۱۹۶۶ء میں کابل سے شائع ہوئی۔ دستار نامہ کا اُردو ترجمہ خاطر غزنوی کیا اور ۱۹۸۰ء میں پشتو اکیڈیمی نے شائع کیا۔

کلام خوشحال کے تراجم:۔ خوشحال کے کلام کا پہلا انگریزی ترجمہ مشہور انگریز مستشرق میجر راورٹی نے کیا۔ انہوں نے SELECTION, FROM, THE POETRY OF THE AFGHANS میں خوشحال کی ۹۸ منتخب نظموں اور غزلوں کا انگریزی ترجمہ ۱۸۶۲ء میں شائع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال اسی ترجمے سے خوشحال کے افکار سے متعارف ہوتے تھے۔ خوشحال کے کلام کا دوسرا

مشہور ترجمہ کیمبرج یونیورسٹی کے سی۔ای۔ بڈلف (C.E. BIDDULF) نے ۱۸۹۰ء میں کیا۔ اُن کی کتاب SELECTIONS FROM THE POETRY OF KHUSHALKHAN KHATTAK کے نام سے لندن سے شائع ہوئی تھی۔ اس ترجمہ کے ساتھ اصل متن بھی شامل ہے۔

اولف کیرو اور ہاوِل نے ایک مختصر انتخاب کا انگریزی ترجمہ POEMS OF THE KHUSHHAL KHAN کے نام سے کیا جو پشتو اکیڈیمی پشاور سے ۱۹۶۳ء میں چھپا۔

چوتھا اور آخری ترجمہ D.N. MACKENZI نے POEMS FROM THE DIWAN OF KHUSHHAL KHAN KHATTAK کے نام سے ۱۹۶۵ء میں لندن سے شائع کیا۔

اردو میں خوشحال کے منتخب کلام کا منظوم ترجمہ جناب فارغ بخاری اور رضا ہمدانی نے "خوشحال خان خٹک کے افکار" کے نام سے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا۔

دوسرا ترجمہ نثر میں سید انوار الحق نے "منتخبات خوشحال" کے نام سے کیا جو پشتو اکیڈیمی پشاور کی طرف سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔

خوشحال خان خٹک کی زندگی اور فن پر جو تحقیقی کام ہوا ہے اُن کی تفصیل یہ ہے۔

تاریخ مرصع وہ پہلی کتاب ہے جس میں خوشحال کے فاضل پوتے افضل خان خٹک نے خوشحال کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے یہ کتاب اب ۱۹۷۴ء میں دوست محمد خان کامل کے حواشی کے ساتھ پشاور سے شائع ہوئی ہے۔

"بناغلے پشتون" وہ پہلی باقاعدہ مختصر سی کتاب ہے۔ جو ۱۹۴۰ء میں نوشہرہ ادبی جرگے کی طرف سے خوشحال کے متعلق شائع ہوئی۔ اس میں سید رسول رسا کا خوشحال کے متعلق ایک مضمون اور چند شعراء کا کلام شامل ہے۔

اسی قسم کی دوسری کتاب "دَ تورے اَو دَ قلم خاوند" کے نام سے محمد نواز خان خٹک نے ۱۹۴۸ء میں مرتب کی جس میں خوشحال کے مزار پر ہونے والی ایک خصوصی تقریب میں پڑھے گئے مقالوں اور نظموں کا انتخاب شامل ہے۔

"خوشحال خان خٹک څه وائی" کے نام سے پہلی علمی اور تحقیقی کتاب عبدالروف بینوا نے لکھی جسے پشتو اکیڈیمی کابل نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔

افغانستان ہی کے ایک مشہور ادیب گل پاچا الفت نے ملی قہرمان کے نام خوشحال کی زندگی اور فن پر ایک کتاب لکھی۔ یہ قبائلی امور کی ریاست سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔

خوشحال خان خٹک کی برسی کے موقع پر دو سیمناروں میں پڑھے گئے مقالات کا انتخاب "ننکیالے پشتون" اور "توریالے پشتون" کے نام سے ۱۹۶۶ء اور ۱۹۷۱ء میں پشتو اکیڈیمی کابل سے شائع ہوا۔

"دخوشحال بابا یو شعر" کے عنوان سے جناب امیر حمزہ خان شنواری نے خوشحال کے ایک شعر کی تشریح کی ہے جو فلسفہ وحدت الوجود سے متعلق ہے یہ کتاب ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

اردو میں خوشحال کی زندگی اور فن پر ایک جامع کتاب دوست محمد خان کامل نے ۱۹۵۲ء میں شائع کی۔ یہ ایک بھرپور تحقیقی کتاب ہے جس میں اُن کے کلام کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔

"خوشحال واقبال" اور "تعلیمات خوشحال" اُردو زبان میں میر عبدالصمد خان کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ جو ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئیں۔ پہلی میں خوشحال واقبال کا موازنہ کیا گیا ہے جبکہ دوسری خوشحال کے افکار اور تعلیمات کی وضاحت کرتی ہے۔

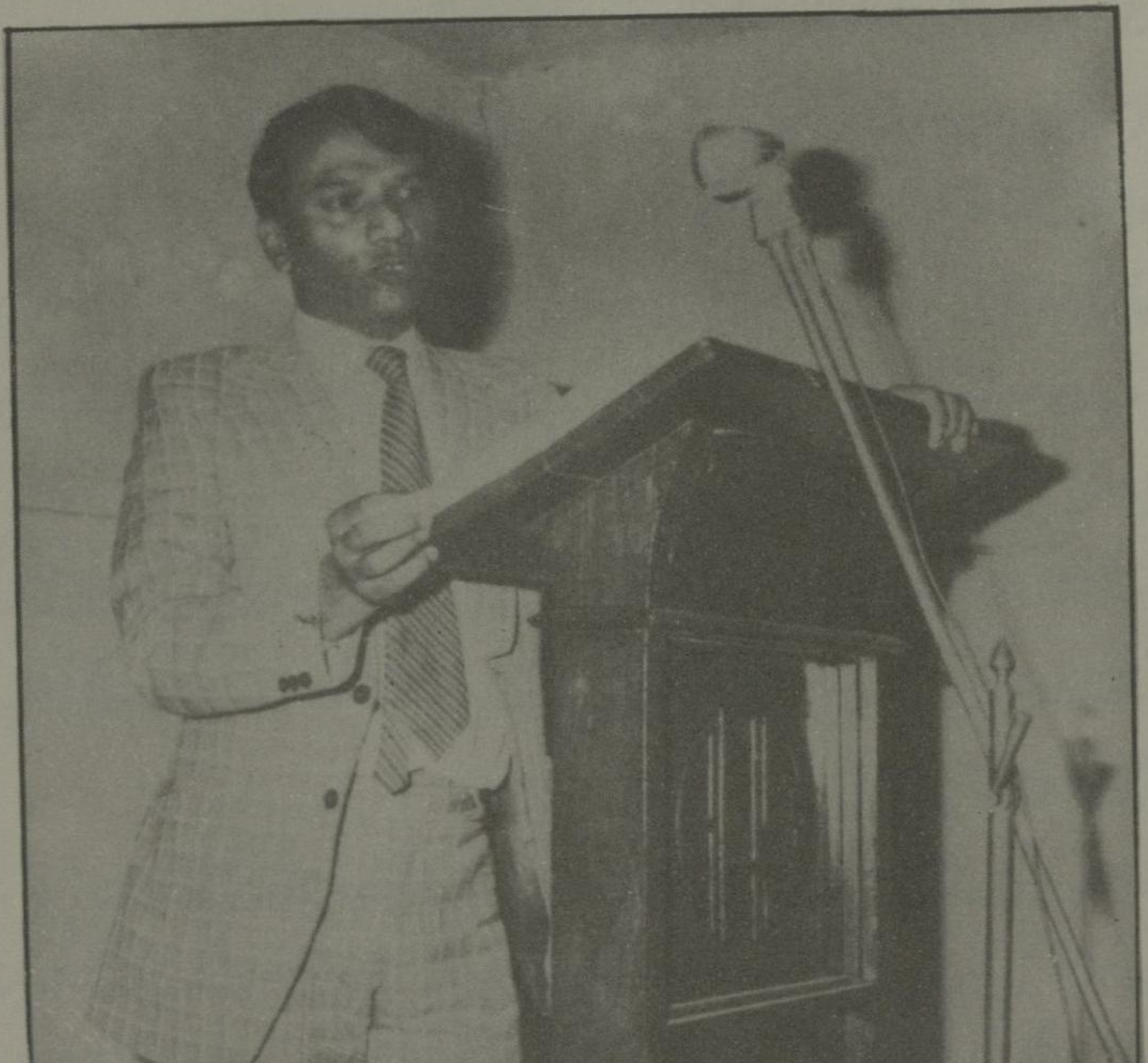
فارسی میں خوشحال خان خٹک کیست؟ محترمہ معصومہ عصمتی کی تحقیقی کاوش ہے جو افغانستان میں شائع ہوئی۔

انگریزی میں کامل صاحب کی کتاب ON A POREIGN APPROACH TO KHUSHHAL قابل ذکر ہے۔

خوشحال پر تحقیقی کام جاری ہے۔ اس مختصر مضمون میں اُن علمی اور ادبی جریدوں کا ذکر نہیں کیا جاسکا۔ جو وقتاً فوقتاً خوشحال نمبر نکالتے رہے ہیں اور جن میں خوشحال کی زندگی اور فن پر مفید مقالے شائع ہوتے رہے ہیں۔

متذکرہ بالا کتابوں میں سے اکثر اب کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی تحقیق کے ساتھ ساتھ ان قیمتی کتابوں کو بھی محفوظ کیا جائے اور انہیں از سر نو شائع کرنے کا انتظام کیا جائے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اب ان تقریبات کے موقع پر خوشحال خان کے منتخب کلام کا ایک انتہائی عُمدہ منظوم ترجمہ جناب خاطر غزنوی کا "خوشحال خان خٹک کی شاعری" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ نیز زیتُون بانو اور تاج سعید نے خوشحال شناسی کے عنوان سے اردو کے منتخب تحقیقی مقالات مرتب کئے ہیں۔

مصوّری



سلیم اصغر

سلیم اصغر

مصوری کی نمائش

خان بابا کی تین سو سالہ برسی کی تقریبات کو صاحب سیف وقلم کے شایان شان منانے کیلئے اباسین آرٹس کونسل پشاور نے جو سہ روزہ مجلس مذاکرہ ترتیب دی اسمیں کونسل کے اپنے خصوصی دائرہ کار کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا اور خوشحال خان خٹک کی قلمی تصاویر کا ایک مقابلہ منعقد کیا گیا۔

میں کونسل کیطرف سے اس نمائش میں آپکی شرکت کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔ خصوصی طور پر محمد یوسف خان اورکزئی کا جنہوں نے اپنی مصروفیات میں سے وقت لمحے ہمیں دیئے اور اس تقریب کا مہمان خصوصی بننا قبول فرمایا۔ جناب محمد یوسف خان اورکزئی کا تعلق پولیس سے ہے لیکن انہیں فنون لطیفہ اور خصوصی طور پر مصوری سے بڑی دلچسپی ہے اور وہ اپنے فارغ اوقات میں کینوس پر رنگ بکھیرنے اور خوبصورت نقوش ابھارنے میں صرف کرتے ہیں۔

گذشتہ ادبی نشستوں میں خوشحال بابا کی زندگی، سیرت اور ادبی کارناموں پر بہت کچھ کیا گیا، ان کی زندگی کا ایک پہلو فنون لطیفہ سے محبت کا بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے علاقے کے مصوروں نے خان بابا کی شبیہہ سازی کی طرف بھی توجہ دی۔

شاعر اور مصور کا آپس میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ دونوں ثقافت کے لطیف پہلوؤں کے ترجمان ہیں۔ شاعر اپنے قلم سے اور مصور موقلم سے قوموں کی ثقافت محفوظ کرتے ہیں اور آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

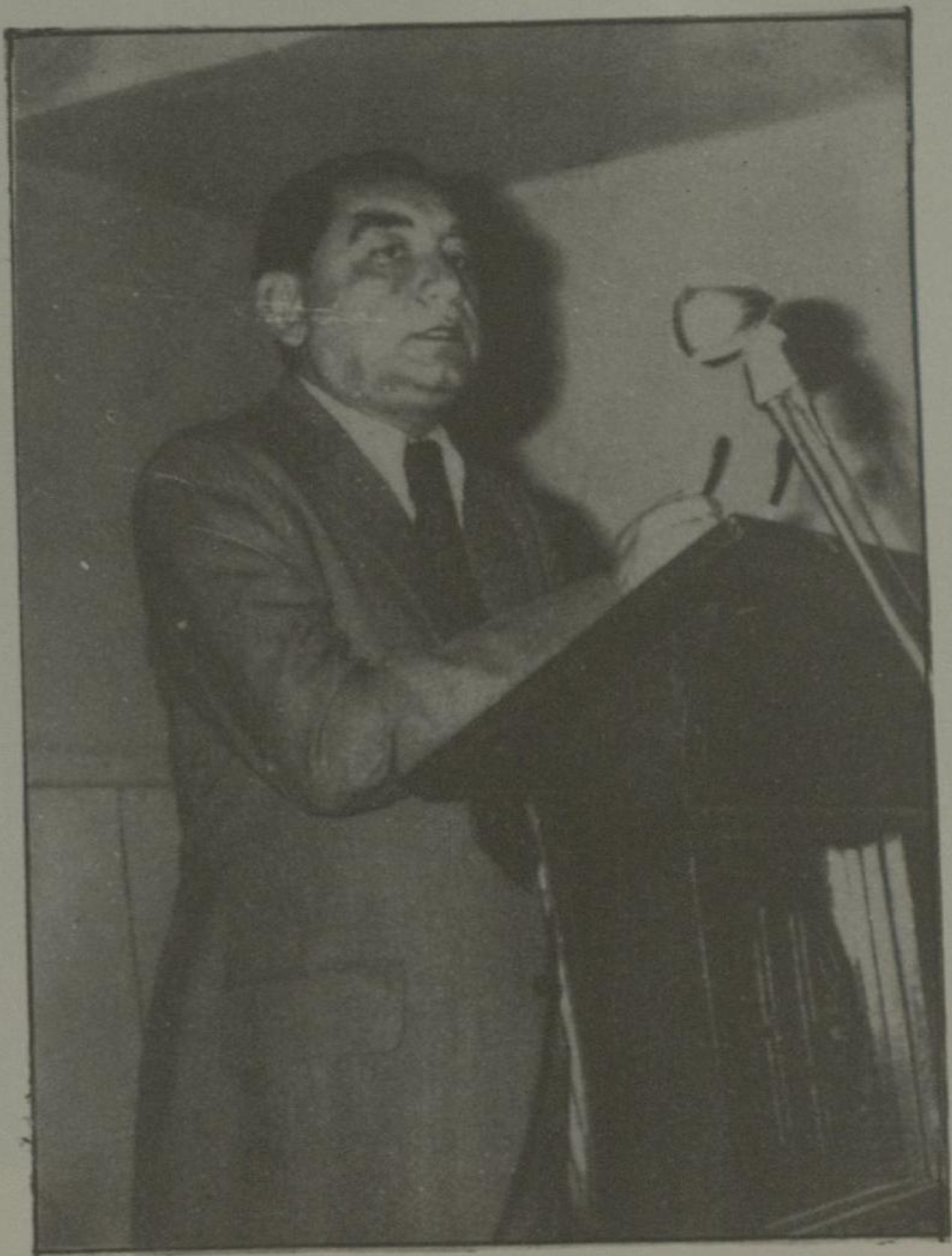
خوشحال خان خٹک کی پہلی تصوراتی تصویر افغانستان میں رائج ہوئی جو ایک عرصے سے پشتو زبان و ادب کی کتابوں کی زینت بن رہی ہے۔ یہ تصویر خوشحال خان خٹک کے صرف ایک رخ کی عکاسی کرتی ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر عام آدمی صرف یہ اندازہ لگاتا ہے کہ یہ کسی جنگجو کی تصویر ہے۔ یہ تصویر خان بابا کی زندگی اور فن کے دوسرے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کیلئے قاصر ہے۔ یعنی یہ کہ وہ شاعر بھی تھے، ادیب بھی، فلسفی بھی تھے، حکیم بھی، مؤرخ بھی، جغرافیہ دان بھی تھے، سپاہی بھی تھے، صوفی بھی تھے، مذہبی تھے، عالم بھی

سیاستدان بھی تھے اور سیّاح بھی، حُسن پرست بھی تھے اور فرض شناس بھی۔

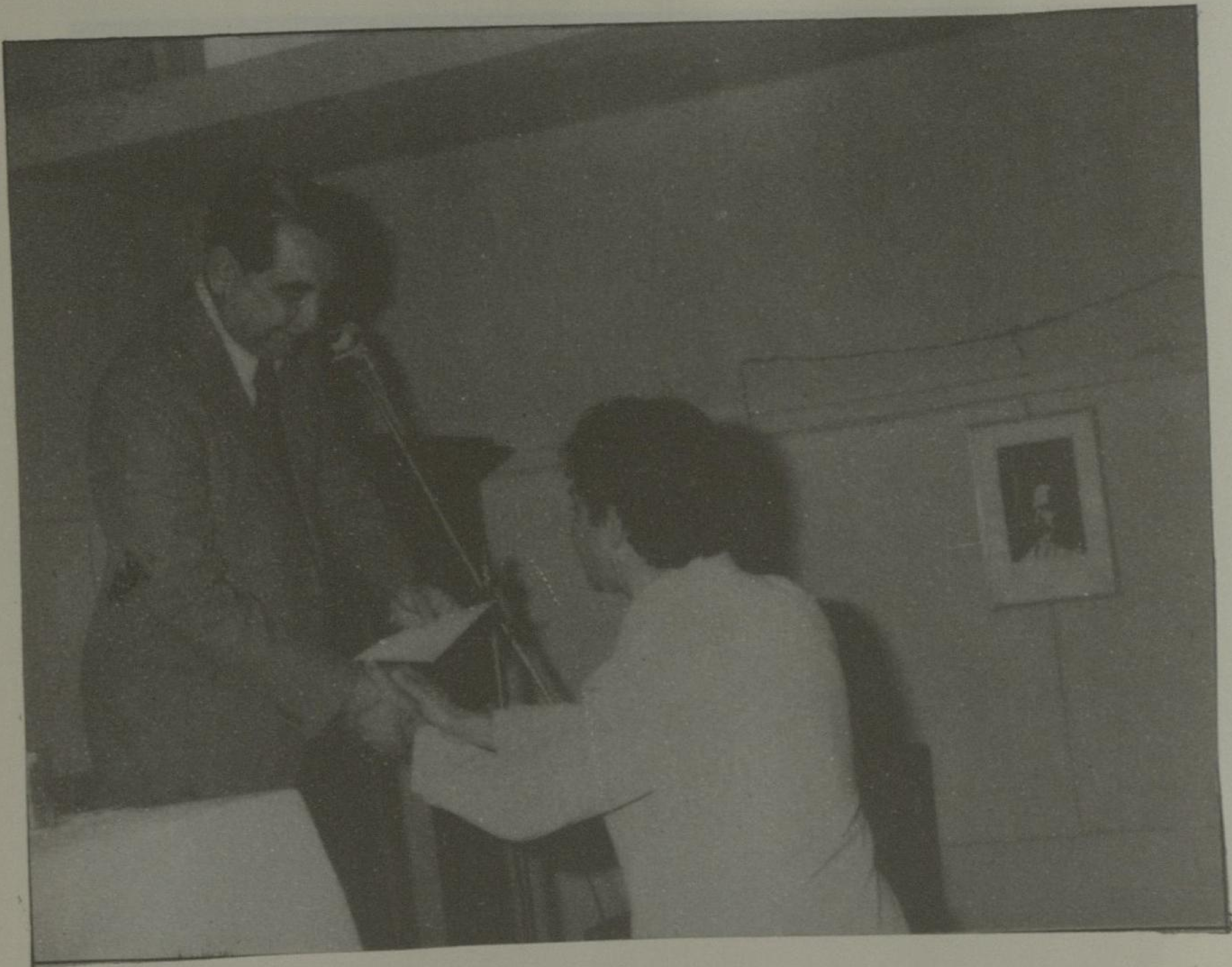
اس کمی کو پُورا کرنے کی ذمّہ داری اباسین آرٹس کونسل نے اٹھائی اور ایک انعامی مقابلہ منعقد کرایا جس کا موضوع تھا "خوشحال مصوّر کی نظر میں"۔ اس مقابلے کی تصاویر پیشِ خدمت ہیں۔ قلمی تصاویر کے علاوہ ہمارے چند مجسّمہ سازوں نے جن میں جناب ارشاد زمبیل، ارباب سردار اور عباس علی شامل ہیں اپنے مجسمے بھی نمائش میں رکھے ہیں۔ جو انعامی مقابلے میں شامل نہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ آپ ان تصاویر کو پسند کریں گے۔ میں جناب سعید سُلطان خٹک کو ان کی تصویر پر مبارکباد پیش کرتا ہوں جس نے اوّل انعام حاصل کیا۔ اس تصویر میں مصوّر نے خان بابا کی خصوصیات کو سمونے کی کوشش کی ہے اور کامیابی حاصل کی ہے۔

اُمید ہے آئندہ خوشحال بابا کی یہی تصویر مضامین و کتب کی زینت بنا کرے گی۔



محمد یوسف خان اورکزئی انسپکٹر جنرل پولیس صوبہ سرحد
مصوری کی نمائش کے مہمانِ خصوصی



مصوری کی نمائش کے مہمان خصوصی



خوشحال صدمی سیمینار کی مصوری کی نمائش کے حاضرین

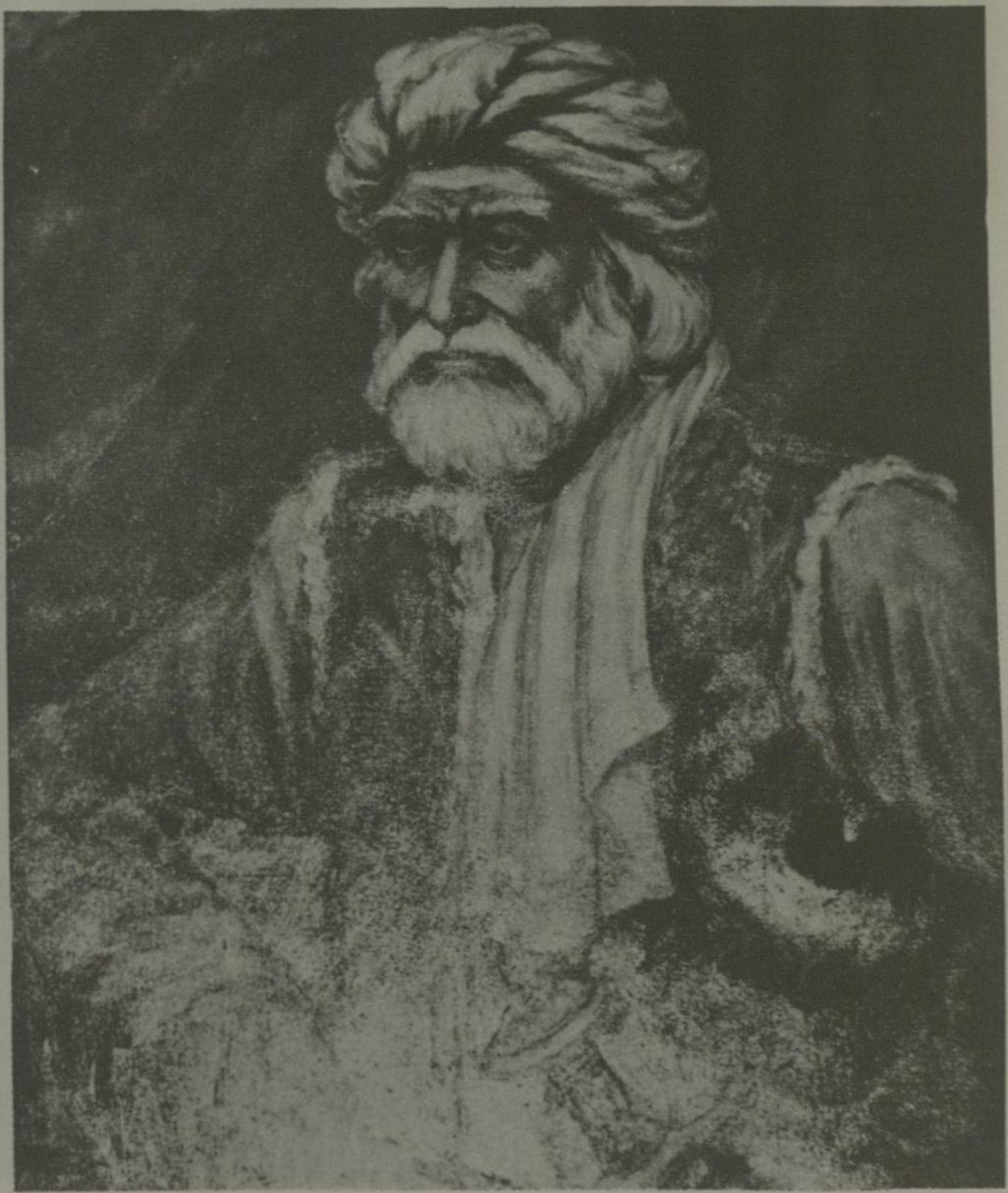


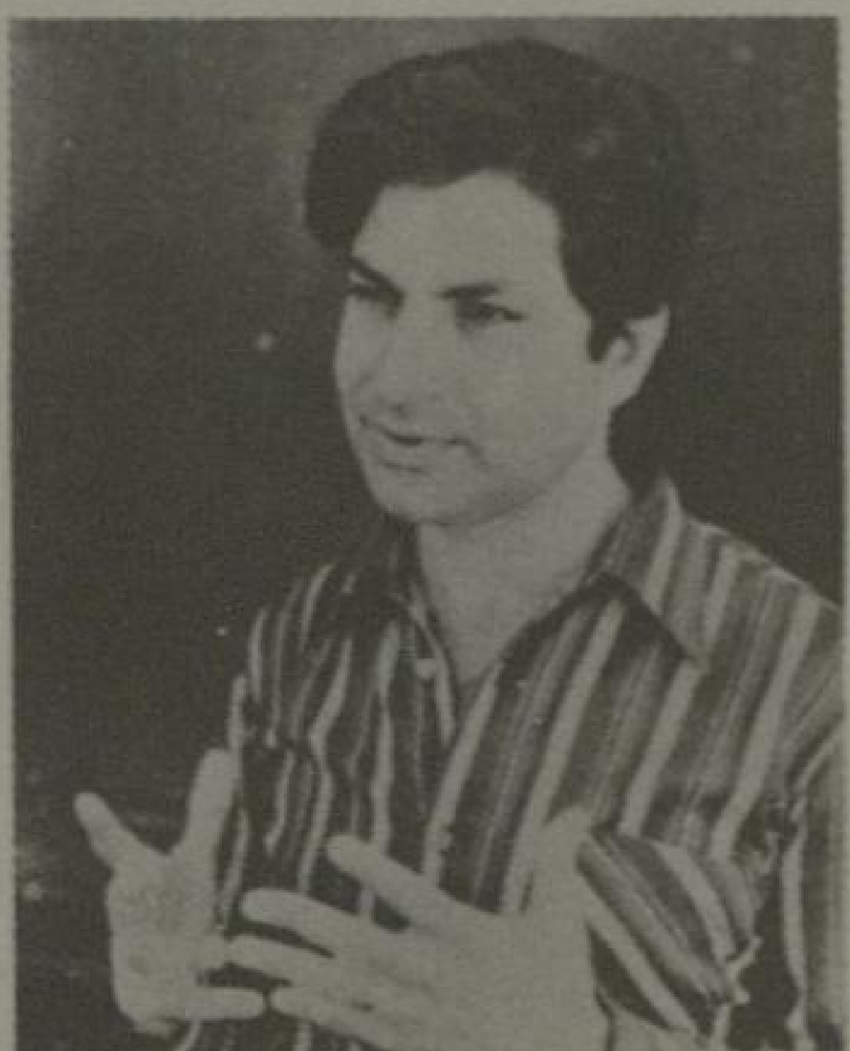
نمائش کا ایک منظر

مصوری کے نمونے

حصہ لینے والے

محترمہ بیگم رؤف
آنسہ غزالہ
آنسہ شیریں بانو
آنسہ فرحت جہاں
جناب تسنیم شہزاد
جناب سعید سلطان خٹک
جناب ناصر الدین مہمند
جناب اے۔ اعوان
جناب عباس علی
جناب ایم۔ نذیر
جناب توصیف
جناب نوشاد
جناب محمد ظہور
جناب اے۔ جے پرویز
جناب ارشاد



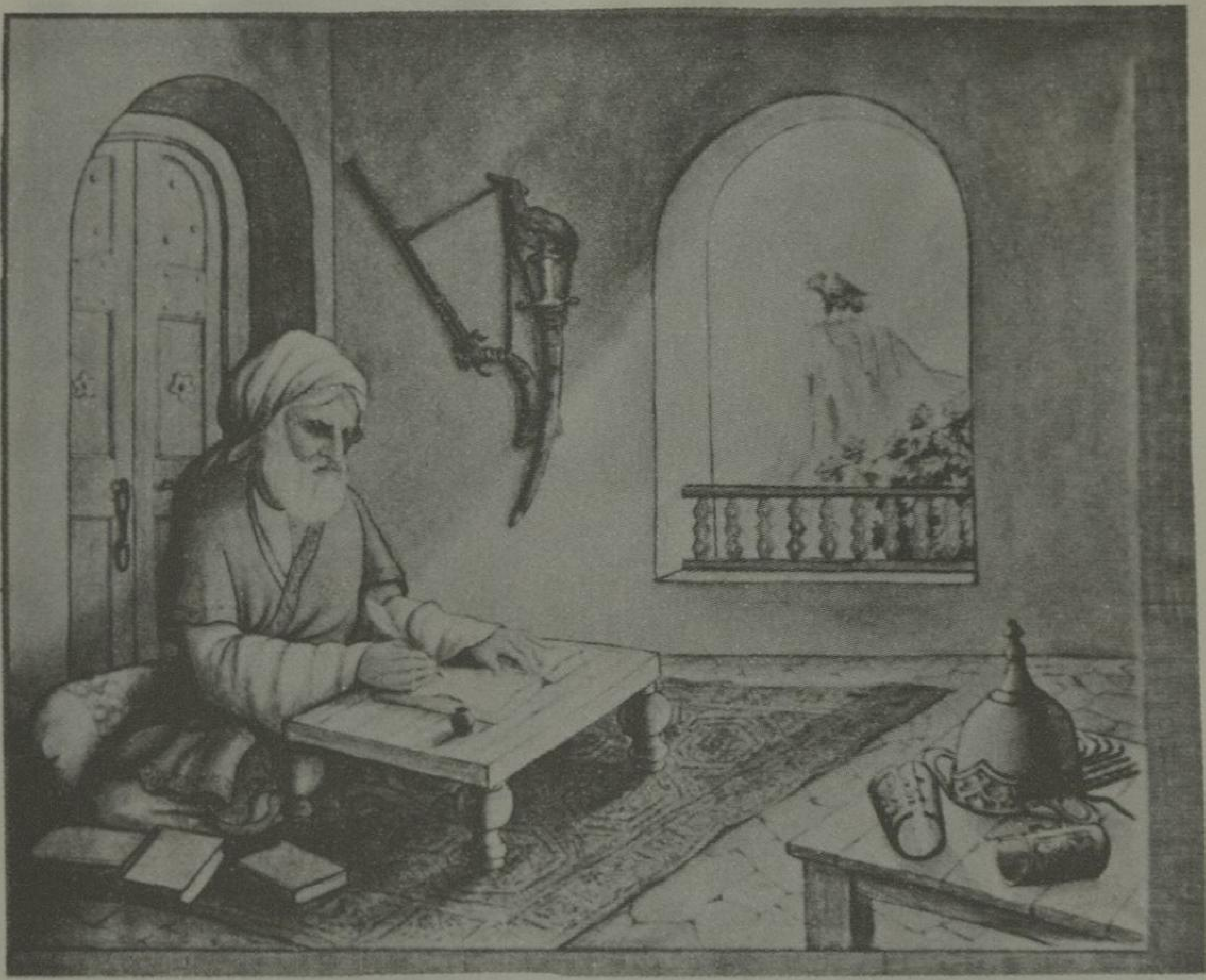


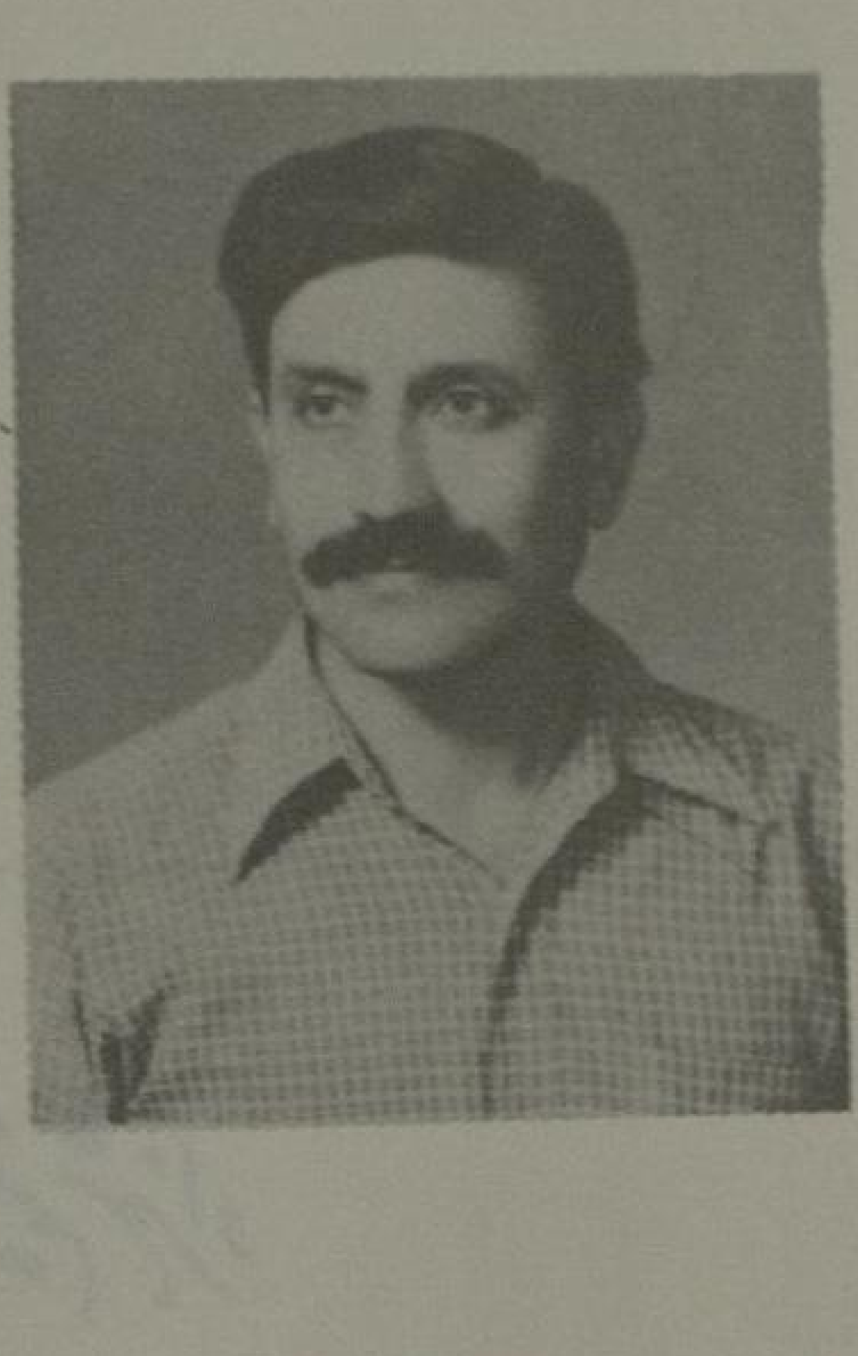
سعید سلطان



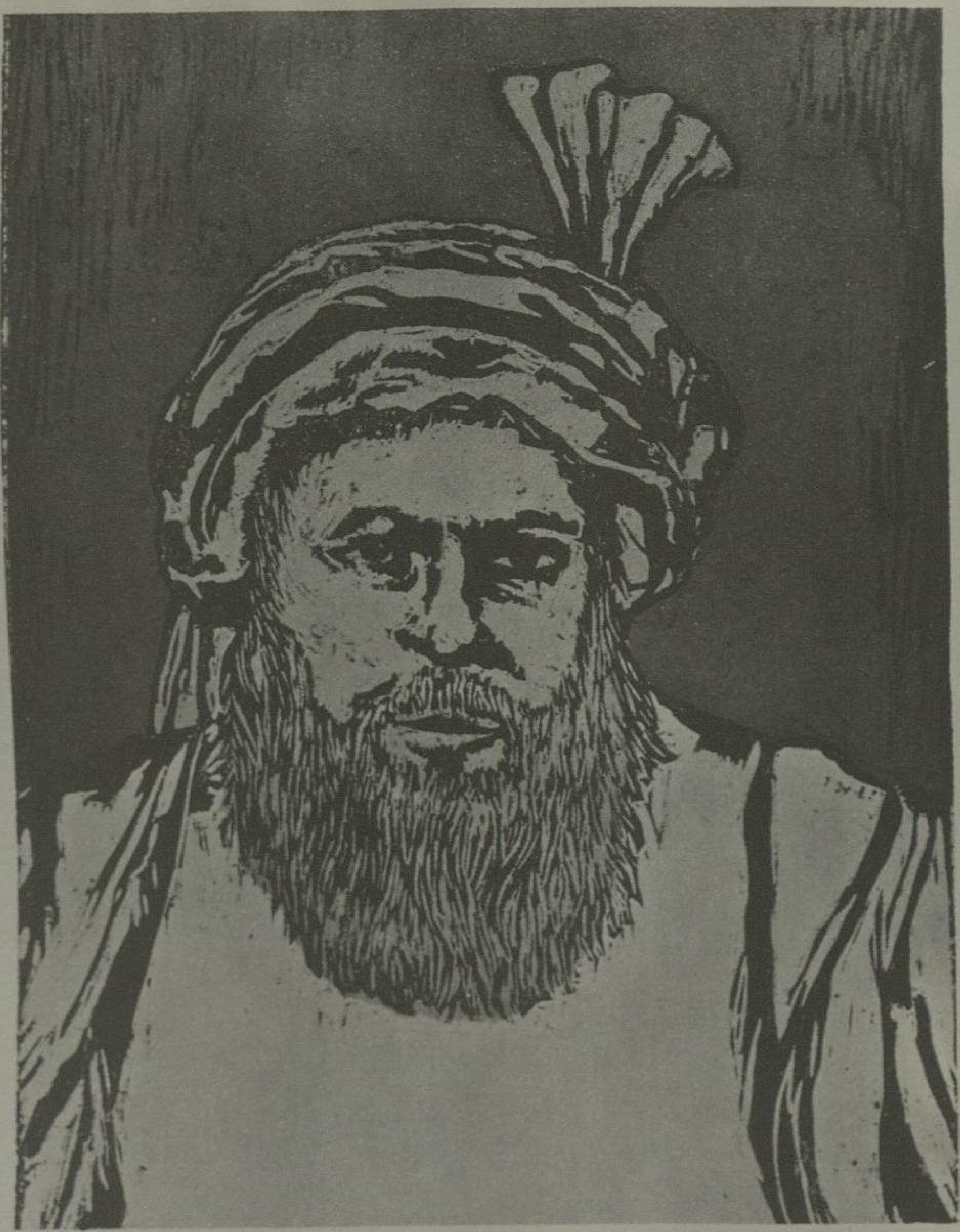


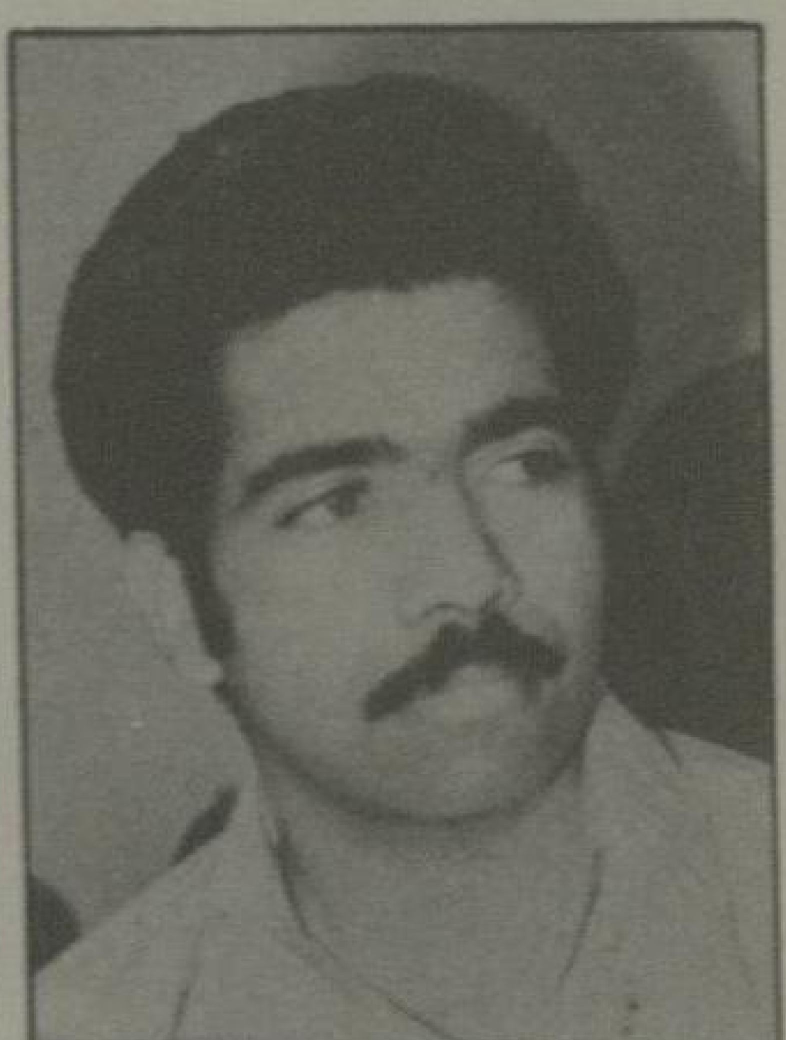
بیگیم نسیم رئوف





ناصرالدین مهمند

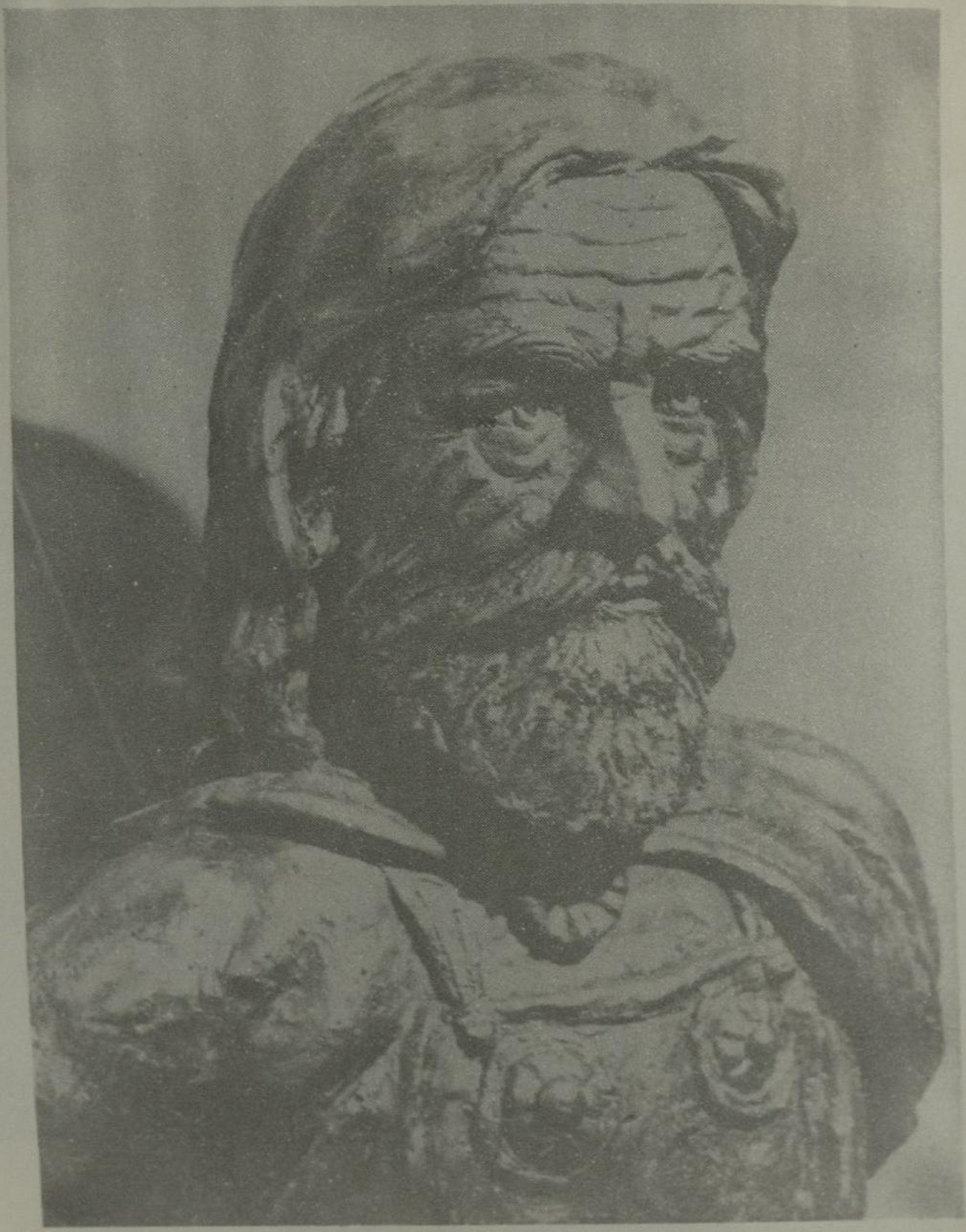


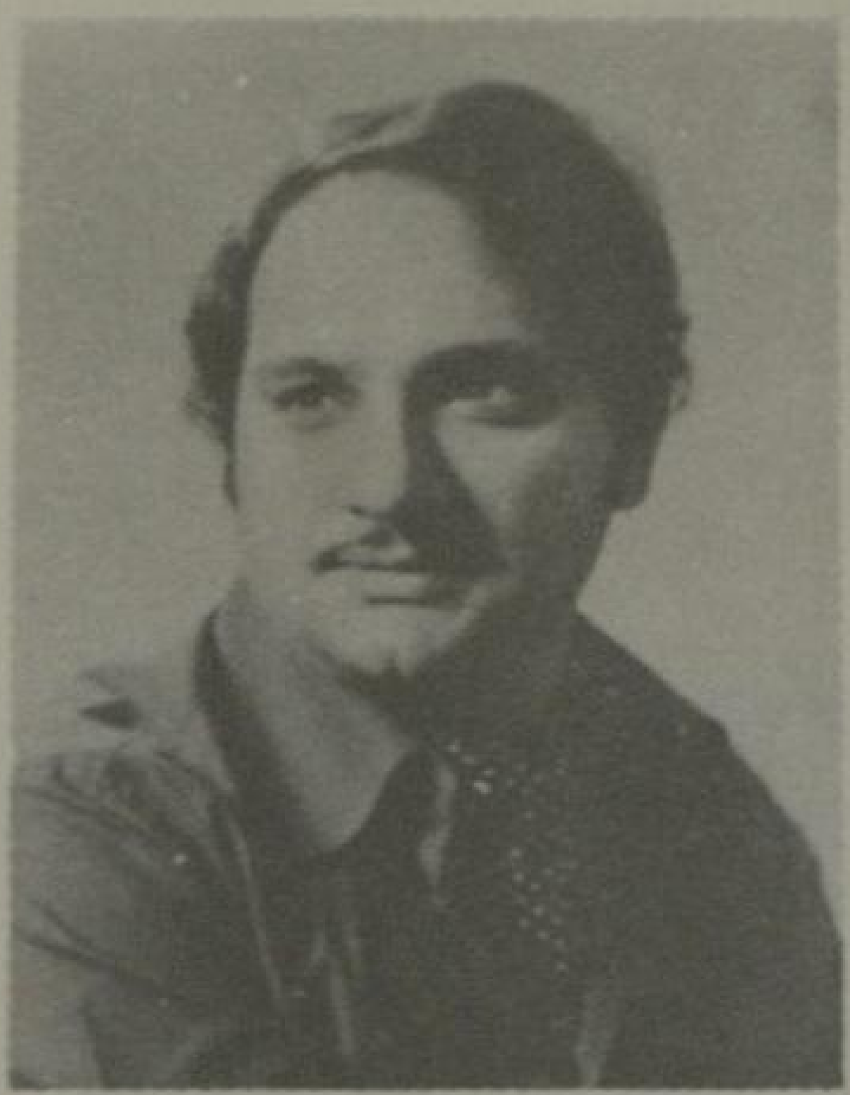


تسنیم شہزاد

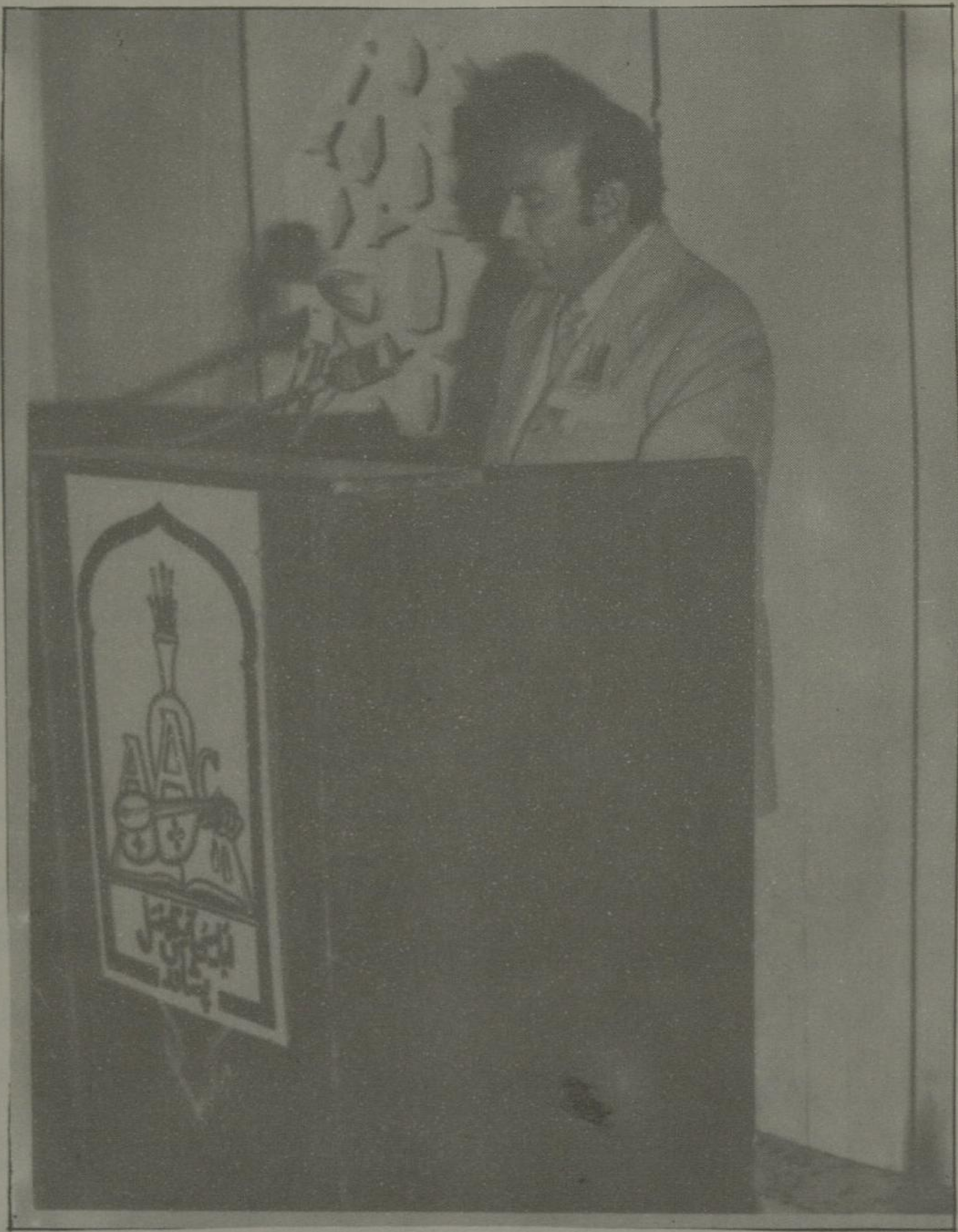


آنسہ فرحت جہاں





ارباب سردار



شمشاد احمد صدیقی، مشیر ادبیات

شمشاد صدیقی

جشنِ خوشحال

پشتو زبان کے عظیم شاعر، ممتاز دانشور، بہادر سپاہی اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ایک نابغہ روزگار شخصیت خوشحال خاں خٹک کی تین سو سالہ برسی کے موقع پر اس صاحب سیف و قلم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے، ان کے خیالات و افکار سے دنیا کو روشناس کرانے، اسکی تاریخ ساز زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق و جستجو کی دعوت دینے کیلئے ملک بھر تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ صوبہ سرحد میں بھی مختلف ادبی تنظیموں نے اس عظیم انسان کو جو بیک وقت شاعر بھی تھا اور سپاہی بھی خراجِ عقیدت پیش کرنے کیلئے مختلف تقریبات کا انعقاد کیا۔

اباسین آرٹس کونسل نے بھی جو ملک کے ان چند اداروں میں سے ایک اور صوبہ سرحد میں واحد ادارہ ہے جو فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں کی ترقی اور فروغ کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کی تاریخ ساز شخصیتوں کے افکار و پیغامات سے نئی نسل کو روشناس کرانے کیلئے سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ خوشحال خاں خٹک کو شایانِ شان انداز میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کیلئے ایک جامع پروگرام ترتیب دیا۔ اباسین آرٹس کونسل کی مجلسِ انتظامیہ نے ایک خصوصی اجلاس میں خوشحال خاں خٹک کو شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا اور جشنِ خوشحال کے سلسلہ میں مختلف تقریبات کے انعقاد کی منظوری دی۔ یہ صوبہ سرحد میں تقریبات کی ابتداء تھی۔ اسی روز یعنی ۲۲ فروری کو بہتی میں خوشحال خان ادبی جرگہ نے خوشحال خاں خٹک کی تین صد سالہ برسی کے موقع پر تقریبات کا اہتمام کیا۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی وفاقی وزیر تعلیم جناب محمد علی خان آف ہوتی تھے اس تقریب میں دوسرے لوگوں کے علاوہ اباسین آرٹس کونسل کے جونیئر وائس پریذیڈنٹ جناب پروفیسر پریشان خٹک اور کونسل کے اعزازی سیکرٹری پروفیسر خاطر غزنوی نے بھی شرکت کی۔

۲۵ فروری کو کونسل کے تمام اراکین مزار خوشحال پر گئے اور پھولوں کی چادر چڑھائی۔ واپسی پر پاکستان خوشحال ادبی جرگہ اکوڑہ خٹک کے زیر اہتمام منعقدہ ایک تقریب میں شرکت کی۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی بھی وفاقی وزیر تعلیم محمد علی خان آف ہوتی تھے۔ اس تقریب میں پروفیسر پریشان خٹک نے "خوشحال اور پشتو" کے موضوع پر مختصر مگر انتہائی مدلل، جامع اور فکر انگیز تقریر کی اور خاطر غزنوی

نے خوشحال خاں خٹک کی نظم کا منظوم ترجمہ پیش کیا۔

صاحب سیف و قلم خوشحال خاں خٹک کی تین صد سالہ برسی کے موقع پر اباسین آرٹس کونسل کے زیرِ اہتمام سہ روزہ قومی مجلسِ مذاکرہ کا آغاز ۲۹ ، مارچ کو ہوٹل خیبر انٹر کانٹی نینٹل کے وسیع و عریض ہال میں منعقدہ افتتاحی تقریب سے ہوا۔ اس افتتاحی تقریب کے مہمانِ خصوصی صوبہ سرحد کے گورنر اور زون بی کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جناب لفٹیننٹ جنرل فضل حق تھے۔ حق بات تو یہ ہے کہ جناب لفٹیننٹ جنرل فضل حق صوبائی گورنر کی حیثیت سے اگر ایک طرف صوبہ کی اقتصادی، صنعتی اور معاشی ترقی کے لئے کوشاں ہیں تو دوسری طرف تعمیری ثقافتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں بھی زیادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اباسین آرٹس کونسل تو خاص طور پر اُن کی مشکور ہے۔ افتتاحی تقریب کے سلسلہ میں ہال کو شایانِ شان طور پر انتہائی خوبصورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ صدر مجلس کے ساتھ شہ نشیں پر اباسین آرٹس کونسل کے صدر جناب جمشید برکی تشریف فرما تھے۔ ڈائس کے ساتھ چار کرسیوں پر اباسین آرٹس کونسل کے چار عہدیدار سینیئر نائب صدر قاضی سرور، جونیئر نائب صدر جناب پروفیسر پریشان خٹک، اعزازی سیکرٹری خاطر غزنوی اور مشیرِ ادبیات شمشاد صدیقی بیٹھے تھے۔

سہ پہر چار بجکر پندرہ منٹ تک سب مہمان اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے مہمانِ خصوصی گورنر لفٹیننٹ جنرل فضل حق پہنچے تو صدر دروازہ پر اباسین آرٹس کونسل کے صدر جناب جمشید برکی اور دوسرے عہدیدار جناب پروفیسر پریشان خٹک، پروفیسر خاطر غزنوی، جناب جمیل صدیقی، جناب ایس اے جبار، شمشاد صدیقی، محسن احسان اور جناب محمد شفیع صابر نے مہمانِ خصوصی کا استقبال کیا۔ مجلسِ انتظامیہ کی ایک رکن آنسہ روبینہ نازلی نے مہمانِ خصوصی کے کوٹ کے کالر پر خوشحال خاں خٹک کی تقریبات کا خصوصی بیج لگایا جب مہمانِ خصوصی تقریب کے ہال کے بڑے دروازہ کے سامنے کونسل کے عہدیداروں کے جلو میں پہنچے تو کونسل کی مجلسِ انتظامیہ کے ارکان معزز مہمان خصوصی کے لئے چشم براہ قطار میں کھڑے تھے۔ کونسل کے صدر اور پشاور ڈویژن کے کمشنر جناب جمشید برکی نے معزز مہمان سے کونسل کی مجلس انتظامیہ کے اراکین۔ سینیئر نائب صدر جناب قاضی سرور۔ جناب سلیم اصغر۔ جناب مسعود جاوید۔ جناب میثاق حسین۔ جناب غلام مصطفےٰ ثاقب حزیں۔ روشن نگینوی کا تعارف کرایا۔ جونہی گورنر لیفٹیننٹ جنرل فضل حق ہال میں داخل ہوئے تو ہال میں موجود تمام شرکاء تقریب معزز مہمان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ مہمان محترم نے ہاتھ ہلا کر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ حاضرین کے خیر مقدم کا جواب دیا۔ افتتاحی تقریب کا آغاز جناب قاری فدا محمد نے تلاوتِ قرآن مجید سے کیا۔ اس تقریب میں سٹیج سیکرٹری کے فرائض راقم الحروف (شمشاد صدیقی مشیر ادبیات) نے انجام دیئے اور سینیئر نائب صدر

عمل دیتے ہوئے کہا کہ وہ خوشحال خاں خٹک کی شخصیت اور اس کے علمی اور ادبی کارناموں کا گہری نظر سے جائزہ لیں اور پھر اس عظیم انسان کی شخصیت کے صحیح خدوخال واضح کریں۔ مہمان محترم نے کہا کہ خوشحال خاں خٹک کی شاعری کے محاسن اور اسکی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور واضح ہوتی جا رہی ہے اور یہ بات صحیح ثابت ہو رہی ہے کہ خوشحال خاں خٹک کی تحریریں دنیا کے عظیم ادب کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ خوشحال خاں خٹک ایسا صاحب قلم تھا جس نے اپنی زندگی کے ہر واقعے، ہر حادثے اور ہر سانحے کو قلمبند کیا گویا اس لحاظ سے خوشحال خاں خٹک کی شاعری جہاں زندگی کی داخلی اور خارجی لطافتوں کی ترجمان ہے وہاں خود اسکے اپنے دور کی تاریخ بھی ہے۔ انہوں نے اباسین آرٹس کونسل کو مشورہ دیا کہ وہ اس قومی مجلس مذاکرہ میں پڑھی گئی تمام تحریروں کو ایک کتاب کی صورت میں یکجا کر کے شائع کرے یہ خوشحال خاں خٹک کی تین سو سالہ برسی کے موقع پر ایک باوقار تحفہ ہو گا اور اس عظیم شخص کی عظیم خدمات کے اعتراف کا ایک ٹھوس اور جامع انداز بھی۔

مہمان محترم لفٹننٹ جنرل فضل حق نے اباسین آرٹس کونسل کی ثقافتی سرگرمیوں اور اس علاقہ میں ادب و فن کی ترویج اور ترقی کیلئے کوششوں پر اسے مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ یہ معیار جناب قاضی سرور کو خطبہ استقبالیہ پڑھنے کی دعوت دی۔ قاضی صاحب نے اپنے خطبہ میں اباسین آرٹس کونسل کی سرگرمیوں کا تفصیل سے ذکر کیا اور آئندہ پروگراموں کے بارے میں بھی بتایا۔ انہوں نے اپنے خطبہ میں عظیم شاعر خوشحال خاں خٹک کی تین صد سالہ برسی کے موقع پر تقریبات کے سلسلہ میں اباسین آرٹس کونسل کی سرگرمیوں اور مختلف تقریبات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ جناب قاضی سرور کے بعد کونسل کے جونیئر نائب صدر پروفیسر پریشان خٹک کو دعوت کلام دی گئی۔ جناب پریشان خٹک نے جو خود بھی پشتو ادب کے ممتاز ادیب، عظیم شاعر اور نقاد ہیں۔ خوشحال خان خٹک کی زندگی، ان کی شاعری، پشتو ادب میں ان کے بلند مرتبے، زندگی کے کارناموں پر مختصر مگر مدلل تقریر کی۔ آخر میں اس تقریب کے مہمان خصوصی لیفٹیننٹ جنرل فضل حق گورنر صوبہ سرحد نے اپنے مختصر لیکن نہایت جامع، پُراثر خطبہ صدارت میں اباسین آرٹس کونسل کی ان کوششوں کو سراہا جو وہ صوبہ سرحد میں علم و ادب اور دوسرے فنون لطیفہ کی ترویج و ترقی کیلئے کر رہی۔ انہوں نے ایک سپاہی کیطرح دوسرے سپاہی خوشحال خاں خٹک کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ خوشحال خاں خٹک ایک حریت پسند انسان، ایک اچھا مسلمان۔ ایک غیور شمشیر زن اور بے بدل صاحب قلم تھا۔ انہوں نے محققوں کو خاص طور پر دعوت برقرار رکھا جائے گا۔ انہوں نے کونسل کے تمام اراکین کو ان کی انتھک کوششوں پر بھی مبارکباد

پیش کیا اور دور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔

چائے کے وقفہ کے بعد ایک مختصر محفل موسیقی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس محفل موسیقی میں فنکاروں نے خوشحال خاں خٹک کا پشتو کلام اور پشتو کلام کا اردو منظوم ترجمہ پیش کیا۔ خوشحال خاں خٹک کے کلام کا یہ اردو منظوم ترجمہ جو فنکاروں نے پیش کیا وہ جناب خاطر غزنوی، جناب فارغ بخاری، جناب رضا ہمدانی اور جناب محسن احسان کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔

۳۰ مارچ کو مجلس مذاکرہ کی پہلی نشست کی صدارت حکومت صوبہ سرحد کے مشیر تعلیم جناب عبدالہاشم خان کی کی۔ ۳۰ مارچ کو مجلس مذاکرہ کی دوسری نشست سہ پہر شروع ہوئی اس نشست کی صدارت خوشحالیات کے ماہر اور آدم جی انعام یافتہ محقق جناب میر عبدالصمد نے کی۔ اس محفل میں صدر پاکستان کے طبی مشیر جناب حکیم محمد سعید نے خصوصی طور پر شرکت کی۔

مجلس مذاکرہ کی تیسری نشست ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء کو صبح دس بجے شروع ہوئی اس نشست کی صدارت جناب دوست محمد خاں کامل نے کی۔ جناب دوست محمد خاں کامل (مرحوم) وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے خوشحال خاں خٹک پر تحقیق کا دروازہ کھولا اور آج جہاں جہاں خوشحال خاں بابا پر تحقیق کا کام ہوتا ہے۔ دوست محمد خان کامل کی تحقیق اسکی بنیاد کا کام دیتی ہے وہ اپنی ٹھوس اور علمی تحقیق کے سبب بجا طور پر خوشحالیات کے امام ہیں۔ ان نشستوں میں جن دانشوروں، اور محققین نے اپنے پرمغز، فکر انگیز مقالات پڑھے ان کی اور مقالات کے موضوعات کی تفصیل یہ ہے

جناب سیال کاکڑ (کوئٹہ) خوشحال اور پشتو۔

جناب پروفیسر محمد نواز طائر۔ ڈائریکٹر پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی۔ جغرافیہ دان خوشحال۔

جناب محمد شفیع صابر۔ خوشحال ترجمان العصر۔

جناب ڈاکٹر محمد معراج الدین۔ ڈائریکٹر اقبال اکیڈیمی لاہور۔ خوشحال اور اقبال۔

جناب ڈاکٹر خالد خاں خٹک۔ خوشحالیات کا جائزہ۔

جناب سلطان محمد صابر۔ (کوئٹہ) خوشحال کا مقام بلند۔

جناب قاضی عبدالحلیم اثر۔ نابغۂ عصر۔

جناب ایوب صابر (کوہاٹ) خوشحال خاں خٹک کا المیہ۔

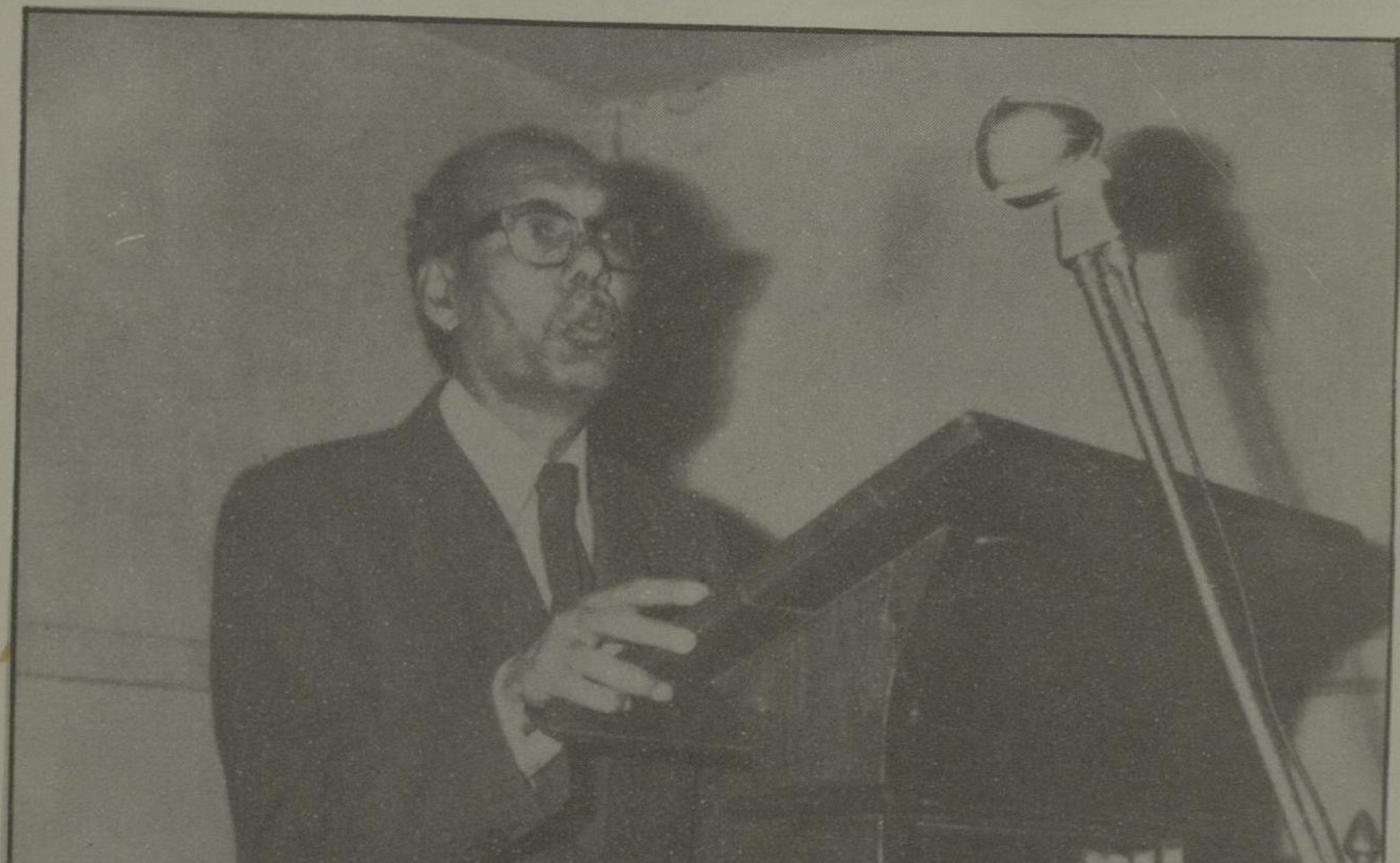
جناب پروفیسر فہم دل راہی (صوابی) دیدہ ور خوشحال خاں۔

جناب محمد نواز سرحدی (اسلام آباد) بابا کے انسانیت۔

جناب پروفیسر سید تقویم الحق کاکاخیل۔ خوشحال خاں کا تصور جمال۔

جناب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (لاہور) پاکستان کا قومی شاعر خوشحال۔

جناب ڈاکٹر سید اختر جعفری۔ خوشحال خاں کی فارسی شاعری۔



عبدالہاشم خان وزیر تعلیم صوبہ سرحد

محترمہ چاند بی بی سلطانہ (حیدر آباد) ایک شاعر غیرت مند۔
جناب رحم زمان خٹک (اسلام آباد) خوشحال بابا کا پیام۔
جناب مطلوب الرؤف ۔خوشحال بطور وجودی۔

اسکے علاوہ جناب ڈاکٹر پروفیسر سید عبداللہ چیئرمین انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور نے اپنا مقالہ "خوشحال اور عرب شاعری" بھجوایا۔ ڈاکٹر صاحب بعض وجوہ کی بنا پر خود تشریف نہ لاسکے۔ مجلس مذاکرہ کی ان تین نشستوں میں جن شعرائے کرام نے خوشحال خاں خٹک کو منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ جناب حافظ عبدالستار عارف، جناب ثاقب حزیں۔ جناب رحم زمان خٹک۔ جناب یوسف رجا چشتی۔ جناب فارغ بخاری۔ جناب رضا ہمدانی۔ جناب خاطر غزنوی۔ جناب محسن احسان۔ جناب مرزا امداد حسین بیگ۔ جناب نوابزادہ صبح صادق اور (ٹیلی ویژن ڈرامہ وارث کے شہرت یافتہ) جناب امجد اسلام امجد۔

تینوں نشستوں کے صدور صاحبان جناب عبدالہاشم خان۔ جناب میر عبدالصمد اور جناب دوست محمد خاں کامل نے اپنے صدارتی خطبات میں خوشحال خاں خٹک کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی۔ جناب دوست محمد خاں کامل نے خوشحال خاں خٹک کی شاعری کو بین الاقوامی شہرت کے مالک شعراء کے کلام کے تقابل کے ساتھ پیش کیا اور خوشحال خاں خٹک کو ایک عظیم بین الاقوامی شاعر اور اسکے کلام کو آفاقی کلام ثابت کیا۔

۳۱ مارچ کی شام کو خوشحال خاں خٹک کی تصاویر پر مبنی ایک نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اب تک خوشحال بابا کی خیالی تصویر رائج رہی۔ اباسین آرٹس کونسل نے خوشحال بابا کی شخصیت اور کارناموں کو مدنظر رکھ کر ایک نئی تصویر رائج کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں کونسل نے دو ہزار روپے کے انعام کا بھی اعلان کیا۔ اس میں ایک جرگے نے بھی پانچ سو روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا لیکن بعد میں جرگہ اپنے فیصلہ سے پھر گیا۔ تصاویر ہال میں بڑی خوبصورتی اور قرینے کے ساتھ سجائی گئی تھیں۔ آرٹ کے مشیر جناب سلیم اصغر نے اس نمائش کو ترتیب دینے میں دن رات ایک کر دیئے ان کی محنت رنگ لائی اور نمائش بہت خوب رہی۔ نمائش میں رکھی گئی تصاویر کو ماہر مصوروں، مصوری کے نقادوں، خوشحال اور خٹک قبیلے سے واقف حضرات نے پرکھا اور اپنا فیصلہ دیا۔ اس نمائش میں سولہ [16] فنکاروں کے فن پارے نمائش کے لئے رکھے گئے۔ ان مصوروں اور رنگ تماشوں میں محترمہ بیگم نسیم رؤف۔ آنسہ غزالہ، آنسہ شیریں بانو۔ محترمہ فرحت جہاں، تسنیم شہزاد، جناب سعید سلطان خٹک، جناب ناصر الدین ہمدانی، جناب اے اعوان۔ جناب عباس علی۔ جناب ایم نذیر۔ جناب توصیف۔ جناب نوشاد۔ جناب محمد ظہور۔ جناب اے جے پرویز۔ جناب ارشاد زمیل اور جناب ارباب محمد سردار

شامل تھے۔ ججوں کے فیصلہ کے مطابق پہلا انعام جناب سید سلطان خٹک کو، دوسرا انعام محترمہ بیگم نسیم رؤف کو اور تیسرا انعام جناب ناصر الدین مہمند کو دیا گیا۔ اس نمائش کے مہمان خصوصی صوبہ سرحد کے انسپکٹر جنرل پولیس جناب محمد یوسف خان اورکزئی تھے۔ انہوں نے نمائش کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اباسین آرٹس کونسل کی کوششوں کو سراہا اور سرحد میں مصوری کے فروغ کا ذکر کیا۔ جناب اورکزئی خود بھی ایک اچھے مصور ہیں لیکن ان کی یہ صلاحیتیں ان کے فرائض کی وجہ سے دب کر رہ گئی ہیں۔

یکم اپریل کو باہر سے آئے ہوئے اباسین آرٹس کونسل کے سب مہمانوں کو مزار خوشحال پر منعقدہ ایک تقریب میں شرکت کیلئے لے جایا گیا۔

دوم اپریل کو بھی اباسین آرٹس کونسل کے تمام مہمان اور مجلس انتظامیہ مزار خوشحال پر پہنچی، جہاں صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق خصوصی طور پر مزار پر حاضری کیلئے تشریف لائے۔ انہوں نے خوشحال خان خٹک کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی۔ پروفیسر پریشان خٹک نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اور بعض معروضات پیش کیں، صدر مملکت نے خوشحال خان خٹک پر علامہ اقبال اور ان کے تصور خودی کے حوالے سے گفتگو کی۔ انہوں نے خوشحال خان خٹک کی صلاحیتوں کو سراہا اور انہیں پاکستان کا قومی شاعر اور بین الاقوامی شخصیت کا درجہ دیا۔

صدر مملکت گذشتہ تینتیس ۳۳ سال کے عرصے میں پہلے سربراہ مملکت ہیں جنہوں نے خوشحال خان خٹک کے مزار پر بنفس نفیس حاضری دی اور ان کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس موقع پر خاطر غزنوی نے اپنی کتاب "خوشحال خان خٹک کی شاعری" (جس میں خوشحال خان خٹک کے منتخب کلام کا منظوم ترجمہ ہے) صدر مملکت کو پیش کی۔

اس تقریب کے ساتھ ہی خوشحالیات کی تقریبات کا ہفتہ ختم ہوا۔

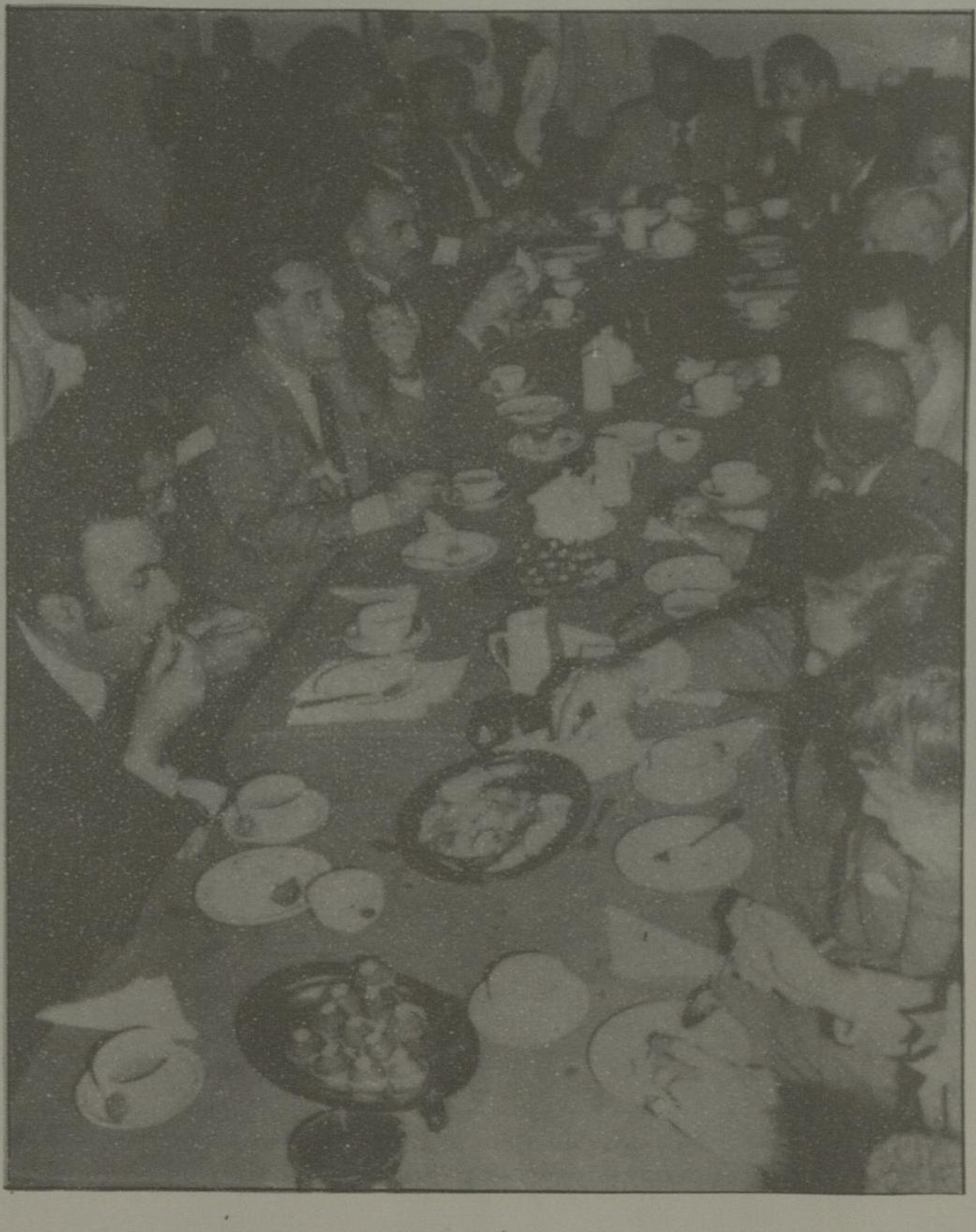
اس ہفتہ کو کامیاب بنانے میں یوں تو اباسین آرٹس کونسل کے ہر رکن اور عہدیدار نے اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا لیکن ایک خاموش کارکن کی حیثیت سے اس ہفتہ کی تقریبات کو کامیاب بنانے میں حکومت صوبہ سرحد کے سیکرٹری مالیات جناب مظفر محمود قریشی کے پرخلوص تعاون اور امداد کو بڑا دخل ہے جس کے لئے اباسین آرٹس کونسل کے تمام اراکین انکے مشکور ہیں



محترمہ روبینہ نازلی اور مہمانِ خصوصی لفٹننٹ جنرل فضل حق گورنر صوبہ سرحد کے کوٹ پر خوشحال صدی کا نشان ٹانک رہی ہیں۔



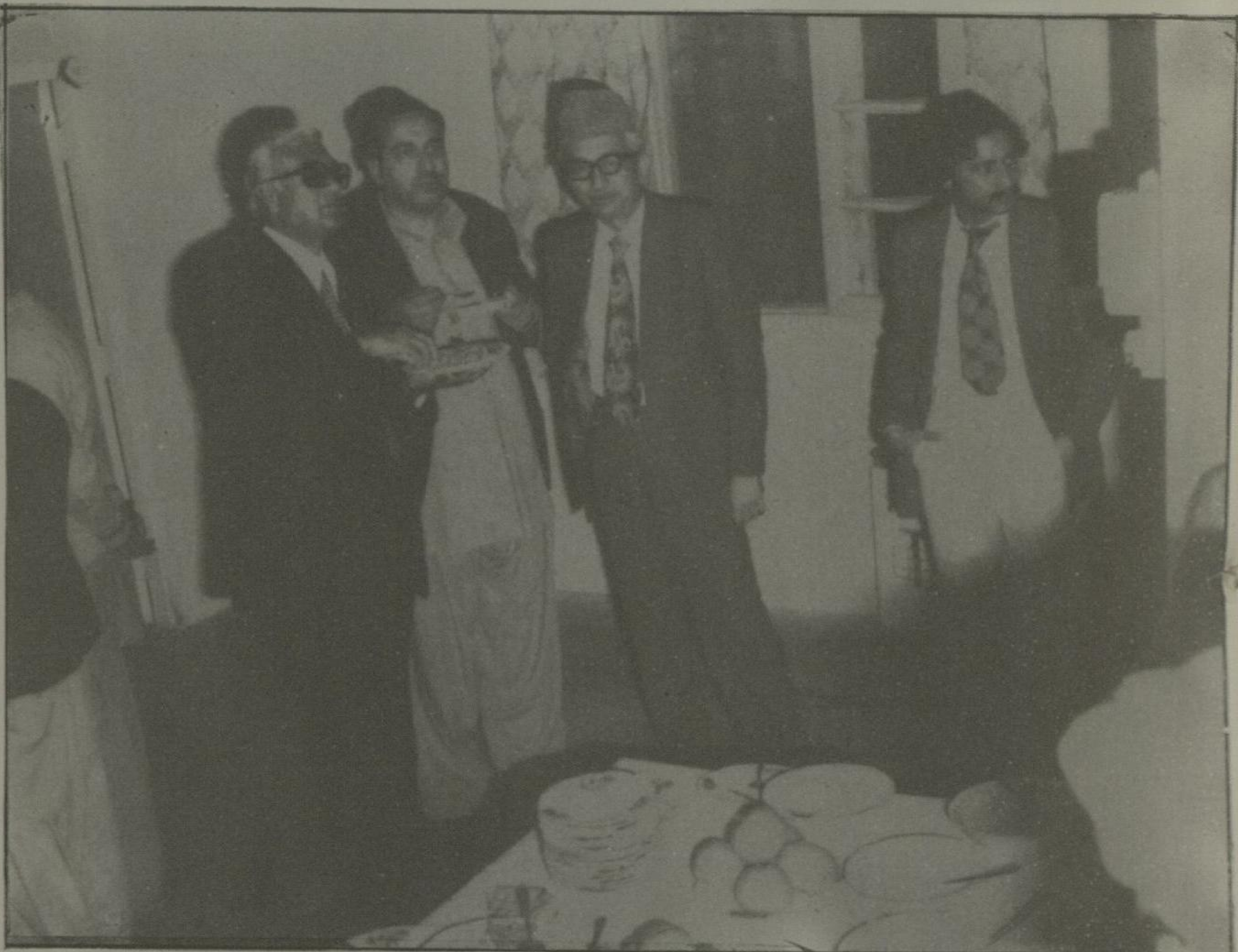
اراکین اباسین آرٹس کونسل
لفٹننٹ جنرل فضل حق گورنر صوبہ سرحد کا استقبال کررہے ہیں



مہمانوں کی ضیافت



سرحد چیمبر آف کامرس کے عشایئے کے شرکاء



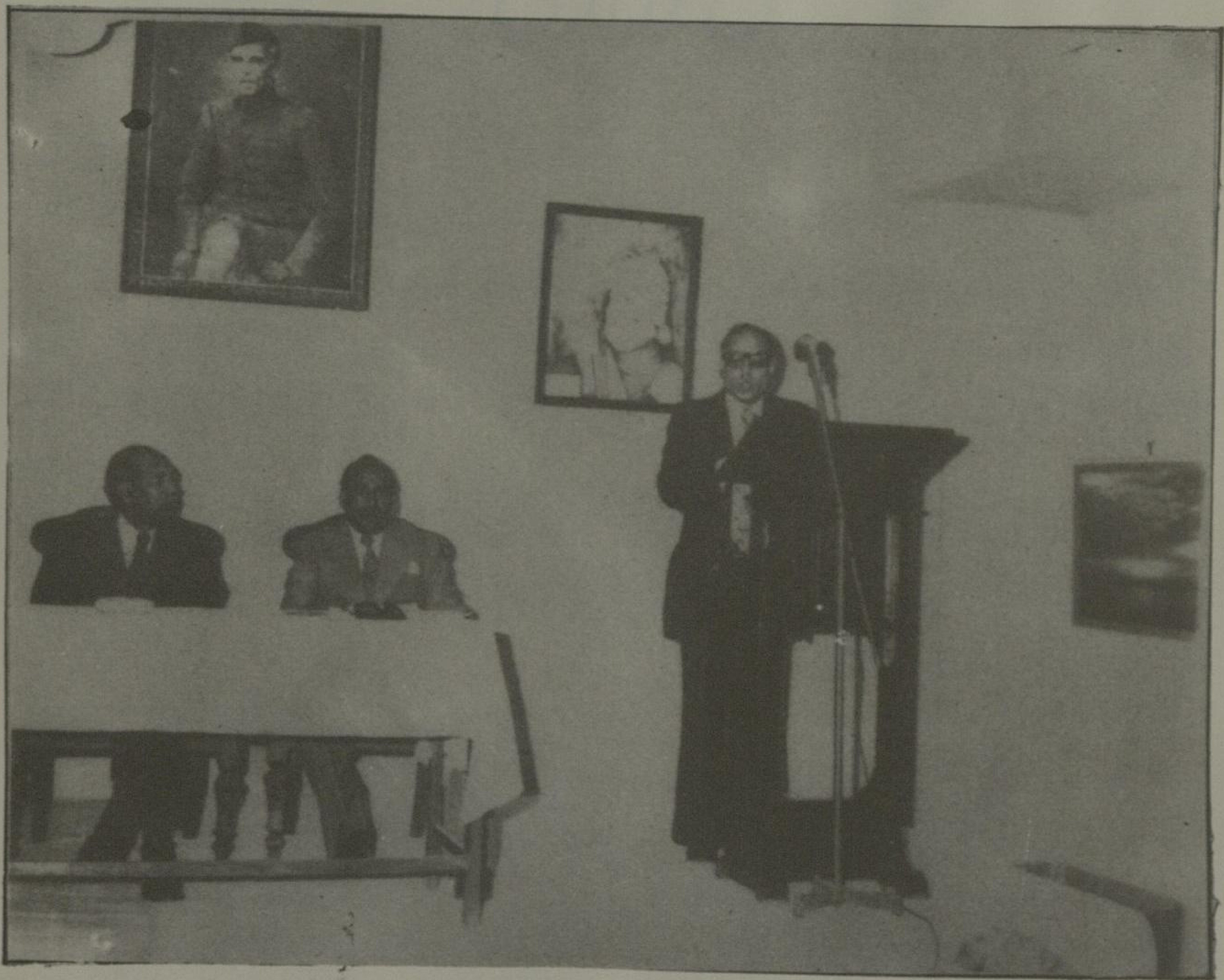
ارباب نیاز محمد خان وزیر سیاحت و ثقافت و کھیل حکومت پاکستان سرحد چیمبر آف کامرس کی دعوت میں



محمد رفیق شنواری خوشحال خان خٹک کا کلام پیش کر رہے ہیں



خوشحال سیمینار میں خاطر غزنوی (اعزازی سیکرٹری) میر عبدالصمد خان (صدر) اور صدر پاکستان کے
مشیر حکیم محمد سعید بحیثیت مہمانِ خصوصی



خاطر غزنوی

خاطر غزنوی

سپاس گذاری

عزت مآب لفٹیننٹ جنرل فضل حق صاحب گورنر صوبہ سرحد و مارشل لا ایڈمنسٹریٹر زون بی!
خوشحال خان خٹک صدی کی تقریبات کے شرکائے کرام!
مندوبین گرامی!
مہمانان معظم!

یہ میرا مقدس اور خوشگوار فریضہ ہے کہ اباسین آرٹس کونسل پشاور کے نمائندے کی حیثیت میں کونسل کی مجلس انتظامیہ اور تمام اراکین کی جانب سے فرداً فرداً آپ کی تشریف آوری پر آپکا شکریہ ادا کروں۔
لفٹیننٹ جنرل فضل حق صاحب ایک دردمند، باشعور اور پاکستانی ادب و ثقافت اور اسلامی اقدار سے محبت رکھنے والی شخصیت ہیں اور اسی لئے انہوں نے ہمیشہ اباسین آرٹس کونسل کی سرپرستی فرمائی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اُن کی سرپرستی آئندہ بھی جاری رہیگی ناخوشگوار موسموں نے اکثر ہمارے پروگراموں میں رخنہ اندازی کی ہے۔ خصوصی طور پر ان حالات میں کہ اباسین آرٹس کونسل کا کوئی بڑا ہال نہیں، جو ہے اس کی چھت نہیں کہ ہم ایسے موسم میں اس انداز کی تقریبات منعقد کر سکیں۔ کئی مرتبہ حکومت کی جانب سے سلسلہ جنبانی ہوئی لیکن پھر کسی نہ کسی وجہ سے ہال کی تعمیر کا کام رک گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ اس مرتبہ ہال کی تعمیر کا رُکا ہوا کام ضرور چل پڑے گا اور صوبہ سرحد کے اس سب سے بڑے شہر میں ایک بڑے ہال کی جو کمی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے وہ پوری ہو جائے گی۔
میں صوبہ سرحد کی انتظامیہ کا بھی خاص طور پر شکر گذار ہوں جس نے ہمیشہ اباسین آرٹس کونسل کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کیا۔
اس مجلس مذاکرہ میں حصہ لینے کے لئے ملک کے دُور دراز علاقوں سے بہت سے محقق اور خوشحالیات کے ماہرین اور خوشحال خان خٹک سے عقیدت و محبت رکھنے والی

شخصیات نے شرکت کی اور بہت سی تنظیموں نے تعاون کیا۔ موسم کی شدّت ان کی راہ میں حائل نہیں ہوئی۔ زندہ قوموں کا یہی شیوہ ہوتا ہے کہ وہ علم و ادب کے میدان میں تکالیف اور رکاوٹوں کی پرواہ کئے بغیر تحقیق و تعلیم و تحریر کا کام جاری رکھتی ہیں۔ اور ذہنوں کے دریچے وا کر کے "تازہ ہواؤں سے صحّت مند زندگی کا حسن برقرار رکھتی ہیں، آگے بڑھتی ہیں اور بڑھاتی" ہیں۔

ہم دیگر تمام شرکائے کرام کی آمد کے بھی بے حد شکر گذار ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ وہ کل اور پرسوں کی مجالس میں شرکت کریں گے جن میں خوشحال خان خٹک کی شخصیّت کے کئی نئے پہلوؤں اور گوشوں کی نقاب کشائی ہوگی۔

خوشحال بابا کی رائج تصویر ایک خیالی تصویر تھی جو ایک غیر ملکی نے بنائی تھی، خوشحال خان خٹک کا خاندان بھی جو پاکستانی ہونے پر فخر کرتا ہے، خوشحال بابا کی تصویر سے محروم تھا اور ہم جو خوشحال خان خٹک کے ہم وطن ہیں خوشحال خان کی ایک ایسی تصویر سے محروم تھے جس میں اِس خاندان کے حقیقی نقوش، بابائے عالی مقام کی وہ شخصیت جو نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو تھی پیش کر سکتے" اس مجلسِ مذاکرہ میں مصوّروں نے اباسین کے انعامی مقابلے میں حصّہ لے کر بڑے عمدہ کام کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور سعید سلطان خٹک نے جو خوشحال بابا کی قوم کا ایک فرد ہے یہ فریضہ حسن و خوبی سے ادا کیا ہے۔ اب ہم خوشحال بابا کی ایک ایسی تصویر پیش کرنے کے قابل ہو گئے ہیں جو حقیقت سے قریب ترین ہے، اور پاکستانی ہے۔

ایک مرتبہ پھر آپ کے شکریے کے ساتھ اور صاحب صدر کی اجازت سے آج کی اِس افتتاحی تقریب کے پہلے حصّے کے اختتام کی اجازت چاہتے ہیں اور اُمید رکھتے ہیں آپ اباسین آرٹس کونسل کے پروگراموں میں شریک ہوا کریں گے، کہ یہ آپ ہی کیلئے منعقد ہوتے ہیں۔

اب اسی مقام پر خوشحال بابا کا کلام اور اس کا اُردو ترجمہ موسیقی کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔

شکریہ



اراکین کونسل خوشحال بابا کے مزار پر



علامہ اقبال

خوشحال خان خٹک محض ایک شاعر ہی نہ تھا بلکہ وہ شاعر افغان تھا، ملتِ افغانیاں کا حکیم اور ان کے قومی مرض کا معالج بھی تھا۔

میجر راورٹی

مغرب کے شعراء کی طرح کوئی ایسا مضمون نہیں جو اس کے لئے بیگانہ ہو۔

دوست محمد خان کامل

خوشحال خان کی ملی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود اس کے تین بڑے ہیروز میں سے ایک ہے، وہ افغانوں کا صرف فردوسی ہی نہیں بلکہ افغانوں کی تاریخ میں رستم و فردوسی کا دوہرا کردار ادا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسکی شاعری میں جذبات کا بے پناہ زور اور ہیجان و طوفان نظر آتا ہے۔

خان علیین مکان کی ملی شاعری محبت قومی، حب الوطنی اور جذبات حریت و حمیت و شجاعت اور اصلاحی رجحانات سے لبریز ہے۔ قوم کی محبت اس پر شاعر کو نقطہ چینی کرنے سے نہیں روکتی بلکہ یہی محبت اپنی قوم پر سخت سے سخت تنقید سے نہیں روکتی۔

فضل حق شیدا

خوشحال خان کی شاعری میں اس قدر جامعیت اور تنوع ہے اتنے مختلف موضوعات اسالیب بیان اور اصناف سخن ہیں کہ صرف ایک قادر الکلام ادیب ہی ان کے مختلف پہلوؤں کا صحیح جائزہ لے سکتا ہے۔ اس کے حسن اظہار، زور بیان، علو تخیل، رنگینیوں اور باریکیوں سے وہی شخص لطف اندوز ہو سکتا ہے جو خود باریک بین اور صاحب ذوق سلیم ہو۔ خوشحال خان پشتو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے، وہ خیال اور تصور کے عالم بالا سے حقیقی دنیا میں نیچے اتر آتا ہے اس کے تلخ حقائق کے مزے چکھتا ہے اور اپنے تاثرات سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ تن آسان اور شکست خوردہ لوگوں کی طرح فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ نامساعد حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ اسلئے اسکی شاعری میں جولانی ہے جوش اور ولولہ ہے زندگی ہے اور سب سے بڑھ کر کہ ایک حیات افروز پیغام ہے۔

پرنٹنگ کارپوریشن آف فرنٹیئر لمیٹڈ پشاور